جلد ۳۵ | نمبر ۱، ۲

اپریل۔ مئی ۱۹۷۸ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: بال کرشن چترویدی

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک شریواستو

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زرِ سالانہ: پانچ روپیے

ترسیل کا پتہ: ہیڈ سرکولیشن انفارمیشن پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یوپی، لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بندوبست: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یوپی، لکھنؤ

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے متفق ہو

اپنی بات

بنیاد دو کا مولانا عبدالماجد کی بیش بہا خدمت ہے۔ مولانا دریا بادی کی شخصیت اتنی ہشت پہلو ہے کہ ان پر کوئی ایک لیبل چپاں کرنا ممکن نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ محض ایک صحافی تھے یا محض ایک انشا پرداز یا صرف ایک ادیب یا محض ایک مفسر قرآن تھے۔ انھوں نے مختلف پہلوؤں سے اردو زبان و ادب کے اتنے گراں بہا خدمات انجام دیے ہیں جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے خزانے کو انھوں نے قدر جواہر سے بھر دیا ہے۔ ان بیش بہا خدمات کی بنا پر مولانا عبدالماجد کو مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی، سرسید احمد خاں اور ڈاکٹر نذیر احمد کی صف میں بے تکلف جگہ دی جا سکتی ہے۔

اپنے ابتدائی دور میں انھوں نے شاعری بھی کی اور ڈراما بھی لکھا۔ اس طرح ان کا رشتہ تخلیقی ادب یا ادب لطیف سے بھی جڑ جاتا ہے۔ انھوں نے علمی مضامین کے علاوہ فلسفہ، نفسیات، تاریخ، منطق، مذہب، کلچر اور تصوف پر بھی بہت کچھ لکھا۔ اس کے علاوہ سوانح اور سفرنامے بھی لکھے۔ منفرد انداز میں تفسیر قرآن لکھی۔ مختلف موضوعات کی انگریزی کتابوں کے ترجمے اردو میں کیے۔ قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ جو ایک ایسا کارنامہ ہے جسے کوئی معمولی استعداد رکھنے والا شخص انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے ساتھ ہی صحافت سے بھی ان کا اٹوٹ رشتہ تا عمر یا جوان کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ وہ کوئی پیشہ ور صحافی نہیں تھے بلکہ اس میدان میں بھی ایک اصلاحی مقصد ہمیشہ ان کا ہم قدم رہا۔

یہ صحیح ہے کہ مولانا اپنے عقائد کے سلسلے میں انتہا پسند تھے۔ اس کے باوجود وہ ان افراد سے نفرت کے قائل نہیں تھے جن سے انھیں اختلاف ہوتا تھا۔ بلکہ وہ انھیں بھی اہمیت دیتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ اسی طرح وہ ان افراد کو بھی سر پہ بٹھا لینے کے قائل نہیں تھے جن سے انھیں اتفاق رہے یا عقیدت تھی۔ چنانچہ وہ ایسے افراد کی ہر بات بس فوراً ہی نہیں مان لیتے تھے بلکہ ان سے بھی کھل کر اختلاف ظاہر کر دیتے تھے۔

ایک عالم دین ہونے کے باوجود وہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کے قائل تھے۔ اس طرح وہ سیکولرازم کے ساتھ قومی تصور سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ ۱۷ سال کی عمر سے ۳۰ سال کی عمر تک مولانا پر الحاد کا غلبہ رہا جو مغرب کی ٹھیٹھ مادیت کے زیر اثر تھا۔ اس سلسلے میں مولانا اپنی خود نوشت سوانح حیات "غبار کارواں" (مطبوعہ ماہنامہ آج کل دہلی، ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ، مولانا عبدالماجد دریا بادی نمبر) میں لکھتے ہیں: "مغرب کی ٹھیٹھ مادیت کا بت ہندو فلسفہ کے مطالعے سے ٹوٹا اور روحانیت کے نام سے چڑھ اور بیزاری نہ رہی۔ دور ظلمت سے دور ہدایت تک پہنچنے میں جن حضرات سے مدد ملی ان میں بنارس کے فاضل فلسفی ودیدانتی بابو بھگوان داس کی باتیں بھی بڑی مصلحانہ رہیں اور اس سلسلے میں نام گاندھی جی کا بھی آتا ہے"

ان پر گاندھی جی کی شخصیت کا اثر یہیں تک محدود نہیں تھا۔ "غبار کارواں" ہی میں گاندھی جی کے سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں: "گاندھی جی کی دور اندیشی، تدبر اور اخلاص، سب کا مزاج زندگی بھر رہا اور ان کی بے وقت اور بیدردانہ موت ملک کے لیے ہی نہیں مسلمانوں کے لیے بھی ایک سانحہ ہو" صحافت کے دشت کی سیاحی کے ساتھ ساتھ مختلف علمی موضوعات پر اہم اور گراں قدر تصنیفات اردو زبان کو دے کر انھوں نے اردو کا دامن بلاشبہ وسیع کیا۔ لیکن وہ علم و تحقیق ہی کے ہو کر نہیں رہ گئے۔ ان کا تعلق شعر و ادب سے بھی قائم رہا اور انھوں نے ادبی تنقید کے میدان میں بھی کام کیا جس کا اعتراف پروفیسر احتشام حسین نے ان الفاظ میں کیا ہے: "مولانا عبدالماجد دریا بادی کی جو تنقیدی نظر ریاضت سے ہاتھ آئی ہے اس میں مطالعہ، ذہانت، ذوق سلیم، قدرت بیان اور صحیح ادبی مزاج کی آمیزش نے ایسی انفرادی شان پیدا کی ہے جسے تخلیقی تنقید کے دائرے میں رکھا جا سکتا ہے"

احتشام صاحب مزید لکھتے ہیں کہ "ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت جو تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی استدلالی رنگ رکھتی ہے۔ اپنی بات کہنے کے جوش میں حقائق کو نظر انداز نہیں کرتی اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس کے اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے بھی تخلیق کے ادبی و جمالیاتی حسن پر بھرپور نگاہ ڈالتی ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال مرزا شوق کی زہر عشق اور مرزا ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا پر ان کے خیالات میں مل جاتی ہے۔ مثلاً زہر عشق کے ایک درد انگیز منظر سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔" نواب مرزا! مجھ پر رحمت کر تو فے کو کھو اجڑنے والی ماں کے جذبات کی تصویر کاغذ پر اتار کر رکھ دی ہے۔ ماں کے منھ سے یہ بول نکل رہے ہیں یا دل جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں" اسی طرح مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں: "اردو میں ناول بہتوں نے لکھے۔ پر ان کا رنگ سب سے الگ، ان کا انداز سب سے جدا۔ نہ ان کے پلاٹ میں سنسنی خیزیاں، نہ ان کی زبان میں غرابت نمائیاں، نہ ان کے اوراق میں برق پیمائیاں اور نہ کوہ تراشیاں، نہ ان کے الفاظ ترنم ریز، نہ ان کی ترکیبیں ارتعاش انگیز، نہ ان کی تصویر رزم میں برق پاشیاں، نہ ان کی داستان بزم میں اہتمام آرائیاں۔ پلاٹ وہی روز صبح و شام کے پیش آنے والے واقعات جو ہم آپ سب دیکھتے ہیں۔ زبان وہی گھر اور باہر کی ستھری اور نکھری بول چال جو ہم آپ سب بولتے ہیں۔ قصہ کے مقامات نہ لندن نہ ماسکو نہ برلن نہ ٹوکیو، بس یہی لکھنؤ، فیض آباد، دہلی، الہ آباد۔ افسانے کے اشخاص نہ خضر ہور نہ سند باد، نہ تاج الملوک نہ ملکہ زرنگار، بس یہی حکیم صاحب، راجہ صاحب اور نواب صاحب، میر صاحب اور مرزا صاحب، عسکری بیگم اور عمدہ خانم، امراؤ جان اور بوا نیک قدم۔ کہتے ہیں کہ صاحب کمال لاولد رہ جاتا ہے، اس کی نسل آگے نہیں چلتی۔ اپنے طرز کا موجد بھی وہی ہوتا ہے اور خاتم بھی وہی۔ مرزا رسوا کا بھی خلف معنوی آج تک پیدا نہ ہوا"

اپنے ایک مضمون "نیا آئین اکبری" میں مولانا نے جس انداز میں اکبر الہ آبادی پر اظہار خیال کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ منفرد ہے بلکہ فن کار کی روح

کے اندر جھانکنے کی ایک موثر کوشش ہے۔ مولانا لکھتے ہیں "ظرافت کلام اقبال کی سب سے بڑی نقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے حق میں سب سے گہری نقاب بھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کے نام کو جتنوں نے اچھالا ان کی شہرت کو تالیوں نے چمکایا۔ لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح کہ دنیا ان کو محض ایک دل لگی باز سمجھ کر ان کے لطیفوں پر مٹی رہی، ان کی نوکیلی پھبتیوں پر ہنستی مسکراتی، ان کے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ گئی، ادھر نظر کسی کی نہ گئی اور کسی ایک آدھ کی گئی تو وہ شمار میں نہیں کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں وہ خود کیسے سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔"

اپنی ہشت پہلو اتنی ہمہ گیر اور ایسی تہ دار شخصیت کو نیا دور اس نمبر کے ذریعہ اپنا پرخلوص خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا جس پایے کے عالم، مفسر، ادیب اور صحافی تھے ان کے اعتبار سے یہ ایک جامع نمبر ہے۔ لیکن اتنا تو بہرحال کہا جا سکتا ہے کہ اس نمبر میں مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی موثر عکاسی کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کا فیصلہ ظاہر ہے کہ قارئین کو کرنا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں یقین بھی ہے کہ نیا دور کے سابقہ خصوصی نمبروں کی طرح آپ اس نمبر کو بھی ایک معیاری نمبر پائیں گے اور ہر حلقہ میں اس کا پہلے کی طرح خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس نمبر کے بارے میں قارئین کی بے لاگ اور قیمتی رائے شکر گزاری کا باعث ہوگی۔

آخر میں ایک بات اور عرض کر دینا ضروری ہے۔ قارئین کو اس نمبر میں ایک آدھ مطبوعہ تخلیق نظر آئے گی۔ مطبوعہ چیزیں شائع کرنا ہمارے اصول کے خلاف ہے لیکن اس اعتراف میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ لاعلمی میں ایسا ہوا جس کا ہمیں بہرحال افسوس ہے۔ ادارہ نیا دور ان تمام حضرات کا شکر گزار ہے جنھوں نے اپنی بے انتہا مصروفیتوں کے باوجود بیش قیمت مضامین عنایت فرمائے اور اس طرح ایک مفید اور معیاری نمبر کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

وفیات

پچھلے دنوں اردو زبان اعجاز صدیقی، محمود احمد ہنر، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اور سید آل رضا جیسے اپنے بہی خواہوں سے محروم ہو گئی۔ اعجاز صدیقی علامہ سیماب اکبرآبادی کے صاحبزادے تھے اور تقریباً ۳۰ برسوں سے ماہنامہ "شاعر" کے توسط سے اردو زبان و ادب کی خاموش خدمت کر رہے تھے۔ انھوں نے "شاعر" کے کئی بے حد اہم خصوصی نمبر بھی شائع کیے جن میں کرشن چندر نمبر ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ انتہائی دشوار اور سخت حالات میں بھی انھوں نے "شاعر" کو بند نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اپنا سب کچھ اردو کے لیے وقف کر دیا لیکن ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کبھی نہیں کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ "شاعر" اتنے طویل عرصے تک مسلسل نکلتا رہا۔ ایک خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک خوش اخلاق اور وضعدار انسان بھی تھے۔ عصری آگہی اور عصری رجحانات کی طرف سے انھوں نے کبھی آنکھیں بند نہیں کیں۔ چنانچہ ماہنامہ "شاعر" میں عصری رجحانات کی نمائندگی بھی موجود رہی۔ اس کے باوجود "شاعر" کبھی کسی مخصوص نظریہ کا ڈھنڈورچی نہیں بنا۔ ایڈیٹر نیا دور سے بھی مرحوم کے مخلصانہ روابط تھے اس لیے یہ سانحہ ان کے لیے ذاتی غم بھی بن گیا۔

محمود احمد ہنر بھی اردو کے ایک بے لوث خادم تھے۔ انھوں نے اردو میں "شاہکار ڈائجسٹ" کافی عرصے تک نکالا۔ یہ رسالہ اردو میں اپنی نوعیت کا واحد رسالہ تھا جس میں اردو کے مختلف رسالوں میں شائع شدہ تخلیقات کا ایک خوبصورت اور معیاری انتخاب پیش کیا جاتا تھا۔ ہندی زبان و ادب پر بھی ہنر صاحب کی گہری نظر تھی۔ وہ باپوئے قوم مہاتما گاندھی سے بھی وابستہ رہے تھے۔ نہایت خاموش اور منکسر المزاج قسم کے انسان تھے۔ نام و نمود کی کبھی پروا نہ کی۔ شاید اسی لیے گمنامی ان کا مقدر بنی۔

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ہماری قومی زندگی میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ کنزرو صاحب ہندوستان کی آئین ساز کمیٹی کے ایک رکن اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور سیکولر قدروں کی ایک عملی تصویر تھے۔ انھیں اردو زبان و ادب سے ایک خصوصی لگاؤ تھا۔ چنانچہ اردو کے کاز کی انھوں نے ہمیشہ حمایت کی۔ کنزرو صاحب اردو ثقافت کی ایک مستحکم علامت تھے۔ ان کا انتقال نہ صرف اردو زبان و تہذیب بلکہ ہماری قومی زندگی کا ایک نقصان عظیم ہے۔

سید آل رضا لکھنؤ کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ وہیں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آل رضا صاحب کلاسیکی رنگ و آہنگ کے شاعر تھے اور شعر میں زبان و فن کا خاص لحاظ رکھتے تھے اور زبان و فن کو ایک خاص انداز میں برتتے تھے۔

ایسے بے لوث اور انتھک خادم اردو کو اب شاید ہی مل سکیں!!

اشتیاق احمد عباسی بھی گزشتہ دنوں لکھنؤ میں حرکت قلب بند ہو جانے کے نتیجے میں چل بسے۔ عباسی صاحب کلاسیکی موسیقی کی ماہر گلوکارہ بیگم اختر کے شوہر اور لکھنؤ کے ایک ممتاز بیرسٹر تھے۔ وہ لکھنؤ کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ ان کے انتقال پر ادارہ نیا دور ان کے سوگوار متعلقین سے تعزیت کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

نازش پرتاب گڈھی

مولانا عبدالماجد دریابادی

تو گیا اور ترے ساتھ ہی اک باب گیا
نسل نو زائیدہ کی آنکھوں سے اک خواب گیا
خواب، اخلاق و مروت کا
محبت کا خواب
اپنے اسلاف کی تہذیب کا، کردار کا خواب
سایۂ ابر گہربار کا خواب
خواب اس قول و عمل کا کہ جو کہلاتا ہے رُخِ مذہب
خواب اس دور کا جب
ہوں گے برابر ہم سب
اب کوئی شکل یہاں دیکھنے والی نہ رہی
"فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالیؒ نہ رہی"

تیری حق گوئی و بے باکی پر
ایک پردہ تھا — جسے صدق کہیں
آج جو لوگ جو اپنے کو بتاتے ہیں نڈر
صدق کی فائلیں ڈھونڈھیں
اور تنہائی و یکسوئی میسر ہوں تو اس کو پڑھ لیں
وسعتِ رنگِ تخیل پہ تھی مذہب کی جلا
اور مذہب تو ہوا کرتا ہے سراپا خیر
جو سکھاتا نہیں انسان کو انسان سے بیر
سلسلہ ذہن کا مانا کہ روایت سے ملا
دل ہمہ وقت مگر صاف و کشادہ بھی رہا
جسم پر فن کے درائت کا لبادہ بھی رہا
جو بکھیرے تھے قلم نے تیرے
سطحِ قرطاس پہ سچے موتی
زہرناکی ترمی — تیری تلخی
یک اک چیز تری
ہو کے محفوظ رہے گی ترے بیاروں میں
تو جئے جائے گا مداحوں، پرستاروں میں
کون کہتا ہے تجھے موت آئی ؟

مولانا قاری محمد طیب

مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی خدمات

انگریزوں کے دورِ حکومت میں برصغیر غلام تھا اور عوام و خواص انگریزی تہذیب و تمدن کے دلدادہ تھے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دورِ غلامی میں ہند و پاک کے اندر بڑے بڑے مصنفین، انشاء پرداز، سیاست داں اور دانشور پیدا ہوئے، جن کے علم و فضل، تصنیف و تالیف، انشاء پردازی اور عمل و خلوص پر ہندستان کو رہتی دنیا تک ناز رہے گا۔ ہندستان کی تاریخ اس وقت تک نامکمل سمجھی جائے گی جب تک اس دور کے اہلِ علم اور صاحبِ فضل و کمال افراد کا اس میں تذکرہ نہ ہو۔

مولانا عبدالماجد دریابادی ان ہی ممتاز لوگوں میں ہیں، جن کی تعلیم و تربیت دورِ غلامی میں ہوئی، مگر وہ آسمانِ علم و عمل پر نیرِ تاباں بن کر چمکے، اور ان کے علم و فن سے ایک دنیا مستفیض ہوئی، کچھ اہلِ علم مولانا مرحوم کی انشاء پردازی اور مخصوص طرزِ نگارش کے عاشق ہیں، کچھ افراد و اشخاص ان کے طنزِ لطیف اور اسلوبِ بیان سے لذت محسوس کرتے ہیں، بہت سارے خواص ان کے مشوروں پر سر دھنتے ہیں، اور کتنے ہی ذی علم ان کے مختصر مگر جاندار تبصروں اور نقد و نظر پر نعرۂ تحسین بلند کرتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا دریابادی گوناگوں خصوصیتوں کے مالک تھے، اور اپنے اسلوبِ نگارش میں ممتاز اور صاحبِ طرز اہلِ زبان شمار ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ذہن و فکر رسا کی نعمت سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

مطالعہ وسیع بھی تھا اور گہرا بھی۔ قدیم و جدید دونوں علوم پر نظر رکھتے تھے اور اپنی پوری زندگی علم و فن اور قوم و ملک کی خدمت میں صرف کی۔ ایڈیٹر بھی رہے اور سیاسی مبصر بھی، مصنف بھی تھے اور مفسرِ قرآن بھی۔ مولانا محمد علی جوہر سے بھی تعلق رہا، اور حکیم الامت حضرت تھانوی سے عقیدت و محبت بھی۔ اگر فلسفہ پر نظر رکھتے تھے تو علوم دینیہ سے بھی شغف میں کمی نہیں تھی۔

عوام اور بہت سے خواص سے مولانا کا تعارف ان کے اخبار سچ اور صدقِ جدید کے ذریعے ہوا، مگر اہلِ علم ان کی گرانقدر تصنیف اور علمی مقالات سے متاثر تھے اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا نے جو علمی مقالات یا کتابیں لکھی ہیں، ان میں ایسی چاشنی ہے کہ پڑھنے والا جب ان کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو پڑھتے پڑھتے اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔ اندازِ بیان دلکش، جملوں میں روانی و سلاست حیرتناک اور دلچسپ، جملے مختصر مگر چست اور سادے، جو چیز بیان کرتے ہیں اس کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں، پھر کمال یہ کہ جملے ایسے رسیلے اور چبھتے ہوئے لاتے ہیں جو دلوں پر نقش ہوتے چلے جاتے ہیں۔

حجاز کا سفرنامہ بہتوں نے لکھا اور کوئی شبہ نہیں ان میں بہت سے سفرنامے بڑے کارآمد اور معلومات افزا ہیں، لیکن مولانا مرحوم نے جو اپنا سفرنامۂ حجاز لکھا ہے وہ اپنے طرزِ نگارش میں بالکل جدا اور سبھوں سے انوکھا ہے، پڑھتے جایئے اور لذت اندوز ہوتے جایئے۔

مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف دور ہیں، مگر جب حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے تعلق ہوا تو پھر ان کی کائناتِ دل ہی بدل گئی۔ وہ سراپا سوز و گداز اور فنافی الدین ہو گئے۔ حضرت تھانویؒ سے عقیدت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، اور تھانہ بھون کی سرزمین ان کی محبت کا مرکز بن گئی۔

مولانا دریابادی نے حکیم الامت نامی کتاب لکھی ہے۔ آپ

اس کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ مولانا مرحوم پر کیا کیفیات گذری ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کے مقدمہ میں صراحت کردی ہے کہ "یہ مجموعہ اوراق نہ کتاب المناقب ہے، نہ ملفوظات مرشد اور نہ سیرۃ الشیخ، اس کا موضوع ان سب سے الگ ہی نہیں بلکہ سب سے پست بھی ہے۔"

مولانا تھانوی کے متعلق اپنے اسی مقدمہ میں انھوں نے لکھا ہے:

"ان کی عمر کے آخری ۱۵-۱۶ سال کے زمانہ میں ان کا سایہ کوان سے نیاز اور گہرا نیاز حاصل رہا، اور راس نے اپنے لیے تجربے اور سابقہ میں انھیں انسان پایا۔"

سب سے پہلے وصل بلگرامی صاحب کے ذریعے حضرت تھانوی کی ایک مختصر سی کتاب قصد السبیل ہاتھ آئی تھی۔ آگے مولانا دریابادی تحریر کرتے ہیں:

"قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا اور سطر سطر پر پردے نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے، رہ رہ کر طبیعت اپنے اوپر جھنجھلاتی تھی کہ اب تک کیوں نہ پڑھا تھا۔"

اس کے بعد مولانا مرحوم نے حضرت تھانوی کی خدمت میں ایک مشورہ طلب خط لکھا، جس میں اپنی مختصر روداد زندگی درج کی اور آخیر میں لکھا:

"جناب کی سیاسی رائیں اب بھی میرے لیے ایک معمہ ہیں، بہر حال درخواست امور ذیل میں رہنمائی کی ہے:

(۱) موجودہ بزرگوں میں سے کس کا انتخاب بیعت یا صحبت کے لیے کروں۔

(۲) اپنی اصلاح قلب کے لیے خود جناب والا سے بھی مراسلت اور تھانہ بھون میں حاضری کی اجازت چاہتا ہوں۔" (حکیم الامت ص ۶)

اس کا جواب ۲۹ر نومبر سنہ ۱۹۲۷ء کو موصول ہوا:

"از اشرف علی، السلام علیکم۔ آپ کی راستی و سادگی سے جی خوش ہوا۔ (۱) بیعت کا معیار آپ نے کیا تجویز کیا (۲) تھانہ بھون کا ارادہ کس خیال سے ہے (۳) امراض قلبی کا علاج، ترتیب میں تجویز شیخ سے موخر ہے۔ والسلام از تھانہ بھون۔"

یہ ابتدا تھی اس تعلق کی جو مولانا دریابادی کا حضرت حکیم الامت تھانوی سے قائم ہوا۔ بیعت تو حضرت تھانوی نے مولانا مدنی سے کرائی اور تربیت خود فرمائی، اور بڑے اچھے انداز میں تربیت ہوئی۔ حکیم الامت کی صحبت اور مراسلت نے مولانا دریابادی کو دین فہمی میں بڑا درجہ عطا کردیا، اور مولانا کا حال اور مآل یہ ہوا کہ ان کی صحبت اور خط وکتابت سے بہت سارے جدید تعلیم یافتوں نے رہنمائی حاصل کی اور راہ راست پائی اور وہ اپنی زندگی کتاب وسنت کے مطابق گذارنے کے مشتاق ہوگئے۔

حضرت تھانوی سے کہاں کہاں رہنمائی حاصل کی، اور ان کی تحریر اور رہنمائی سے کیا پایا، اس کی تفصیل بڑے اچھے انداز میں مولانا مرحوم نے اپنی کتاب حکیم الامۃ میں خود اپنے قلم سے تحریر فرمادی ہے۔ یہ چھ سو صفحات سے زیادہ ضخیم کتاب ہے اور بڑی ہی دلچسپ، اپنا کچا چٹھا بھی ہے اور اپنی کمزوریوں کی نشاندہی بھی پھر مرشد تھانوی کی اصلاح اور مشورے بھی۔

یہ کتاب جہاں آپ بیتی ہے وہیں زبان و بیان کے اعتبار سے بہت ہی دلچسپ اور ربع صدی سال کی تاریخ بھی۔

یہ حکیم الامت حضرت تھانوی ہی کی پاک باطنی کا اثر تھا کہ مولانا دریابادی کو تفسیر قرآن سے شغف پیدا ہوا، اور پھر زندگی کا بڑا گرانقدر حصہ آپ نے انگریزی اور اردو تفسیر لکھنے پر صرف کیا اور اپنی زندگی ہی میں اسے چھپوایا۔

مولانا دریابادی کی تفسیر انگریزی کا حال معلوم نہیں کہ اس میدان سے مجھے کوئی واقفیت نہیں، لیکن جہاں تک اردو تفسیر ماجدی کا تعلق ہے عوام وخواص دونوں ہی اسے ذوق وشوق کے ہاتھوں لیتے ہیں اور عقیدت ومحبت سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اس تفسیر کے لکھنے میں بھی رہنمائی حکیم الامت تھانوی سے ہی برابر حاصل کرتے رہے اور حضرت تھانوی بڑی مسرت سے رہنمائی فرماتے

ہے۔ قدیم چیزیں تو دوسری تفسیروں میں بھی مل جاتی ہیں مگر بعض جدید چیزیں اس تفسیر کا مخصوص سرمایہ ہیں اور دورِ حاضر کے لیے یہی چیزیں بڑا قیمتی ذخیرہ ہیں۔ مولانا مرحوم نے اس تفسیر پر بہت کاوش محنت کی ہے اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ خدمت ان کے لیے آخرت کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور سب سے قیمتی خزانہ۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

مولانا دریابادیؒ نے اس کے علاوہ بھی بیسیوں علمی خدمات انجام دی ہیں، اور متعدد تصانیف آپ کی شائع ہو چکی ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا مجموعہ بھی جو مولانا مرحوم نے اپنے فٹ نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے قابل قدر علمی خدمت ہے۔

اخبار سچ اور صدق جدید کے ذریعے جو خدمت انجام دی ہے وہ خود ایک عظیم خدمت ہے اور بہت سارے لوگوں نے اس مختصر سے اخبار سے بہت کچھ حاصل کیا ہے مولانا مرحوم کی تمام تحریریں جمع کی جائیں تو وہ ایک اکیڈمی کی خدمات سے بڑھ جائیں گی اور نوجوانوں کو حیرت ہوگی کہ کس طرح اتنا بڑا علمی ذخیرہ مولانا اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ مولانا مرحوم احقر کاتب الحروف سے خصوصی محبت فرماتے تھے اور خطوط میں عموماً سرنامۂ خطاب یہ ہوتا تھا: "میرے سب سے اچھے بھائی"۔ اکثر اپنے باطنی احوال بھی تحریر فرما کر مشورہ لیا کرتے تھے اور بے حد خوش اور مطمئن ہوتے تھے۔ ان ہی کی فرمائش پر ان کی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بعد میں نے رسالہ عالم برزخ لکھا جسے انھوں نے بعنوان "موت وما بعد الموت" قسط وار شائع فرمایا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کی خدمات قبول بارگاہ الٰہی ہوں۔ آمین۔

★

وقار خلیل

یہاں جو نہیں ہے

(عبدالماجد دریابادی کی یاد میں)

یہاں جو نہیں ہے،
اسے ہم نے دیکھا ہے
لکھتے ہوئے غور کرتے ہوئے
حدیثِ وفا ورد کرتے ہوئے
وہ کہ تہذیبِ اسلاف کی روشنی
وضعداری میں بے مثل، عالی مقام
اور شفاف شخصیت، بادرسی

وہ تو اک آنکھیں ہی آنکھیں تھا فکر و نظر
ہم گفتگو شانت جیسے سمندر
شجر ایسا، برگد کا چھتنار سایہ
وہ گوتم نہیں تھا، مگر ذات میں گم
کبھی آگہی کے سمندر میں غلطاں
کبھی بحرِ عرفاں میں غوطہ زن
کبھی روشنی کے جزیروں میں حیراں
کبھی تیرگی میں چراغاں چراغاں
یہاں جو نہیں ہے،
اسے ہم نے دیکھا ہے،
صحرا میں، گلشن میں، کوہ و ندا پر
وہ جگنو، وہ شعلہ، وہ طائرِ مقدس
چمن در چمن زندگانی کے اوراق میں ضو فشاں ہے
ہمارے دلوں میں، کتابوں میں، دانش کے دارالادب میں
وہ زندہ ہے، زندہ رہے گا:

آوارہ

ماجد میاں سے آخری ملاقات

آج کی نہیں، بیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے، ماجد میاں سیتاپور ہائی سکول میں آ کا بھائی کے ساتھ نویں میں اور میں ان سے کہیں جونیر ساتویں میں۔ سو سائٹی کا رنگ جو ماشاء اللہ اب نکھرا ہے اس میں چھوٹے بڑے کا رکھ رکھاؤ مہمل سی بات ہے۔ ماجد میاں سے بے تکلفی کا سوال میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اکثر آ کا بھائی سے ملنے ہمارے گھر آتے، "آداب عرض" کے سوا ہم دونوں کے درمیان آ کا بھائی کا رعب تھا جو آگے نہ بڑھنے دیتا۔ اتفاق کی بات اسکول میں شکسپیر کے ناٹک "مرچنٹ آف وینس" کا ایک سین پیش کرنا طے پایا۔ ماجد میاں اس کے سربراہ تھے۔ عدالت کے سین میں خود مجسٹریٹ کا پارٹ کیا اور مجھے انتانی بنایا۔ تماشا بہت کامیاب رہا۔ یہ پہلی بے تکلفی کی بسم اللہ تھی۔

میٹرک پاس کر کے ماجد میاں اسکول چھوڑ گئے اور کیننگ کالج میں داخل ہو گئے۔ اور کوئی دو برس بعد میں نے بھی وہیں داخلہ لیا تو وہ بی اے میں آ چکے تھے۔ چلتے پھرتے علیک سلیک ہو جاتی۔ وہ شہر میں مقیم تھے، میں کالج ہوسٹل میں۔ کھل کر ملنے جلنے کی نوبت نہ آئی۔

زمانہ آگے بڑھتا رہا۔ ہم مدتوں ایک دوسرے سے بے خبر رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن میں نے ان کو آل انڈیا ریڈیو نئی دلی میں دیکھا۔ کسی تقریر کے سلسلے میں آئے تھے۔ کہاں تو میں نے ان کو خوش قطع شروانی میں دیکھا تھا، یا اب سرتاپا کھدر میں ملفوف پایا۔ کھچڑی ڈاڑھی، شرعی مونچھیں، چہرے پہ بزرگی۔

بات چیت میں تدبر۔ خیریت، خیر عافیت کے بندھے ٹکے سوال جواب ہوئے اور مصافحہ کر کے ہم دونوں جدا ہو گئے۔

اپنی کم مائیگی سے ان کی وسعت علم کا اندازہ میرے بس کا نہیں، ہاں اتنا ضرور جانتا اور مانتا ہوں کہ اردو صحافت میں ان کے پلے کا دوسرا عرصۂ دراز تک ظہور میں نہ آئے گا۔

حسن اتفاق کہ میری ایک انشا ان کی ناقد نظر سے گزری، اور اس پر انھوں نے بہت کچھ لکھا جو میرے لیے سند کا مرتبہ رکھتا ہے۔ حجاب اٹھ گیا اور میرے ان کے درمیان نامہ و پیام کا بے تکلف سلسلہ جاری ہو گیا۔ ماجد میاں کے کئی گرامی نامے میرے پاس تبرکاً محفوظ ہیں۔ دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اب ماجد میاں کہاں سے لاؤں۔

گئے برس لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ جانتا تھا کہ ماجد میاں علیل ہیں، اور علاج کے لیے لکھنؤ میں مقیم۔ خیال ہوا کہ عیادت کر آؤں۔ پتہ چلا کہ میری فرودگاہ سے بالکل قریب حیدر مرزا روڈ، مولوی گنج میں ٹھہرے ہیں۔ ماجد میاں کے ایک قریبی عزیز حکیم عبدالقوی صاحب سے نیاز حاصل ہے۔ رقعہ لکھا، جواب آیا، کل نو بجے آ جیے۔ گیا اور کچھ دقیقے کے بعد ماجد میاں کے کمرے میں لے جایا گیا۔ سفید کھدر میں سرتاپا، اوڑھے لپیٹے تکیوں کے سہارے مسہری پر ماجد میاں آرام کر رہے تھے۔ دودھ جیسی سفید ڈاڑھی کچھ الجھی الجھی سی سینے پر کھیل رہی تھی۔ حکیم صاحب نے داہنے کان کے پاس ذرا بلند آواز سے میرا نام لیا۔ معاً ماجد میاں کے جھریاں پڑے ہڈیوں کے ساتھے

بڑے ہلکے لرزتے ہوئے دونوں ہاتھ چادر سے نکلے اور میری جانب بڑھے۔ میرے دونوں ہاتھ پکڑے، آنکھوں تک لے گئے اور ہونٹوں پر رکھ لیے۔ ساتھ ہی میں نے دیکھا ننھے ننھے آنسو ان کی پلکوں پر جھول رہے تھے۔ دل کا کمزور ہوں، میرے آنسو بھی چھلک پڑے۔ اور اپنے ہاتھ نرمی سے نکال کر ذرا نرم آواز سے کہا "ماجد میاں دعا شفا پڑھتا ہوں، سنیے اور ہو سکے تو آپ بھی تکرار کرتے جائیے۔ میں نے دعا شروع کی، دیکھا تو ان کے لبوں کو بھی جنبش تھی۔ دعا ختم ہوئی۔ اتنے ہی میں مجھ پر جو گزری خدا ہی جانتا ہے۔ انھیں دیکھتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ پیچھے پیچھے حکیم صاحب بھی نکل آئے، فرمایا "کل اتنے ہی وقت آپ کو پھر یاد کیا ہے" "حاضر ہوں گا" کہتا ہوا رخصت ہو گیا۔ باقی دن اور رات گئے تک ماجد میاں کا نقش خیال میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔

دوسرا دن ہوا۔ مقررہ وقت پر میں پہنچا۔ حکیم صاحب منتظر تھے۔ کہنے لگے "کل آپ ادھر گئے ادھر مجھے حکم دیا کہ انھیں کل صبح کے ناشتے پر مدعو کیا جائے۔ چنانچہ مختصر اور نہایت پرتکلف ناشتے کے بعد پھر ماجد میاں کے کمرے میں لے جایا گیا۔ محو خواب تھے۔ دیکھتا رہا اور دبے پاؤں واپس آ کر حکیم صاحب سے رخصت لی اور رات گئے وطن روانہ۔

سن ۷۶ء ۱۹ کا راج ختم ہونے کو تھا کہ میں ایک سانحے سے دوچار ہوا۔ گرا تھا اور داہنی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ علاج کے لیے یونیورسٹی ہاسپٹل علی گڑھ میں داخل تھا۔ عیادت کے لیے اکثر اساتذہ اور طلبا آتے رہتے۔ تاریخ یاد نہیں شام تھی کہ مولینا محمد رضا صاحب فرنگی محلی یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے استاد تشریف لائے اور یہ سندیسہ لائے کہ کل آپ کے دوست مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھنؤ میں رحلت فرمائی: پھر مجھے یاد نہیں کہ یہ سنا کر حضرت کب واپس گئے۔ حواس بجا ہوئے اب اپنے اسکول کے زمانے سے لکھنؤ کی وداعی ملاقات تک کے مناظر دماغ پر چھائے تھے اور میں بار بار "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں" پڑھ پڑھ کے ماجد میاں کو یاد کرتا رہا۔

خلد آشیاں ہے تو.....

جعفر عسکری

(مولانا عبدالماجد دریابادی کی نذر)

علم کا بحر بے کراں ہے تو
عظمتِ فکر کا نشاں ہے تو

شہریارِ صحافت و انشا
تاجدارِ فن و زباں ہے تو

ماہرِ انتقادیات و سخن
صنفِ شعر و ادب کی جاں ہے تو

فلسفہ اور سیاسیات میں طاق
غمِ ہستی کا رازداں ہے تو

مذہب و نفسیات میں فاضل
پاک قرآں کا ترجماں ہے تو

صدق و اخلاقیات میں کامل
مظہرِ دینِ عاشقاں ہے تو

عصبیت کے تپاں جہنم میں
جل رہی ہے زباں کہاں ہے تو

دوزخِ روز و شب میں جل، جعفر!
خیر سے، خلد آشیاں ہے تو

عبدالقوی دسنوی

مولانا عبدالماجد دریابادی

مہدی حسن افادی کی نظر میں

مہدی حسن افادی بہت زیادہ عمر لے کر نہیں آئے تھے۔ وہ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۱ء میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ مشکل سے اکاون (۵۱) سال کی عمر پائی، ۱۸۹۲ء سے ملازمت کی زندگی شروع کی اور جب تک جیے تحصیلداری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ چونکہ نہایت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے اور شگفتہ، فکر انگیز، تحریر اور متحیر کرنے والے لہجے کے مالک تھے۔ اس لیے بہت جلد ادبی دنیا میں جانی پہچانی اور پسندیدہ شخصیت کے مالک بن گئے تھے جس کے نتیجے میں اس وقت کے ادیبوں سے رسم و راہ پیدا ہو گئی تھی، چند سے اس رسم و راہ نے قربت اختیار کر لی تھی اور یہی قربت کچھ کے ساتھ دوستی کے رشتے میں منتقل ہو گئی تھی۔

مہدی کے تعلقات مولانا شبلی، الطاف حسین حالی، سید ناصر علی، عبدالرزاق کانپوری، محمد علی شاہ دلگیر، مولوی عبدالحق، ابوالکلام آزاد، اور عبدالسلام ندوی وغیرہ صاحبان سے بڑے اچھے تھے۔ وہ ان کی ادبی کاوشوں کی بڑی قدر کرتے تھے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی سے ان کے خصوصی تعلقات تھے اگرچہ مولانا سید سلیمان ندوی ان سے پندرہ سال، مولانا عبدالماجد دریابادی بائیس سال اور مولانا عبدالباری ندوی لگ بھگ اسی قدر چھوٹے تھے۔

ان حضرات سے مہدی کے گہرے تعلقات کا اندازہ ان کے نام مہدی کے خطوط کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ بعض مضامین میں بھی مہدی نے ان حضرات کا تذکرہ نہایت خلوص اور اعتماد کے ساتھ کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی سے مہدی کے تعلق کے متعلق بیگم مہدی رقمطراز ہیں:

"اپنے موجودہ ادبی احباب میں جن کی لٹریری اور علمی قابلیت کے وہ دلدادہ تھے۔ مولانا عبدالماجد صاحب بی۔اے کا نام نامی سرفہرست درج ہونے کے لائق ہے۔ آپ کے ساتھ ایک سچا خلوص اور دلی تعلق تھا ——

. . . .

اکثر آپ کی نسبت فرط خلوص اور محبت سے کہا کرتے تھے کہ "ایک دن یہ موجودہ زمانہ ہند کا آفتاب علم ہو کر رہے گا۔"[1]

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی کے مہدی سے تعلق کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہم نوجوانوں (اب کہاں کے نوجوان!) میں ان کا سب سے زیادہ میل اور میل خاطر ہمارے دوست مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے ساتھ تھا۔ ان سے خط و کتابت بھی زیادہ رہتی تھی۔"[2]

---

[1] افادات مہدی ص ۱۲، ۱۳۔ [2] مہدی کے خطوط، مکاتیب مہدی ص ۱۰۔

خود مہدی افادی اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۱۰ء میں مولانا کو تحریر کرتے ہیں :

"آپ جانتے ہیں، میں آپ کو بار بار کیوں لکھتا رہتا ہوں، صرف اس لیے کہ آپ کی جوابی تحریروں سے لطف اٹھا سکوں"[1]

تقریباً آٹھ سال بعد یعنی ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ایک بار پھر مہدی مولانا کو ان کے خطوط سے اپنی دل چسپی کے متعلق آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پیارے ماجد جس طرح ایک بھوکا خوش ذائقہ کھانے پر گرتا ہے اور لقمہ تر جلد جلد حلق سے نیچے نہیں اتار لیتا اس کی تسکین نہیں ہوتی میں چھپانا نہیں چاہتا کہ آپ کے دلچسپ عنایت ناموں کے ساتھ مجھے بھی یہی صورت پیش آگئی ہے اس میں میرے 'کنگلے پن' کو اس قدر دخل نہیں جس قدر آپ کے بخل کو کہ یہ نعمت جلد جلد میرے حصے میں نہیں آتی"[2]

خطوط کے سلسلے میں بیگم مہدی بھی مہدی کی اس دل چسپی کی گواہی دیتی ہیں :

"آپ (مولانا عبدالماجد دریابادی) کے خطوں کا ان کو بے چینی کے ساتھ انتظار رہا کرتا تھا جس روز ڈاک میں آپ کا خط ہوتا، انھیں بے حد مسرت ہوتی تھی۔ خدا جانے کتنی مرتبہ اسے پڑھتے تھے اور سیری نہیں ہوتی تھی، کبھی جوش میں کھڑے ہو جاتے اور ٹہل ٹہل کر خط پڑھتے تھے"[3]

اس سلسلے میں خود مولانا عبدالماجد دریابادی رقمطراز ہیں :

"جن خوش نصیبوں کے سلسلۂ مراسلت قائم تھا وہ شوق و اشتیاق کے ساتھ جدید مکتوب کے منتظر رہتے اور پچھلے گرامی نامہ سے ہفتوں لطف اندوز ہوا کرتے تھے"[4]

مولانا عبدالماجد دریابادی اور مہدی حسن افادی کے درمیان کب سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا اور کب ختم ہوا اس کی کڑیاں نہیں ملتی ہیں اور نہ وہ خطوط منظر عام پر آسکے ہیں جو مہدی حسن کے نام مولانا دریابادی نے تحریر کیے ہیں[5]۔ البتہ اکتالیس خطوط جو مہدی حسن نے مولانا کو تحریر کیے تھے اور جو مختصر عرصہ یعنی ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء سے ۴ اکتوبر ۱۹۱۲ء تک کے ہیں جن کو بیگم مہدی نے مکاتیب مہدی میں شائع کر دیئے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے دونوں حضرات کے گہرے تعلقات اور مہدی کی نگاہ میں مولانا کے لیے جو قدر و منزلت تھی اس کا کسی حد تک علم ہوتا ہے۔ انھیں خطوط کی روشنی میں اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ساتھ مولانا عبدالباری ندوی کے بھی شیدائی تھے، اس لیے اکثر تحریروں میں مولانا کے ساتھ مولانا عبدالباری کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ۳ر جنوری ۱۹۱۶ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام خط میں شعر العجم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اخلاقی شاعری میں زیادہ جھیل نہ سکے کہ مواد بہت کچھ تصوف کے نذر ہو چکا تھا، عشقیہ شاعری میں تو دریا بہا دیا ہے۔ وہ بھی ہو بہو میں کا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کچھ لکھ ڈالوں لیکن وہی چیلے ہونے والے ہوں گے۔ کا زان ادب۔ ماجد و باری لکھتے تو مجھے بھی ذرا لطف آتا کہ یہ دونوں ضرورت سے زیادہ لائق ہوتے جاتے ہیں"[6]

مولانا ماجد کے نام ۲۰ر جون ۱۹۱۸ء کے خط میں مولانا عبدالباری ندوی کو نہایت دل چسپ انداز میں ان کا رقیب قرار دیتے ہیں :

"پروفیسر عبادی کی کیا رائے ہے؟ میں نے ان کو آپ کا 'رقیب' لکھا لیکن عربوں کی اصطلاح میں یعنی آپ دونوں "محافظ عقلیات" ہیں۔ کہیے تاویل اچھی رہی؟"[7]

۳۱ر اگست ۱۹۱۸ء کو جب پروفیسر عبدالباری ندوی کو

---

[1] مکاتیب مہدی، ص ۵۷ . [2] مکاتیب مہدی ص ۱۲۵ . [3] افادات مہدی ص ۱۳ ، [4] اردو کے ایک نامور ادیب کی وفات۔ افادات مہدی ضمیمہ ص ۴ [5] ڈاکٹر محمود الٰہی نے خود یا کسی اور کی مدد سے "صحیفۂ محبت" کی طرح وہ خطوط جو مہدی افادی کے نام مختلف ادیبوں کے آئے تھے جمع کر کے شائع کرا دیا تو اردو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ [6] مکاتیب مہدی ص ۳۲ [7] مکاتیب مہدی ص ۵۷

خط لکھتے ہیں تو دونوں کے لیے کس قدر رفکرمند نظر آتے ہیں :

"آپ اور ماجد صاحب کے لیے ضرورت تھی کہ قوم کے پاس کوئی علمی سرمایہ ہوتا جس سے صرف ذاتی مصارف کے لیے دو دو سو دیے جاتے۔ دار المصنفین آپ کا عشرت کدہ ادب ہوتا اور وہیں چھوڑ دیے جاتے کہ جو جی میں آئے کرو۔"

۱۴ر فروری ۱۹۱۹ء کو مولانا ماجد کے نام خط میں دونوں کے مضامین کی تعریف نہایت اچھے انداز اور جذبے کے ساتھ کرتے ہیں :

"آپ کا فلسفۂ غالب، بر کلے اُردو لباس میں ایک مضمون صحیح انسید میں، باری کی مادیت کا دوسرا حصہ ایک ایک پڑھا۔ زندہ باشی و جان من باشی۔ سچ یہ ہے خدا تم دونوں کو نظر بد سے محفوظ رکھے میرا ادبی مذاق برا بھلا جو کچھ ہے شبلی کے بعد تم دونوں کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس میں دار المصنفین کو شریک کر لیجیے۔"

مولانا ماجد کی تعریف کا یہ انداز بھی ملاحظہ کیجیے۔ ۲۷ فروری ۱۹۱۹ء کو پروفیسر عبدالباری کے نام خط میں لکھتے ہیں :

"میری ایک نظر آپ کے حریف مقابل یعنی کافر ماجد پر بھی ہے۔ آپ دونوں کو ٹکرا کر جو فرق یا آپ کی زبان میں ما بہ الامتیاز میں نے پیدا کیا ہے وہ اس قدر نازک ہے کہ بیان سے زیادہ غور کی چیز ہے جسے میں آپ کے سلیقۂ ادبی پر چھوڑتا ہوں۔"

"مبادی علم انسانی" از مولوی عبدالباری پر مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصرے کی تعریف اس طرح کرتے ہیں :

"... "مبادی" پر ماجد کے اظہار خیال نے آپ کو دوسروں کی طرف سے بے نیاز کر دیا ہوگا۔"

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام خط مورخہ ۴ جولائی ۱۹۱۹ء میں دونوں حضرات کی فلسفہ دانی کی تعریف کرتے ہیں :

"ماجد و باری نے فلسفہ کا بہت رنگ جما رکھا ہے میں اس طرح عطر نکالنا چاہتا ہوں مگر یہ دونوں خالی ہاتھ رہ جائیں۔ لیکن مشکل کام ہے اور دقت چاہتا ہے۔"

۲۵ر جولائی ۱۹۱۹ء کے خط بنام مولانا سلیمان ندوی میں پروفیسر باری کو ماجد صاحب کے مقابلہ میں جونیر بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں :

"پروفیسر باری، ماجد سے جونیر ہیں اس لیے مفت خوری یعنی گھر بیٹھے وظیفہ کے لیے کچھ دیر سی ہے۔"

۲۷ر فروری ۱۹۲۰ء کے خط بنام ماجد صاحب میں دونوں کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں :

"اگر معارف اور الناظر آپ دونوں صاحبوں کے ہاتھ میں ہوا تو کیا کہنا سنجیدہ لٹریچر پر بہار آجائے گی۔"

دونوں حضرات سے متعلق تعریف کا یہ انداز بھی ملاحظہ کیجیے :

"... میں تو بے دے کر یاد ش بخیر عباری اور ماجد پر گزر کر لیتا ہوں کہ ان کا سلیقۂ تحریر شبلی کے بعد میری اشک شوئی کرتا ہے۔"

مولانا عبدالماجد کی تصنیف "فلسفۂ اجتماع" جس میں پیغمبروں کا ذکر جا بجا عام لیڈروں کی طرح کیا گیا ہے۔ مہدی نے پسند نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں خود مولانا دریابادی تحریر کرتے ہیں :

"میری دور جاہلیت کی ایک کتاب "فلسفہ اجتماع" نام ہے نشۂ الحاد کی حالت میں لکھی ہوئی۔ اس میں پیغمبروں کا ذکر جا بجا ہے بالکل دنیوی لیڈروں کی حیثیت سے ہے اور ان کے کارناموں پر تنقید و تبصرہ اسی انداز میں جس میں قومی اور ملکی لیڈروں پر ہوتا رہتا ہے اپنے نزدیک اس وقت اس میں حرج ہی کیا تھا؟ اور اگر کوئی روکتا ٹوکتا تو اس کی موقع بار تنگ نظری

۱؎ مکاتیب مہدی۔ ص ۵، ۲؎ مکاتیب مہدی ص ۲۰، ۳؎ مکاتیب مہدی ص ۱۱
۴؎ مکاتیب مہدی ص ۱۱، ۵؎ مکاتیب مہدی ص ۳۰، ۶؎ مکاتیب مہدی ص ۳۸
۷؎ مکاتیب مہدی ص ۹، ۸؎ مکاتیب مہدی ص ۱۴۲

اور تعصب پر لے درجے کی دھری ہوتی۔ مہدی مرحوم میری تحریر کے قدردان تو تھے ہی پرستاروں میں وعاشقوں میں تھے۔ اس کے باوجود کچھ ہی دن بعد جب لکھنؤ آئے تو مجھے ایک موقع پر تنہا پاکر بولے:

"فلسفہ اجتماع کا عاشق زار مجھ سے بڑھ کر کون ہوگا، لیکن دین میں مجھ سے چھوٹے ہو اس لیے ایک بات کان میں ڈالے دیتا ہوں۔ پیغمبروں خصوصاً پیغمبر اسلام کا تذکرہ جس طرح آیا ہے اس سے صاف استخفاف نکلتا ہے عقائد کی بحث سے قطع نظر یہ رنگ کسی سنجیدہ مصنف کی متانت تحریر کے بھی منافی ہے۔ جن شخصیتوں کا ادب واحترام کروڑوں انسان کر رہے ہوں ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھنا تو لازمۂ تہذیب و شائستگی ہے"[1]

مولانا عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں کہ:

"بات اتنے خلوص سے کہی گئی تھی کہ سیدھی دل میں اتر گئی اور جو دل منکر و مکذب تھا وہ کم از کم زبان و قلم کی حد تک تو آدمی بن گیا"[2]

پھر کا مشورہ ہے۔ ۲ر جون ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

"میں نے آپ سے لکھنؤ میں ذکر کیا تھا کہ آپ نے گو آنحضرت کی تنقیص نہیں کی، تاہم اظہار خیال کی ایک نہج میں ایک طرح کی تضحیک پائی جاتی ہے اور یہ مستلمانہ رنگ ہے مستشرقانہ سنجیدگی نہیں۔ ایک آدھ لفظ کے ہیر پھیر سے شکایت دور ہو سکتی ہے اور مقصود پھر بھی ہاتھ سے نہیں جائے گا۔ یہ میں آپ کے لیے کر سکتا ہوں۔ آپ اجازت دیتے ہیں؟"[3]

۱۴ر جون ۱۹۱۹ء کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں:

"..... اردو میں شبلی کے مصلح اعظم کو "محمد" نہ لکھیے آنحضرت لکھیے۔ تو لٹریچر آپ کا شکر گزار ہوگا"[4]

مولانا عبدالماجد کا قیام ابتدائی زندگی میں حیدرآباد میں ایک سال رہا تھا، اسی زمانہ میں عقائد کی آڑ لے کر دکن کے اخبارون نے مولانا پر حملے شروع کر دیے۔ مولانا کے لیے یہ چند ماہ بہت پریشانی کے تھے۔ جب اس کی اطلاع مہدی حسن کو ہوئی تو ۲۴ر مارچ ۱۹۱۷ء کو وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:

"جس جلیل القدر[5] شخصیت کا آپ نے ذکر کیا ہے اپنے روابط ان سے قائم رکھیے اور ہم جنسوں میں یعنی جس دائرہ میں آپ "ضابطۃً" رکھے گئے ہیں ان میں سے کسی سے کامیابی تو خیر کسی بعد سے بعید توقع کا ذکر بھی نہ آئے اسی طرح شب کے کھانے کی میز کا راز خمار صبح بھی افشا نہ کرنے پائے۔ آپ خود نفسیات کے عالم ہیں لیکن جی نہیں مانتا چھوٹا بھائی سمجھ کر حدود سے نکلا جاتا ہوں"[6]

۲۶ر اپریل ۱۹۱۸ء کو جوش بلگرامی صاحب کو مولانا عبدالماجد دریابادی کا خیال رکھنے کے لیے تاکید کرتے ہیں:

"اخباروں میں ماجد صاحب پر بہت لے دے ہو رہی ہے کچھ لوگ در پے آزار ہیں ذرا خیال رکھیے گا۔ اندھیرے گھر کا چراغ ہے۔ یعنی ملک میں خالص عقلیات کا رواج نہیں ایسے ایسے تاریک خیال موجود ہیں کہ رات تو خیر ان کو دن میں بھی نہیں سوجھتا"[7]

مولانا عبدالماجد کے نام مہدی کے خطوط بہت زیادہ نہیں حاصل نہیں ہو سکے ہیں، جو کچھ ملے ہیں وہ بہت مختصر مدت کے دوران میں لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے مولانا سے مہدی کے گہرے تعلقات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف مولانا کے خطوط کا انتظار کرتے تھے بلکہ ان کی ہر تحریر کے منتظر رہتے تھے اور بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ پھر دل کھول کر تعریف و تحسین کے نعرے بھی بلند کرتے تھے، مشورے بھی

---

[1] نقوش شخصیات نمبر حصہ اول ص ۴۰۔ [2] نقوش شخصیات نمبر ا، ص ۴۰۔ [3] مکاتیب مہدی ص ۷۵، [4] مکاتیب مہدی ص ۸۱۔
[5] نواب امین یار جنگ۔ [6] مکاتیب مہدی۔ ص ۴۹۔ [7] مکاتیب مہدی ص ۱۶۷

دیتے تھے۔ خامیوں اور کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کرتے تھے۔ نئے نئے موضوعات پر توجہ بھی دلاتے تھے، اچھی امیدیں بھی وابستہ کرتے تھے۔ ان کے شاندار مستقبل کی بشارت بھی دیتے تھے، پیٹھ پیچھے بھی ان کی تعریف کرتے تھے اور کبھی شریکِ حیات سے گفتگو ہو رہی ہے، کبھی دوستوں کا ذکر چھڑ گیا ہے، کبھی دوسروں کے نام خطوط میں تعریفیں کی جا رہی ہیں، کبھی خلوص کی محفلیں جمی ہوئی ہیں اور بے تکلفی کی حکمرانی ہے، خوشیاں ہیں، جرتیاں ہیں۔ زیرِ لب مسکراہٹیں ہیں، خط پڑھتے جائیے اور مولانا ماجد سے قربت محسوس کرتے جائیے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے متعارف ہوتے جائیے۔ ذیل کے اقتباسات مولانا عبدالماجد دریا بادی سے نہ صرف تعارف کراتے ہیں بلکہ جان پہچان اور ان کی شخصیت کے نقوش کو دل و دماغ میں ابھارنے میں بڑی مدد کرتے ہیں:

۲۴ر مارچ ۱۹۱۸ء ــــ

"...... پچھلے معارف میں کس قدر پیارا مضمون تشکیک مذہب پر اتھا۔ سچ یہ ہے آپ میرے دل کا ارمان پورا کرتے ہیں[1]"

"اس سے بے دل نہ ہوجیے کہ ایک لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں، آپ کا امتیاز آپ کا کمال اجتہاد قائم رکھے گا جس کی جھلک آپ کی ہر تصنیف میں پائی جاتی ہے۔ اتنا کیجیے کہ ضابطہ سے علیحدہ بھی کرتے جائیے۔ شبلی کی طرح کہ "ایک گود میں ایک بزیٹہ میں"۔ کسی وقت فرزندانِ حرفی کی تخلیق سے خالی نہیں! یہ ترکیب بیکار نہیں جاتی کم فرصتی کے ساتھ بھی ذخیرہ پیداوار بڑھتا جاتا ہے[2]"

۴ر مئی ۱۹۱۸ء ــــ

"میں آپ کی اس رائے سے اتفاق ہی نہیں کرتا بلکہ قدر کرتا ہوں کہ معارف کا اور پرچوں کے ساتھ نام لینا اس کی توہین کرنا ہے[3]"

۲۵ر مئی ۱۹۱۸ء۔

"حالی کی "غزلیت" پر میں نے آپ کی تنقید بہت دلچسپی سے پڑھی لیکن تسکین نہیں ہوئی۔ صفحے محدود تھے[4]

خوش ہوا آپ کی روشنیِ طبع آپ کے لیے بلائے جان نکلی۔ "رسالہ اعادۃ الملک" پر آپ کے قلم کی سرسری جنبش بھی لٹریچر کا حق ادا کرے گی۔ "طباطبائی" کے ثقیل الفاظ کی ٹھوکروں سے میں اس قدر گھبراتا ہوں کہ ان سے قطعِ نظر ہی بہتر تھی۔ آپ ان نزاکتوں کو سنبھال لیں گے جو صاحب الرسائل کے پیشِ نظر ہیں، یہ مطلب وقتاً فوقتاً مبادلۂ خیالات سے مکمل آ سکے گا[5]"

"معارف میں تصورات کثیرہ کے چند نمبر دیکھ کر خیال ہوا بھائی ماجد کا ایک رقیب نکلا۔ پچھلے "الناظر" میں "مادیت" نے اس خیال کو اور تقویت دی۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ ان مسائل کو جو یونانیوں سے ماخوذ ہیں اور اسلامی لٹریچر کا ایک جزو ہو گئے ہیں تحقیقاتِ جدیدہ سے ٹکراتے۔ مثلاً حواسِ باطنی کو لیجیے۔ ان کی تجدید کس قدر "نفسیات" حال کے خلاف ہے۔ اسی طرح منطق کے بہتیرے دوراز کار مسائل ہیں جن کی دھجیاں اڑانے کی ضرورت ہے۔ شبلی نے "فلسفہ یونان و اسلام" کے سلسلے میں کچھ

---

[1] بنام مولانا ماجد مکاتیبِ مہدی ص ۴۸ ۔
[2] بنام مولانا ماجد مکاتیبِ مہدی ص ۵۵ ۔
[3] مکاتیبِ مہدی۔ ص ۵۵ ۔
[4] مکاتیبِ مہدی ص ۴۹ (بنام مولانا ماجد)
[5] مکاتیبِ مہدی بنام مولانا ماجد ص ۵۶
[6] یہ مضامین مولانا عبدالباری ندوی کے تھے۔

اظہار خیال کیا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ آپ یہ کمی پوری کر سکتے ہیں[1]۔"

یکم اگست ۱۹۱۸ء —

"شکر ہے آپ نے ایک خطرناک مرض سے نجات پائی جو عموماً امرائے یورپ کے حصے میں آتا ہے[2]۔"

---

۲۹ اکتوبر ۱۹۱۸ء —

"خوش ہوا کہ آپ اونچے پیمانے پر اردو لٹریچر کی ارتقائی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔ آج آپ سے زیادہ کس میں یہ قابلیت ہے کہ اس موضوع کی نزاکتیں سنبھال سکے ہم بادصف حسن ظن اہل یورپ سے کہاں تک امید کر سکتے ہیں۔ جو یونان کے فلسفہ کا ماخذ قرآن میں ڈھونڈھتے ہیں۔ اسی طرح پیغمبران فلسفہ ہیوم اور مل کو اگر آپ روشناس اردو کر سکے تو کیا کہنا۔ آپ کی نکتہ سنجیانہ "مے دو آتشہ" کا رنگ پیدا کر دیں گی۔ دیکھیے اور میری زندگی میں دیکھیے کہ ایک تشنہ ادب آپ کی فلسفیانہ قلم کی روانی سے کچھ تو سیر ہو سکے[3]۔"

---

۲ نومبر ۱۹۱۸ء —

"ماڈرن ریویو کے سلسلہ میں یاد فرمائی کا شکریہ۔ مضمون پڑھا، انگریزی بھی ٹکسالی" اللہ کرے زور قلم اور زیادہ "مسلمان" کی جگہ مسلم فصیح رہتا ہے[4]۔"

۴ فروری ۱۹۱۹ء —

"خوب یاد آیا۔ بعض لوگ آپ کے مقابلہ میں اپنا درجہ قائم رکھنے کے لیے "نفسیاتی" کی جگہ "نفسانی" لکھتے رہتے ہیں جو خاص مفہوم کے لحاظ سے بے معنی یا کم سے کم غیر مصطلح تو ضرور ہے۔ حماقت کسی کو ہو دلچسپی سے خالی نہیں ہوتی[5]۔"

---

۱۱ مارچ ۱۹۱۹ء —

"کوئی خالص ادبی کام کیجیے۔ مل جل کر اردو کا ایک لغت طیار کر ڈالیے۔ ایک "لغات الخواتین" ہی ہوتی دنیا کیا جانے گی کہ لکھنؤ سے لگی اور دہلی میں بجی۔ کسی وضعدار خطہ کی زبان تھی۔ محمود آباد کی طرف نہ دیکھیے اپنی طرف دیکھیے[6]۔"

---

۲۲ اپریل ۱۹۱۹ء —

"کیجیے رامپور سے کیا لائے۔ مادی اور ادبی دونوں حیثیت سے کچھ وہاں کی زندگی کا خاکہ دکھلایے۔ یعنی آپ جب تک رہے کیا کرتے رہے اس کے ساتھ یہ بھی بتایے کیا کیا دیکھا؟[7]"

---

۲۴ مئی ۱۹۱۹ء —

"پیارے ماجد۔ آپ کا پچھلا عنایت نامہ اور اس کی دلچسپ تفریحات پیش نظر تھیں کہ مکالمات کی ایک جلد ملی۔ اس سے سیر نہیں ہونے پایا تھا کہ دفعتاً ہمدم میں آپ کے وظیفہ علمی کی خبر دیکھی میری دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

میں اس واقعہ کو آپ کی تمدنی ضروریات کے لحاظ سے صرف ایک مسئلہ اقتصادی نہیں سمجھتا۔ اسی طرح عطیہ ماہوار کی سند آپ کی ادبی منازل کے لیے صرف پروانہ

---

[1] بنام مولانا عبدالماجد۔ مکاتیب مہدی ص ۵۷ ۔ [2] مکاتیب مہدی ص ۶۰ ۔ [3] مکاتیب مہدی ص ۶۸
[4] مکاتیب مہدی ص ۶۹ ۔ [5] مکاتیب مہدی ص ۷۴
[6] مکاتیب مہدی ص ۷۶ ۔ [7] مکاتیب مہدی ص ۷۷

را ہاری" نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ آپ کی
"حریت نفسی"
کی یہ وہ قیمتی ضمانت ہے جس سے آپ اس لائق ہوئے کہ بڑی
دنیا کے مقابلے میں اپنی کامل آزادی قائم رکھ سکیں اور یہی
بڑے سے بڑا تخیل ہے، جو فلسفیانہ توکل کے اعزاز کے
لحاظ سے ناگزیر سا ہے[1]"

۴ر جون ۱۹۱۹ء ۔۔۔

"پیارے مفصل خط کا شکریہ۔ میں نے نہایت دلچسپی
سے حرف حرف پڑھا۔ آپ کی فلسفیانہ استقامت کی داد دیتا
ہوں، کہ نہایت سخت آزمائش کے موقع پر بھی جو دنیا میں
پیش آسکتا ہے اپنا مطمح نظر قائم رکھا اور آزادی نہیں کھوئی۔
آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو"
سالانہ ایک تصنیف کی قید کو انشاء اللہ خان کی کر نہ سمجھئے گا
کہ بارہ مہینے میں بارہ تو پر ایک کتاب لکھ دینا آپ کے لیے
بڑی بات نہیں البتہ یہ مجھے ناگوار سا ہے کہ آپ کو اپنے
نئے افکار کا خاکہ محکمہ احتساب میں پیش کرنا ہوگا اس طرح
سفر حیدرآباد کے مصارف کا بار آپ کی جیب پر! "فلک نما"
کی رفعت نفس کے لحاظ سے ایک گری ہوئی بات ہے لیکن
یہ شرائط میرا خیال ہے عارضی ہیں اور جب آپ اعتبار پیدا
کر لیں گے تو یہ بندشیں رفتہ رفتہ ڈھیلی ہو جائیں گی بہر دست
ان امور پر غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ نہ آپ کی شگفتگی
طبع پر اس کا کوئی اثر ہونا چاہیئے۔ ایک تندرست عورت
کی طرح جو ہر سال ایک خوبصورت بچہ سے دنیا کی رونق
بڑھائے۔ آپ کے دل و دماغ کی پیداوار بھی ایک باقاعدہ
نظام کے تحت ہوگی اور اس طرح قوم آپ کو "کمیت اور
کیفیت" کا جہاں تک تعلق ہے ملک کے بڑے سے بڑے
مصنف کے پہلو میں جگہ دے سکے گی[2]"

۴ر جون ۱۹۱۹ء ۔۔۔

"اب لگے ہاتھوں فلسفہ قدیم کے مقابلہ میں جس میں
منطق بھی داخل ہے اپنی برادری یعنی ڈیکارٹ لاک کینٹ
مل، ہیوم وغیرہ کے افادات کو لائیے اور ٹکرا کر وہ بات
پیدا کیجئے جو آج تک کسی سے نہیں ہو سکی۔ اس کی ضمانت
میں کرتا ہوں کہ کامیابی آپ کی جنبش قلم کی بلائیں لے
رہی ہوگی[3]"

۲۵ر جولائی ۱۹۱۹ء ۔۔۔

مولانا عبدالماجد دریابادی پہلی مرتبہ دارالمصنفین تشریف
لائے تو مولانا سید سلیمان ندوی کو نہایت دلچسپ انداز سے
خط لکھتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

"عنایت نامہ ملا کا فرادا "مہمان حرم" رشک آیا کہ میں
اس موقع پر نہ ہوا آپ لکھتے ہیں کہ "اس ہفتہ میں بخدا یہ بھی
نہ معلوم ہوا کہ آفتاب کب نکلا، کب ڈوبا، کیسے دن گزرے۔
آپ اس قدر معتبر راوی ہیں کہ میں اس کے حرف حرف پر
ایمان رکھتا ہوں لیکن کیا میں اس سے یہ قیاس نہیں
کر سکتا ہوں کہ جس طرح روزے نئی مشین کی ترتیب
تکمیل کے نذر ہوئے یہ ہفتہ نمازوں سے خالی گیا![4]"

۳۱ر جولائی ۱۹۱۹ء ۔۔۔

"یہ اثر باقی تھا کہ معارف میں جواب آپ کا ہے "توجیہ
کی ماہیت نفسی" دیکھی بھئی سچ یہ ہے میں سمجھتا تھا شبلی

---

[1] مکاتیب مہدی ص ۸۰۔ [2] مکاتیب مہدی ص ۷۹ ۔ ۸۰
[3] مکاتیب مہدی ص ۸۰ ۔ [4] مکاتیب مہدی بنام سید سلیمان ندوی ص ۲۷۔

کے ساتھ لٹریچر کا لطف گیا۔ لیکن آپ کی نکتہ آرائیاں سب سے بڑی کمی کی تلافی ہی نہیں کرتیں بلکہ مجھے حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ خدا نظر بد سے بچائے معارف میں آپ کے چلنے کا خوب موقع ملے گا اور جتنے عنوانات قائم کیے گئے ہیں آپ کی جنبش قلم کے آثار اچھے اچھوں کو الجھائیں گے[1]

---

۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء

"تاریخ الاخلاق کی دوسری جلد ملی، اور سب پڑھ گیا آپ معاف فرمائیں گے۔ میں نے کتاب "گرفت" کی نظر سے دیکھی لیکن سخت کاوش پر بھی مجھے کوئی بات ایسی نہ مل سکی جسے اردو لٹریچر سے ایک خاص طرح کی مناسبت اور اسکے اونچے معیار لطافت کے ثبوت میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ کتاب ترجمہ کہیں سے معلوم نہیں ہوتی۔ ایک مستقل لٹریچر ہے جو حکیمانہ استخراج نتائج کے ساتھ سلاست اور روانی بیان کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ کتنے لوگ میری اس رائے کو برداشت کر سکیں گے کہ شبلی کے بعد اس درجہ کا لٹریچر 'یاران باصفا' ماجد دریابادی کے سوا کسی اور کے بس کا نہیں[2]"

یکم اپریل ۱۹۲۰ء

"آپ نے انگریزی کے بعد عربی پڑھی تاہم ادائے خیال میں وہی زور اور بے ساختہ پن پاتا ہوں جو ان لوگوں کا حصہ ہے۔ انگریزی جن کی زبان ثانی ہے اور یہ ایک استثنا ہے[3]۔"

"اب آپ مہربانی فرما کے اخلاقیات کو لیجیے اور تربیت پر نفسی حیثیت سے نظر ڈالیے کیونکہ اردو میں جس قدر مواد ہے وہ غیر مرتب اور ناقص ہے لکھنے والے کی معلومات کی وجہ سے پہلو بچا جاتے ہیں، سب تو سب شبلی نے الغزالی میں احیاء العلوم کو بہت سراہا۔ تاہم اخلاق پر مستقلاً اظہار خیال نہیں کیا۔ نہ قدیم کو جدید اخلاقیات سے ٹکرایا[4]"

"آپ کی نئی تصنیف کا نام 'فلسفہ من' ہو تو کیا ہرج ہے۔ آج کل ایک نیا عنوان 'اردو شاعری کی بسرزمی' پیش نظر ہے۔ لیکن مجھے زیادہ کھلنا پڑے گا، آپ ڈانٹیں گے کہ ابتذال ہے[5]"

اپنے مضمون "اردو و ادب کے عناصر خمسہ" میں مولانا کے متعلق اس قسم کے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں:

"بہر حال میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شبلی پر کوئی قلم اٹھانا چاہے تو جدید تنگ کے سامانوں میں کمی نہیں۔ میرے خیال میں سید عبدالماجد اگر فلسفہ تاریخ سے اتنی ہی دلچسپی کا اظہار کرتے جس اہتمام سے "الکلام" پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی تو کفارۂ معصیت کے ساتھ تنقید کا بھی حق ادا ہو جاتا[6]"

اپنے مضمون "معاصرانہ چشمک" کے سلسلہ میں ۲۴ مارچ ۱۹۱۸ء کو مولانا دریابادی کو آگاہ کرتے ہیں:

"میں ادیبانہ یا معاصرانہ چشمک کے عنوان سے کچھ زہر اگلنا چاہتا ہوں، دکھانا یہ ہے کہ شبلی نے "بہتر سے بہتر سوانح عمری" کے مولف پر ہمیشہ چوٹ کی۔ چند موقعوں کے اقتباسات میرے پیش نظر ہیں۔ حالی نے ہمیشہ شبلی کو فیاضانہ یاد کیا لیکن ایک موقع پر جھلا کر کچھ اختلاف کیا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا[7]"

---

[1] مکاتیب مہدی ص ۸۱ ، ۸۲ ، [2] مکاتیب مہدی ص ۸۸۔ [3] مکاتیب مہدی ص ۹۴۔ [4] مکاتیب مہدی ص ۹۴۔
[5] مکاتیب مہدی ص ۹۴۔ [6] افادات مہدی ص ۲۲۶۔ [7] مکاتیب مہدی ص ۵۰۔

۲۵ر مئی ۱۹۱۸ء کو اپنے مضمون "معاصرانہ چشمک" کو "ذخیرہ" میں بھیجنے کی اطلاع دیتے ہیں:

"معاصرانہ چشمک 'ذخیرہ' کو بھیج دی گئی۔ دیکھئے آپ کہاں تک پسند کرتے ہیں۔ ریویٹ میں عناصر خمسہ کا پورا دائرہ ہے، لیکن اصل زد شبلی پر ہے۔"[1]

۲۰ر جون ۱۹۱۸ء کو "معاصرانہ چشمک" کے سلسلے میں پھر لکھتے ہیں:

"چشمک خوش ہوا، آپ کو پسند آئی۔ شبلی کے ساتھ میری عقیدت معلوم ہے تاہم وہ حالی کے ساتھ جس طرح پیش آئے مجھے ناگوار سا تھا۔"[2]

لیکن جب ۴ر فروری ۱۹۱۹ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کو "معاصرانہ چشمک" کے سلسلہ میں آگاہ کرتے ہیں تو اسے مولانا ماجد کی فرمائش تحریر کرتے ہیں:

"حیدرآباد کی بزم ادب کے روح رواں یعنی ماجد کی فرمائش سے میں نے "معاصرانہ چشمک" کے عنوان سے چند صفحے لکھے تھے جن میں بالتخصیص حالی و شبلی پر نظر ڈالی گئی تھی آپ پر بھی ایک فقرہ ہو گیا تھا۔ خیال تھا کہ ذخیرہ میں شائع ہو لیکن پروف آتے آتے وہ دفتر گاؤ خورد ہو گیا اب ماجد کا اصرار ہے کہ وہ معارف میں نکلے۔"[3]

کسی خط میں مہدی نے INDIFFERENT کے لیے اردو لفظ دریافت کیا تھا، مولانا ماجد نے لکھ بھیجا تھا کہ "بین بین" سے اکثر موقع پر مفہوم ادا ہو جائے گا۔ لغت میں ایک لفظ میہما بھی ملتا ہے اس سلسلے میں مہدی تحریر کرتے ہیں:

"بین بین بعض موقعوں کے لیے خوب رہا۔ میہما لفظ بالکل ٹھیک ہے۔"[4]

۲۹ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کے خط میں کس قدر پر لطف انداز اختیار کرتے ہیں:

"آپ کا پرستانِ سفری وہ بھی تخت رواں (ریل) پر بہت ہی لائق رشک رہا۔ سچ یہ ہے کہ جنس لطیف اپنی پاکیزہ حسن اور کافرادائی کے ساتھ کائنات کے خوبصورت چہرہ کا غازہ ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے شرط زندگی بھی ہے کہ بغیر اس کے دنیا ہمارے رہنے کے لائق نہیں تھی۔"[5]

مولانا عبدالماجد کے پہلے بچے کے انتقال پر مہدی کے تاثرات بھی ملاحظہ کیجئے۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

"پیارے ماجد آپ کا کارڈ باندہ سے لکھنؤ ہوتا ہوا کل مجھے ملا اور نہایت افسوس ہوا کہ محبت کا ثمرۂ اولیں ضائع ہوا۔ غالباً یہ عالمگیر بخار کی عنایت ہوگی۔

ہماری متفقہ ہمدردی آپ سے زیادہ اُن کے ساتھ ہے جن کی بھری گود دفعتاً خالی ہو گئی اور جن کا آج کل یہ نقشہ ہوگا۔

یہ سینہ میں تا زندگانی رہے گا

ترا داغ دل میں نشانی رہے گا

آپ تنہا نہ چھوڑتے تو اچھا تھا، ساتھ رکھئے یا ساتھ رہیئے کہ نئی نئی چوٹ کے لیے مرہم زخم کی ضرورت ہے۔ قانون فطرت کا یہی بے تکا پن بعض وقت بلائے جان ہوتا ہے۔ مگر یہ انسان کی عام تقدیر ہے۔"[6]

ان اقتباسات کی روشنی میں مولانا دریابادی کی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں وہ ابتدا میں کیا تھے۔ کیا سوچتے تھے کیا لکھتے تھے، ان کا مزاج کیا تھا، انداز فکر کیا تھا ان کی ابتدائی ادبی زندگی کیسی تھی، ان کے احباب کس مزاج کے تھے۔ ماحول کس طرح کا تھا، چھوٹی بڑی اس طرح کی بہت سی باتیں ابھرتی ہیں جن کی روشنی اور پس منظر میں مولانا کی تنہا واضح اور روشن دلکش شخصیت سامنے کھڑی نظر آتی ہے جن سے مل کر دل و دماغ کو فرحت نئی مسرت اور توانائی حاصل ہوتی ہے۔

---

[1] مکاتیب مہدی ص ۵۰ ۔ [2] مکاتیب مہدی ص ۵۸

[3] مکاتیب مہدی ص ۳۲ ۔ [4] مکاتیب مہدی ص ۴۰

[5] مکاتیب مہدی ص ۶۸ ۔ [6] مکاتیب مہدی ص ۷۰

عمر انصاری

مولانا عبدالماجد دریابادی

زباں ایسی، گماں ہو جس پہ دریا کی روانی کا
بیاں ایسا کھنکتے ہوں کہیں جام و سبو جیسے

تفکّر اور تخیّل کی ادا کاری کا ہر منظر
خراماں نور و نکہت ہوں چمن میں چارسو جیسے

ہر اک سادہ سے مضموں میں بھی اس انداز کے تیور
اٹھا ہو لے کے انگڑائی ابھی اک ماہ رو جیسے

وہ الفاظ و معانی کی صدا دیتی ہوئی دنیا
کسی کھلتے ہوئے گلزار کا جوشِ نمو جیسے

بیانِ فلسفہ ہو یا حدیثِ علم و حکمت ہو
قریبِ دل کسی سے ہو رہی ہو گفتگو جیسے

اشاروں، استعاروں اور کنایوں کے وہ میخانے
سرِ دستِ حنائی ساغر و جام و سبو جیسے

مناظرہ وہ مسائل کی برافگندہ نقابی کے
کھڑا ہو حسن آئینے میں اپنے روبرو جیسے

ہر اک فکر و نظر کے آئینہ خانے کا وہ عالم
رواں باہم دگر ہو کاروانِ رنگ و بو جیسے

جنونِ شوق کی ہر ہر قدم وہ شعلہ سامانی
ہو صدیوں سے کسی کو آپ اپنی جستجو جیسے

جہاں میں بس تھی یوں ہی حضرتِ ماجد کی ہستی بھی
زباں ہائے زمانہ میں زبانِ لکھنؤ جیسے

شمس تبریز خاں

مولانا عبدالماجد دریابادی

تاثرات و ملاحظات

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم سے عقیدت و تعلق کی ابتدا ۱۹۵۰ء میں ہوئی جب میں ان کے بلند پایہ اخبار صدق جدید کا خریدار بنا، اس میں میری دلچسپی کا سبب مولانا کا مخصوص طرز تحریر اور ادبی طنازی تھی۔ سچی باتیں، اداریے، نوٹس، مشورے اور گزارشیں، رسید کتب اور کتابوں پر تبصرے، اور مولانا کے مستقل مضامین، سبھی اپنا جداگانہ اور یگانہ انداز رکھتے تھے۔ اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اس وقت صدق سے مجھے ایسا شغف تھا جیسا کبھی مولانا آزاد کے الہلال اور مولانا محمد علی کے ہمدرد، و کامریڈ، سے لوگوں کا ہوتا تھا۔ ڈاک پر صدق کا بے چینی سے انتظار رہتا اور ڈاکیہ کی صورت طلعتِ محبوب بن جاتی۔

اسی سال مولانا نے لاہور میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی مذاکرۂ اسلامیات میں شرکت کی تھی اور اس کی روداد "سفرِ لاہور" کے عنوان سے اپنے ادبی اسلوب میں شائع کرنا شروع کی جس نے صدق سے دلچسپی میں اور اضافہ کر دیا۔ ۱۹۵۸ء شروع ہوا اور فروری میں مولانا آزاد کا انتقال ہوا، مولانا دریابادی نے پہلے "آہ ابوالکلام" کے عنوان سے چند سطریں ماتمی کالم کے ساتھ شائع کیں جن میں مولانا آزاد کی شخصیت کے اہم عناصر بڑے ایجاز و اختصار کے ساتھ آگئے تھے، پھر کچھ دنوں کے بعد "ابوالکلام: ذاتی تاثرات" کے عنوان سے کئی قسطوں میں تفصیل کے ساتھ اپنی یادوں کو تازہ کیا تھا۔ وہ مضمون بھی مولانا کے چند منتخب ماتمی مضامین میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

۱۹۵۹ء سے مولانا سے میری مراسلت شروع ہوئی جو ایک عارضی وقفے کے ساتھ ۱۹۷۶ء تک جاری رہی اور اس عرصے میں مولانا کے تقریباً سو خطوط میرے پاس محفوظ ہو گئے۔ میں مختلف علمی، ادبی اور مذہبی سوالات کرتا اور مولانا اپنے قیمتی وقت کا ایثار کر کے ان کے جواب سے نوازتے۔ میں نے مولانا کے نام اپنے پہلے خط میں الہلال کی اس بحث کے بارے میں دریافت کیا جو "حظ و کرب یا لذت و الم" کے عنوان سے الہلال میں چل پڑی تھی، مولانا کا اس سلسلے میں ۷ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کو یہ عنایت نامہ موصول ہوا:

مہربانِ بندہ! وعلیکم السلام

اب ان پرانی فراموش شدہ بحثوں کو از سرِ نو زندہ کرنے سے کوئی حاصل نہیں۔ بات اتنے عرصے کی ہو گئی کہ تفصیلات اب مجھے یاد بھی نہیں۔ ۴۵، ۴۶ سال کی مدت کچھ تھوڑی ہوتی ہے؟ اور نہ اب اس موضوع سے کوئی خاص دلچسپی ہی رہ گئی ہے۔ آپ کے رفع انتشار کے لیے بس اتنا لکھے دیتا ہوں کہ اہل علم و ادب کے دو گروہ اس وقت تھے، ایک کے ساتھ صاحب الہلال تھے، دوسرے کے ساتھ یہ بے علم خاکسار، وہی اختلاف ذوق شاید اب بھی قائم ہو، مسئلہ صرف ایک پہلو کی ترجیح کا تھا، نہ کہ کسی فریق کی یکسر تغلیط و تردید۔ اور پھر اس میں شدت کا مظاہرہ جس حد تک میری طرف سے ہوا ہو، اللہ اسے

معاف فرمائے ...."

فروری یا مارچ ۱۹۷۲ء میں مولانا کے برادر زادہ حکیم عبدالقوی صاحب اور اپنے رفیق درس مولوی زاہد جگہری کے ساتھ لکھنؤ سے دریاآباد مولانا سے ملاقات کرنے گیا۔ پروگرام پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ جیسا کہ مولانا کا عمر بھر معمول رہا، بڑی شفقت و بشاشت کے ساتھ ملے اور تعارف کے بعد ہم لوگوں کے مختلف علمی سوالات کے جواب دیتے رہے۔ آیت وما قتلوہ وما صلبوہ ... کے سلسلے میں وہ ساری باتیں دہرائیں جو اپنی "تفسیر ماجدی" میں لکھ چکے تھے۔ جس سے مولانا کی حاضر دماغی کا اندازہ ہوا۔ اس کے بعد گفتگو میں اپنی محبوب شخصیتوں، حضرت تھانویؒ، مولانا محمد علی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، اور اکبر الہ آبادی کے بارے میں مختلف واقعات و تاثرات کا ذکر رہا۔ اس وقت مولانا پر بڑھاپا آچکا تھا مگر صحت اچھی تھی، اور چہرے بشرے سے مستعدی جھلکتی تھی۔ کھدر کے خلافتی لباس میں ان کی بزرگ شخصیت بہت سنجیدہ و باوقار نظر آتی تھی، ان کی ذات، محکم مشرقیت و اسلامیات کا سراپا اور مجسم علمیت محسوس ہوتی تھی۔ اس گفتگو میں مستشرقین یورپ کی محنت و دیدہ ریزی اور علمی خدمت و شغف کو بھی سراہتے رہے کہ وہ کس طرح مستند اور فرسٹ ہینڈ حوالوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور کیسے بڑے کام کر جاتے ہیں، خاص طور پر E.W. لین کی انگلش عربی ڈکشنری کی بہت تعریف کی۔

ایک دن قیام کرکے دوسرے دن صبح کو ہم لوگ لکھنؤ واپس آگئے اور اس یادگار ملاقات کو یاد کرکے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس کے بعد بھی خاتون منزل (مولانا کی قیام گاہ پر) ایک آدھ بار ملاقات ہوئی اور سلسلۂ مراسلت بھی بدستور برقرار رہا، میرے بہت سے خطوط کے جواب جو ناظرین صدق کے لیے مفید ہوتے تھے۔ مولانا انھیں صدق کے صفحات میں ہی جگہ دے دیتے تھے۔

۱۹۶۴ء میں دارالعلوم دیوبند سے تعلیمی فراغت کے بعد تلاش معاش اور دوسری مصروفیات کے سبب مولانا سے مراسلت نہیں ہوسکی پھر ۱۹۶۶ء سے سلسلۂ مراسلت شروع ہوا اور ان کی زندگی کے اخیر تک برقرار رہا۔

اسی عرصے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ایک رفیق کی ضرورت ہوئی تو میں بھی اس کے امیدواروں میں تھا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولانا مرحوم میرے حق میں تھے۔ خاص طور پر مولانا کے ان دنوں کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اس معاملے سے ان کو تعلق خاطر تھا مگر اس معاملے میں وہ بے بس تھے اپنے ۲ دسمبر ۱۹۶۶ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "دارالمصنفین کے معاملے میں میری صدارت سے دھوکا نہ ہو اور خوش ظنی سے کام نہ لیا جائے۔"

میری صدارت بس بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت ہے۔ ..."

اس سلسلے میں ناکامی پر مولانا کا یہ تسلی نامہ مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۶۷ء موصول ہوا:

"دنیا نام ہی طرح طرح کی ناکامیوں کا ہے۔ ہر شخص کو تجربہ اپنی اپنی ہی زندگی کا ہے۔ مجھے تو شروع سے اب تک زندگی کے ہر دور میں خدا معلوم کتنی ناکامیاں اور ناکامیاں پیش آ چکی ہیں۔ ؎

ہرگز نشود جیسا کہ دلخواہ کسے است"

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ام الانسان ما تمنیٰ؟

اس عرصے میں رسائل و جرائد میں میرے قلم سے بہت سے مضامین نکلے جن میں سے بعض پر مولانا کی نظر پڑتی اور وہ قابل تحسین ہوتا تو اظہار خیال فرمایا کرتے تھے۔ فاران کراچی میں میرے کسی مضمون کے بارے میں ۱۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو تحریر فرماتے ہیں۔

"اتفاق سے فاران میں اس مضمون پر نظر پڑ گئی، مضمون بجائے خود اچھا ہے لیکن انگریزی الفاظ کا یہ سیلاب سمجھ میں نہ آیا، اکبر کے شعر کا پہلا مصرعہ صحیح یوں ہے ؎

جو مضطرب ہے اس کو ادھر التفات ہے"۔

رسالہ فروغ اردو لکھنؤ میں شائع شدہ مضمون "مولانا محمد علی جوہر کی شاعری" کو بھی پسند فرمایا تھا۔

مولانا سے میری مراسلت کا بیشتر حصہ ان سے علمی استفادہ ہی سے لیے تھا اور اس طویل مراسلت کے ذریعہ مولانا نے ذہنی وفکری

سکا بگت محسوس کرکے بعض خطوط میں ملاقات کے لیے لکھا تاکہ وہ بعض مسائل پر کھل کر اظہار خیال کر سکیں۔ چنانچہ ۸ ستمبر ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"..... اس بڑے مصنوف کے بعد مجھے ضرورت ملاقات کی محسوس ہو رہی ہے کہ تیئے کو ذرا بھجوا تو سکوں، ماہ اکتوبر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں انشاء اللہ گزرے گا۔ اگر آپ کو ذرا فرصت مل سکے تو وہاں کا سفر بہ مقابلہ دریا باد کے آسان تر ہوگا۔ علی میاں وغیرہ سے بھی ملاقات کا امکان ہے، ندوہ کی سیر بھی ہو جائے گی۔ گو ندوہ سے لکھنؤ آمد و رفت کا لیے میرے ذرہ جیسا کہ بہت سے عزیزوں اور ان کی طالب علمانہ زندگی کے لیے رکھتا ہوں۔

دعا گو

عبدالماجد

مگر کسی وجہ سے میں یہ سفر نہ کر سکا تو مولانا نے کئی خطوں میں اس پر افسوس فرمایا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو لکھتے ہیں "ملاقات نہ ہو سکنے کا دلی افسوس رہا، لکھنؤ میں طویل قیام کا موقع تو شاذ و نادر ہی ہاتھ آتا ہے، اب یہ موقع جلد کیوں ہاتھ آنے لگا"۔

۱۹۶۸ء سے میرے قیام لکھنؤ کے بعد سے مصروفیت کے سبب مولانا سے مراسلت جاری نہ رہ سکی جس کو انھوں نے بہت محسوس کیا۔ میرے خط کے جواب میں یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء کو لکھتے ہیں :

"مشفقی! وعلیکم السلام

" میں تو معمولی تعلقات کی طرف سے بھی مایوس ہو کر اب صبر کر چکا تھا۔ آج ہی لکھنؤ کا پروگرام ہے۔ چار ہفتے کے لیے ملاقات کا وقت تو وہیں سہ پہر کا رہ گیا ہے..... "

یہ خط جس طرح مولانا کی وضعداری و شرافت نفسی کی آئینہ داری کر رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کے بعد مولانا کی قیام گاہ (خاتون منزل) میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں جن سے ان کی وضعداری اور تعلقات کی پاسداری کا نقش اور گہرا ہوتا گیا۔ ان ملاقاتوں میں مولانا میرے ان دوستوں کو بھی پوچھا کرتے تھے جو کبھی ان سے مل چکے تھے یا مراسلت رکھ چکے تھے۔

مولانا نے اپنے قیام لکھنؤ کو اپنی گوشہ نشین طبیعت کے تقاضے سے بہت مخفی رکھتے تھے۔ مگر یہ ان کا کرم تھا کہ جن چند مخلصین کو وہ اپنی آمد سے مطلع فرمایا کرتے تھے ان میں یہ خاکسار بھی تھا۔ اخیر میں شفقت بہت بڑھ گئی تھی۔ میرے خطوط میں اگر غیر معمولی وقفہ یا تاخیر ہو جاتی تو مولانا فکرمند ہو جاتے اور مجھے شرمندگی ہوتی۔ ۱۳ اگست ۱۹۷۱ء کے عنایت نامے میں فرماتے ہیں۔

"عزیزم! وعلیکم السلام

ایک عرصۂ دراز کے بعد خط ملا شروع میں مہینوں میں منتظر رہا کیا پھر یہ سمجھ کر چپ ہو گیا کہ کوئی قصور میری طرف سے ایسا ہوا ہوگا جو ادھر کی اس رنجش و بیزاری کا باعث بن گیا، اور کوئی بات قابل ذکر نہیں ....."

۳ اگست ۱۹۷۳ء کے شکایت نامے سے بھی مجھ کو شرمندگی اٹھانی پڑی اور آج بھی اس کا افسوس ہے کہ مولانا کو میری وجہ سے یہ کیوں لکھنا پڑا کہ "ملاقات تو خیر برسوں ہی سے ترک تھی اور میں سمجھ رہا تھا کہ مراسلت بھی اب اسی نوبت پر آگئی ہے۔ غنیمت اور بہت ہی غنیمت ہے کہ تازہ کیا۔ تم نے اس یاس کو امید میں تبدیل کر دیا، فالحمد للہ! دنیا کو اندازہ نہیں کہ مجھے اپنے کسی تعلق والے کو چھوٹنے سے کس درجہ صدمہ ہوتا ہے....." مولانا کے تعلق اور وضعداری کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انہی دنوں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے کسی جلسے میں شرکت کے لیے ندوہ آئے مگر میں نے ہجوم میں ملنا مناسب نہیں سمجھا اور بعد میں اپنے کسی خط میں اس کا ذکر کر دیا تو مولانا نے تحریر فرمایا کہ "اگر میری نظر آپ پر پڑ جاتی تو میں ضرور ملتا"۔

اس سلسلۂ مراسلت کا آخری خط جو میرے پاس محفوظ ہے وہ مولانا نے ۱۸ اپریل ۱۹۷۶ء کو تحریر فرمایا تھا جس میں خط کی شکستگی بہت بڑھ گئی تھی، اس کے بعد وہ مختلف عوارض فالج، اور پھر شکستگی کے شکار ہو گئے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی۔

۱۹۶۹ء میں میری پہلی کتاب "مسلم پرسنل لا" اور "اسلام کا عائلی نظام" شائع ہوئی تو مولانا نے ۳۰ جنوری ۱۹۷۰ء کے صدق "میں بڑا حوصلہ افزا تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا "مسلم پرسنل لا کا مسئلہ اخبارات میں کثرت سے نظر سے گزرا ہوگا۔ زیر نظر کتاب اس اہم موضوع پر ایک حد تک جامع و تحقیقی حیثیت رکھتی ہے۔ اتنی تفصیل اور اطراف و جوانب پر بحث شاید ہی کسی دوسری کتاب میں ملے اور کتاب کے ۴۴، ۵۰ بابوں کے اندر وہ سب کچھ آگیا جو آنے کے قابل تھا اور جس کا یکجائی مطالعہ کہیں اور آسان نہیں..... پھر بھی کتاب بحیثیت مجموعی ہر دین پسند تعلیم یافتہ کے پڑھنے کے قابل ہے۔" میرے ترجمہ "نقوش اقبال" کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن پر مولانا نے یہ اظہار خیال فرمایا تھا:

"مولانا علی میاں نے اقبال پر ایک کتاب روائع اقبال کے نام سے عربی میں لکھی تھی، اب یہ نظر ثانی اور اضافوں کے بعد اردو کے قالب میں ڈھل کر آگئی ہے جو ہر اقبال پسند کے دیکھنے کے قابل ہے۔ ترجمہ یا ترجمانی جو کچھ ہے سلیس و شگفتہ ہے۔"

(صدق ۱۸ ستمبر ۱۹۷۰ء)

"پہلے اڈیشن کا تعارف صدق میں نکل چکا ہے۔ نقش ثانی ہر معنی میں نقش ثانی ہے۔ نقش اول سے بہتر و پاکیزہ تر۔ ترجمہ بہت اچھا اور دو بابوں کا اضافہ مترجم کے قلم سے ایک اقبال اور قومیت، دوسرا عورت اقبال کے کلام میں۔ دونوں باب بڑے کام کے ہیں۔

(صدق ۲۹ دسمبر ۱۹۷۲ء)

اس کے بعد بھی میری جتنی کتابیں شائع ہوئیں مولانا نے ان پر اچھے ہی تبصرے لکھے۔ میری کتاب "صدر یار جنگ" (سوانح مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی) کے لیے مولانا نے اپنے تاثرات لکھ بھیجے تھے جو شامل کتاب ہیں اور کتاب کا نام بھی انھی کا رکھا ہوا ہے۔

مولانا علی میاں صاحب نے مولانا کی "تفسیر ماجدی" کے اہم مباحث سے عرب دنیا کو روشناس کرانے کے لیے اس کی تلخیص اور عربی ترجمہ کے متعلق لکھا تو مولانا نے تلخیص کے لیے میرا ہی نام تجویز کیا، میں نے یہ تلخیص تقریباً تین سو صفحات میں تیار کر دی اور اب اس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہونے والا ہے۔ مولانا کو اس کام سے بڑی مسرت تھی، مولانا علی میاں صاحب کو ۱۲ جولائی ۱۹۷۱ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں: "تفسیر کی عربی تلخیص کی تجویز حقیقۃً بڑی ہی عزت افزائی ہے، میں تو اس کا گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

مولانا سے چند ملاقاتیں جو یاد آرہی ہیں ان میں سے ایک ملاقات وہ ہے جو خاتون منزل (گولہ گنج) کے اس بالائی کمرے میں ہوئی تھی جس میں کبھی مولانا شبلی کا قیام رہ چکا تھا۔ مولانا شبلی کے قیام کا بہت اہمیت سے ذکر کیا، اسی ملاقات میں امت کے انتشار اور اختلاف سے اپنی بیزاری ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگ انتہا پسندی اور غلو کے عادی ہو گئے ہیں۔ خوش ہوں گے تو آدمی کو آسمان پر بٹھا دیں گے اور ناراض ہوں گے تو کہیں کا نہیں رکھیں گے۔ متکلمین اسلام کی خدمات کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے کارنامے بھلائے نہیں جا سکتے۔ صرف ان کی عقلیت میں مبالغے کے سبب ان کے تمام کاموں پر پانی پھیر دینا کہاں کا انصاف ہے؟ پھر امام رازیؒ کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ ان سے بھی ناخوش ہیں مگر کیا خدا کے یہاں ان کی عظیم خدمت قرآنی اور جذبۂ ایمانی سب رائیگاں چلا جائے گا؟ یہ کہہ کر مولانا کی آواز بھرا گئی اور بے اختیار ہو گئے۔ ایک اور ملاقات میں جو فالج سے صحت یابی کے بعد ہوئی اس میں میرے ایک دوست منور بشیر صاحب ایم۔ اے کے سوال کے جواب میں مولانا نے برجستہ طور پر قرآن مجید کے اچھے انگریزی مترجموں کے نام گنا دیئے اور ان کے ترجمے کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی جس سے ان کے علم و نظر اور حاضر دماغی پر ہم سب کو حیرت سی ہوئی۔

اپنے زہد و تقشف اور لیے دیئے ہوئے رہنے کے انداز سے وہ بقول شوکت تھانوی "زاہد خشک" معلوم ہوتے مگر قریب سے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت میں جوش و جذبہ اور سوز و گداز کا توازن موجود ہے اور دین و زندگی کے بارے میں وہ

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

تنویر اعظمی

پیشِ خُدا مُفسّرِ قرآں چلا گیا

(۱)

بیٹھی ہوئی ہے علم کی دنیا جھکائے سر
آلودہ گردِ تاجِ صحافت ہے خاک پر
عظمت کے آسماں پہ جو روشن تھا وہ قمر
چمکا کے بوستانِ دبستاں چلا گیا

(۲)

چلتا تھا کس ادا سے قلم جھوم جھوم کے
بخشے ورق ورق کو گلستاں نجوم کے
برسا دیئے زمیں پہ خزانے علوم کے
ابرِ کرم تھا جھاڑ کے داماں چلا گیا

(۳)

ساحل کو چوم لیتی تھی فکر و نظر کی موج
دیتی تھی ہر قدم پہ سلامی سپاہِ عوج
رہتی تھی گرد و پیش مضامینِ نو کی فوج
اُف میرامن محفلِ دوراں چلا گیا

(۴)

وہ راستیِ طبع کہ دشمن بھی باغ باغ
پھولوں سے علم و حلم کے مہکا ہوا دماغ
وہ لذتِ سخن کہ چھلکتا ہوا ایاغ
صہبا لُٹا کے پیرِ خمستاں چلا گیا

(۵)

فرمانِ حق قلم کی زباں سے بیاں کیے
قرآں کی آیتوں کے مقاصد عیاں کیے
سجدوں سے رخِ شباب مرضوفشاں کیے
پیشِ خدا مفسّرِ قرآں چلا گیا

(۶)

میزانِ اعتدال پہ رکھّے دل و جگر
ہر ہر قدم ادب سے جھکائے ہوئے نظر
طے کر کے تیز تیز سعادت کی رہ گزر
انسانیت اُداس ہے انساں چلا گیا

طاہر محسن علوی

مولانا عبدالماجد۔ سچی باتوں اور خطوط کے آئینے میں

اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگ جو پڑھے لکھے بھی ہوں اور نصیبے کے بھی اچھے ہوں کم سے کم اس سرزمین پر گنے چُنے ہی مل سکیں گے۔ مثلاً سر سید احمد خاں کو اُن کے ساتھ کام کرنے والے ایسے مل گئے جن سے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدے پہونچے اور اُن کے نام بھی اب تک بڑی عزت و احترام سے لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح منشی سجاد حسین کا کورکی ایڈیٹر اودھ پنچ بھی اُن خوش بختوں میں سے ہیں جن کو جوالا پرشاد برقؔ۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ رتن ناتھ سرشار۔ منشی احمد علی شوقؔ اور چکبست جیسے نورتن ہاتھ آئے جن کی وجہ سے زبان و ادب کی رہتی دنیا میں اُن کے کارنامے زباں زد رہیں گے۔ بالکل یہی مثال اُردو زبان میں میٹھی میٹھی چٹکیاں لینے والے ہمارے مولانا عبدالماجد دریابادی کی بھی ہے۔ ان کا نام نامی بھی اُسی فہرست میں آتا ہے جو نیک بخت۔ بانصیب تھے۔ مولانا مرحوم کے معاونین بھی بڑی لگن اور خلوص کے تھے۔ مثلاً مولوی مناظر احسن گیلانی۔ سید سلیمان ندوی۔ منشی محفوظ علی بدایونی۔ مولوی ظفر الملک اور ایک ملحد کو کھرا مسلمان بنانے والے مولانا محمد علی جوہر مرحوم۔ یہ سب مشرق زدہ تھے۔ بے لوث خدمت گزار قوم و ملک۔ لالچ۔ خود غرضی اور خود ستائی ان سے دور رہتی تھی۔ غرض بہت ناپ تول کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بزرگ اپنی دُھن کے پکے۔ بے لوث اور پُرخلوص خدمت گزار تھے، وہ آج کل کے دانشوروں سے بالکل مختلف۔

ہمارے محترم بھائی مولانا دریابادی مرحوم کو کن کن اداروں نے ان کی سوجھ بوجھ اور قابلیت کو دیکھ کر اپنا بنانے کی کوشش نہیں کی لیکن ان کی طبیعت نے ہمیشہ گریز پائی اختیار کی اور الگ ہونے کے باعث سب کے ساتھ رہ کر مخلصانہ اور بے ریا خدمت کو اپنا شعار بنایا۔

اس بے سواد کو ان کی تحریریں بے حد پسند تھیں۔ اور خاص کر "سچی باتیں"۔ لیجیے ۲ نومبر ۱۹۴۳ء کے صدق جدید کی "سچی باتوں" سے لطف اُٹھایئے اور سبق بھی حاصل کیجیے۔

"نان بائی کی دُکان پر بیٹھ کر روٹی کھانا یقیناً آپ اپنی شان و مرتبے کے خلاف سمجھیں گے، لیکن اسی نان بائی کی دُکان کو کوئی اگر ایک سکنڈ ہینڈ میز اور دو تین کرسیوں سے مزین کر دے، تو وہی دکان ہوٹل بن جائے گی، اور آج کل شہر کے گلی کوچے ایسے ہوٹلوں سے پٹے پڑے ہیں۔ اور ہوٹل میں کھانا خلاف شان کیا عین داخلِ فیشن ہے!

"گاڑی بان" بیچارے کی کوئی حیثیت، عزت ہوتی ہے لیکن اگر کسی موٹربان (شوفر) اور بس وان (ڈرائیور) سے ذرا تحقیر سے بول دیکھیے، تو وہ آپ کی جان کو آ کر رہے۔ ڈھپالی بیچارہ اپنی پھٹی پھٹائی ڈفلی لیے ہوئے اور بدستور ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے، لیکن ماڈرن طبلیے سرنگیے (VIOLIONIST) کے فوٹو تو بڑے سے بڑے انگریزی روزناموں میں چھپتے رہتے ہیں ——

بھانڈ بیچارہ اپنے نصیبوں کو رو رہا ہے، برسوں سے کس مپرسی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ ایکٹر اور فلم ایکٹر دولت میں لوٹیں لگا رہا ہے۔ شہرت اور اعزاز حاصل کر رہا ہے۔ سرکاری خطابات پا رہا ہے۔"

دوسری قسط سچی باتوں کی ۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کے "سچ" اور ۱۰ مارچ ۱۹۵۰ء کے "صدق جدید" سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"کسی بے گناہ کو سزا سے نجات دلانا، بزرگوں اور درویشوں کا کام تھا۔ بادشاہ اور حاکم کے سامنے کسی کے حق میں کلمۂ خیر

کہ کر اسے اس کے حقوق دلا دینا" اہل اللہ کا مشغلہ تھا۔ آج آپ سب سے بڑا بیرسٹر یا سب سے بڑا وکیل کس کو قرار دیتے ہیں؟ اُسے نہیں جو قانون کا سب سے بڑا ماہر ہے، اُسے بھی نہیں جو مقدمات کی پیروی میں سب سے زیادہ غور و مشقت کرتا ہے۔ بلکہ اُسے جس کی پریکٹس سب سے اعلیٰ ہے، جو فیس سب سے زیادہ لیتا ہے! ـــــ آپ طبیب صاحب ہوں یا ڈاکٹر، وکیل صاحب ہوں یا بیرسٹر، سب کی بڑائی اور عظمت کا سب کی شہرت و ناموری کا، سب کے کمالِ فن اور اعزاز کا معیار بس یہ رہ گیا ہے کہ کس میں جلبِ زر کا سلیقہ زائد ہے، کس کی فیس اونچی ہے، کون کما تا سب سے بڑھ کر ہے ـــــ

کہتے ہیں کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ۔ جیسا راجا ویسا پرجا۔ جیسا بادشاہ ویسی رعایا۔ تاجر قوم کے تسلط کا اثر زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ایک ایک گوشہ میں نمایاں ہے۔ ڈکانداری ہماری رگ رگ ریشہ ریشہ میں حلول کر گئی ہے اور ہر کمال اور ہر عزت، ہر عظمت کا معیار بن کر رہی ہے۔ تنہا طبابت و وکالت ہی پر موقوف نہیں، جس طرف بھی آنکھ اٹھایئے یہی سماں نظر آئے گا۔ سب سے بڑے عالمِ دین آج کون سمجھے جاتے ہیں؟ وہ جو بڑی اونچی اونچی محفلوں میں پوچھے جاتے ہیں۔ سب سے بڑے مشائخ و درویش کون تصور کیے جاتے ہیں؟ وہ جن کے مرید اور معتقد فلاں نواب صاحب، فلاں راجا صاحب، فلاں خان بہادر صاحب ہیں! اقبالؔ نے بھی اسلام اور شارعِ اسلام کی شان یہ بتائی تھی کہ

از کلید دیں در دنیا کشاد!

اُمت نے اسی ترتیب کو اُلٹ دیا۔ اب ہمارے یہاں اگر دین کا دروازہ بھی کھل سکتا ہے تو اسی دنیا کی کنجی سے! چیک بُک کی حکومت دلوں پر اور دماغوں پر، آنکھوں پر، کانوں پر، ہاتھوں پر اور زبانوں پر ہے۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس طرزِ غلامی کا ذہنی اور عقلی، مادی اور حسی غلامی کا خاتمہ کب اور کیونکر ہوگا؟

ہم لوگوں کے لیے کیسی کیسی نصیحتیں اس عاقل و فرزانے نے کیں، اور کس کس طرح چٹکیاں لے لے کر ہم سوتوں کو جگانے کی تدبیریں اور ترکیبیں سجھائی ہیں۔

آج کل کے دانشور دیکھیں کہ اُن پر مغربیت کس بُری طرح سوار ہے یا ان کے بدن۔ دل و دماغ اور رہن سہن اور رفتار و گفتار پر مغربی ہواؤں نے کس طرح رسوخ اور نفوذ کیا ہے۔ کیا یہ نصائح یا نصیحتیں اور ذہنی اُلٹ پلٹ کسی پڑھے لکھے مشرق زدہ کو مضطرب اور بے چین کرنے کے لیے کافی نہیں۔ ہم کو بالآخر کہنا پڑتا ہے کہ یہی مغربیت کے داؤں پیچ ہمارے محترم و معظم مدیرِ سچ کو فکرمند کیے رہتے اور درد مند دل اپنی چشم خون آلود سے آنسو گرانے پر مجبور ہو جاتا۔ حدیث اور تفسیر وغیرہ پر کچھ بولنے یا لکھنے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں۔ برادرِ معظم و مفضل جناب مولانا عبدالماجد مرحوم و مغفور دریابادی کا روحانی فیض سمجھنا چاہیے کہ اُن کی تفسیر کے مطالعے کی سعادت اس بدنصیب کو حاصل ہوئی (سورۃ آلِ عمران کے رکوع ۱۰ میں) یہ آیت نظر نواز ہوئی "اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا" ترجمہ: "سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لیے وضع کیا گیا وہ وہ ہے جو مکہ میں ہے سب کے لیے برکت والا"۔ جو لفظ آنکھوں میں کھٹکا وہ مکہ ہے۔ ترجمان القرآن مولانا آزاد کی ورق گردانی کی۔ اس کی تحقیق میں وہ چپ ہیں۔ سیرۃ النبی جلد ۵ کے صفحہ ۲۵۲ پر اس کی تشریح یوں کی گئی ہے۔ "مکہ" قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے، جس کے اصلی معنی "گھر" کے ہیں۔ مکہ کا بکہ نام حضرت داؤدؑ کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے۔" قدیم شامی زبان میں "بک" کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں۔ جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام "بعلبک" ہے۔ یعنی بعل کا شہر۔ (بعل ایک دیوتا کا نام ہے) کعبے کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے۔ کعبے کے معنی "چوکھونٹے" کے ہیں۔ چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہے اس لئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور رہا۔ اس جگہ صاحبِ سیرۃ النبی کی تحقیق متعلق مکہ اور بکہ سے معلومات حاصل کرنا ہیں۔ مذکورہ بالا تحقیق کا باب بند ہو گیا اب انصاف کریں کہ مرحوم و مغفور بھائی صاحب تفسیر ماجدی علیہ الرحمۃ نے اپنی تفسیر مطبوعہ تاج کمپنی لیمیٹڈ قرآن منزل۔ لاہور۔ کے صفحہ ۱۴۱ پر مذکورہ بالا آیت کی تشریح اور توضیح میں تفسیر لکھنے کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:" (بہ طور قبلہ کے) کعبہ کو سب سے پہلا معبد بنا کر یہود کو یہ بھی جتلا دیا گیا کہ کعبہ تو بیت المقدس سے بھی قدیم تر ہے۔ بَکَّۃَ۔ مکہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ عربی میں ایک قاعدہ ہے

جس سے حرف مَ (میم) اور حرف بَ میں اکثر تبادلہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً لازم اور لازب میں یا راتم اور راتب میں یا نبیط اور نبیط میں۔ اسی قاعدے کا عمل یہاں بھی ہوا۔ ھِیَ عَلَمٌ لِلبَلَدِ الْحَرَامِ وَ مَكَّةَ وَ بَكَّةَ لغتان فیہ (کشاف) (روح۔ قرطبی) وغیرہ وغیرہ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مَکّہ نام ہے کل شہر کا اور بَکّہ کا اطلاق مسجد حرام اور مطاف پر۔ بَكَّةَ هُوَ مَوْضِعُ الْمَسْجِدِ (ابن عباسؓ) بَكَّةَ مَوْضِعُ الْبَيْتِ وَ مَكَّةَ مَا سِوَىٰ ذٰلِكَ۔ (ابن جریر۔ عن ابن مالک) وغیرہ وغیرہ۔ بائبل میں بھی ایک جگہ ذکر وادیٔ مکہ کا تحریفات کے باوجود رہ گیا ہے۔" وہ بکا کی وادی میں گزر کرتے ہوئے اُسے ایک کنواں بناتے ہیں" (زبور۔ ۸۴ : ۶) بائبل کے قدیم مترجمین نے اپنی تحریف کی عادت مستمرہ کے مطابق ترجموں میں اُسے بجائے عَلَم کے اسم نکرہ قرار دیکر اس کا ترجمہ رونے کی وادی کر ڈالا۔ صدیوں کے بعد اب اس غلطی کا احساس ہوا اور اب جیوش انسائیکلو پیڈیا میں اقرار ہے ؛

مفسر مرحوم کی تحقیق سے ایک معمولی سا ابجد خواں بھی کچھ نہ کچھ تو استفادہ کر ہی سکتا ہے۔

پرانی بات ہے خیال پڑتا ہے خانۂ کعبہ کی ترکیب پر اس حقیر وکم سواد نے صاحب تفسیر ماجدی مرحوم کو ایک بار لکھا تھا۔ کہ جناب والا نے کعبۃ اللہ کے ذکر میں خانۂ کعبہ کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو تفسیر ماجدی ص ۱۲۶ ۔ بَیْت سے یہاں مراد خانۂ کعبہ ہے۔ اسی طرح سیرۃ النبی اور قریب قریب عربی داں طبقہ کعبۃ اللہ کی جگہ خانۂ کعبہ لکھتا اور بولتا ہے؟ کعبے کے معنی چوکور یا چوکھنٹے کے ہیں۔ انوار اللغات میں "کعبہ" کے معنی لکھے ہیں۔ "کعبہ۔ (ع) لغوی معنی مُرتفع۔ بلند۔ کعبہ کی بنا سطح زمین سے مُرتفع ہے یا از روے مراتب کعبہ رفیع اور عظیم الشان مکان ہے۔ تکعیب عربی میں مُربع کرنا۔ اس لیے کعبہ نام ہوا۔ مذکر قبلہ۔ بیت اللہ۔ وہ مربع عمارت جو مکہ میں ہے۔ حضرت امیر مینائی نے اپنے مکتوبات میں خانۂ کعبہ کی ترکیب کو غلط بتایا۔ مبدل کے ساتھ مبدل منہ کا ہونا ضروری ہے اور یہاں صرف بدل ہی پایا جاتا ہے۔ بیت اللہ اور کعبۃ اللہ میں بدل مبدل منہ ٹھیک ہے لیکن خانہ بمعنی گھر اور کعبہ بھی قبلہ کہیے یا اللہ کا گھر دونوں ایک ہی ہیں ہاں خانۂ خدا کہیے تو صحیح ہو۔

صرف ایک صورت اس کے جواز کی ہو سکتی ہے اور وہ ہے غلط العام فصیح کی دلیل۔ اس کا جواب بھی اس حقیر کی تائید میں تھا لیکن کاغذات کے اِدھر اُدھر رکھنے اُٹھانے میں اس طرح کے بہت سے قیمتی کاغذ اس وقت نہیں مل رہے ہیں جس کا بے انتہا افسوس ہے۔

یہ تو یاد نہیں آتا کہ کب کب مولانا مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ کچھ صحائف گرامی موجود ہیں اور کچھ کاغذات کے اِدھر اُدھر کرنے میں ضائع تو نہیں لیکن اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اُن کے کچھ حوالے یہاں دوں گا۔ تاریخ اور سنہ بیشک یاد نہیں ہے۔

سنہ و مہینہ اور تاریخ بالکل ذہن سے اُتر اہوا ہے لیکن اس قدر محفوظ ہے کہ اخبار" قومی آواز" میں غالباً" گلوریوں ہی میں سچی باتیں" کے عنوان سے یہ پڑھنے میں آیا کہ فلاں اصحاب کو خلعتوں پر خلعتیں مل رہی ہیں۔ یہ خط کشیدہ لفظ مجھ کو کھٹکے۔ دو ایک دن تو اس کی تحقیق میں صرف ہوئے کیونکہ بے سوچے سمجھے اور بغیر چھان بین کیے ایک اتنی بڑی شخصیت پر حرف لگا دینا اپنی کم سوادی، نا اہلی اور جاہلیت کے سوا کچھ بھی تو نہ تھا۔ جب اپنے نزدیک ہر طرح کا اطمینان کر لیا تب اس نامۂ سیاہ نے ڈرتے ڈرتے قلم اُٹھایا اور یہ عرض کیا کہ قومی آواز میں آپ کی تحریر دیکھ کر مسرت ہوئی لیکن ایک بات دماغ میں نہیں آسکی کہ جناب والا نے خلعت کو مونث لکھ دیا ہے۔ پہلے تو یہی سمجھا کہ غالباً یہ اصلاح کاتب ہے لیکن جب خلعتیں نظر آئیں تو ذہن گمراہی کی طرف گیا۔ یہ بے پڑھا لکھا کئی برس سے نور اللغات کی افادیت کا خیال کر کے اس میں اضافے اور ترمیم مع اسناد کرنے میں مصروف ہے اور اپنی تحقیق جو بھی ہے فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات وغیرہ سے یہ محقق ہو چکا ہے کہ لفظ خلعت مذکر ہے نہ کہ مونث۔ خلعت کے آخر میں لگی ہوئی تے سے شاید تانیث کا پہلو اختیار کیا گیا۔ میری بیاض ذہنی میں ایک محقق کا یہ شعر خلعت کے مذکر ہونے کا ثبوت ہے۔

خلعت جو دھوپ چھاؤں کا پایا تھا خواب میں
راتیں ملیں فراق کی دن انتظار کے

اگر آپ کے نزدیک یہ مونث ہے تو مطلع فرمائیں اور سند بھی لکھیں تاکہ لغت میں اصلاح کر دی جاے۔ کارڈ لکھ کر ڈرتے ڈرتے حوالۂ ڈاک

کر دیا۔ انتظار جواب میں کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینہ بیت گیا۔ اسی درمیان میں لکھنؤ جانا ہوا۔ تذکرتاً ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی سے اس کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر موصوف نے کہا کہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی یہاں آئے تھے اور چند لغات کے دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔ غرض اس ناچیز کی لکھنؤ سے واپسی پر حضرت مولانا مرحوم کی تحریر آ گئی۔ وہ تحریر افسوس ہے کہ اپنی بد نصیبی سے کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی مگر اتنا جملہ ذہن میں اب تک اس لیے محفوظ رہ گیا کہ وہ گرانقدر اور بے خوف و خطر اپنی غلطی یا سہو کو ماننے والے بزرگ اور دانشور کے قلم سے اس جاہل اور حقیر کی عزت افزائی کر رہا تھا وہ جملہ یہ تھا "کہ تحقیق کے بعد غلعت بیشک مذکر ہے اور بھائی آپ جیتے میں ہارا۔" یہاں یہ بھی گزارش ہے کہ ہمارے لائق و فائق محترم مرحوم کے اس لکھنے سے خوش فہمی نہیں ہوئی بلکہ اور ان کی عزت دل میں زیادہ ہو گئی۔ ادب ہو یا تحقیق، اس میں کسی بڑے سے بڑے ادیب کا یہ خوش فہمی کا دعویٰ کہ جو اُس نے لکھ دیا وہ حرف آخر ہے، کچھ جچتی ہوئی بات نہیں ہے۔

اگر یہ ناچیز اسی بیان پر فخر کرے کہ حضرت عبدالماجد دریابادی سے یہ پہلی نصف ملاقات تھی جس میں موصوف نے خلعت عنایت فرمایا تو بے جا نہیں ہے۔

۱۹۶۸ء میں حسان الہند مُلا محسن کاکوروی کی یاد میں یوم محسن منایا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت مرحوم دریابادی کو دعوت نامہ ورسال کیا اور اُسی کے ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ ملا محسن پر ایک مقالہ بھی آپ کا ضروری ہے۔ اُس کا جواب ۲ر اپریل ۱۹۶۸ء کو ملا جس میں تحریر فرمایا "برادرم۔ السلام علیکم۔ یوم تو اب ہر کس و ناکس کا منایا جانے لگا ہے محسن مرحوم تو خیر بڑی چیز تھے۔ ضمناً اُس میں ذکر صاحب نور اللغات کا بھی آجانا چاہیے۔ کسی عملی خدمت سے معذور ہوں۔ ٹھیک تاریخ جلسہ معلوم ہونے پر "پیام" عرض کروں گا انشاء اللہ۔ والسلام۔ دعاگو و دعا خواہ۔ عبد الماجد۔" دو مہینے کے بعد یوم محسن پر ایک پیام، مانے ہوئے نقاد، صاحب طرز انشا پرداز ہمارے مولانا عبدالماجد دریابادی کا آیا، جو ہدیہ ناظرین ہے۔ "اُردو والے قابل مبارکباد ہیں کہ مدتوں کے تغافل کے بعد اب اُنھیں محسن کی یاد آئی اور اگر آداب محفل کے منافی نہ ہو تو اس محسن کے ساتھ اُس محسن زادے کی یاد میں بھی ایک حرف کہتا چلوں، جس کا لغت "نور اللغات" اس وقت تک کے چھپے ہوئے اُردو لغات میں مکمل اور سب سے زیادہ جامع و مستند ہے۔ یہ روشنی پھیلائی ہوئی اُسی کے دم کی ہے۔" ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ فاضل اور صاحب طرز منشی نے ملا محسن کے پرستاروں کو کیسی چابک قلمی سے چند پند کے پیرایے میں للکارا ہے اور اپنے اسلوب نگارش سے کس طرح اُن کے حوصلے کو سراہا ہے۔

غالباً دسمبر ۷۱ء کی کسی تاریخ میں اس حقیر کم مایہ نے برادر معظم و مفضل کو ایک عریضہ ارسال کیا جس میں لفظ بربریت کی بابت دریافت کیا تھا کہ یہ کہاں سے آیا؟ اُس کا جواب موصوف نے ۳ر جنوری ۷۲ء کو دیا۔

" برادرم۔ السلام علیکم۔ کاغذات کی اُلٹ پلٹ میں آپ کے کرم نامہ مورخہ ۵ر دسمبر پر نظر پڑ گئی۔ حیران رہا کہ اب تک یہ کیسے نظر سے غائب رہا۔ بہرحال اس سہو نظر پر دل سے معافی چاہتا ہوں۔ "بربریت" یہ انگریزی لفظ BARBARIAN سے اردو میں آیا ہے، انگریزی میں اس کے معنی، نیم وحشی، نیم جنگلی اور غیر مہذب کے ہیں۔ انگریزی سے مورد ہے اور اب اردو کا جزو بن گیا ہے۔ قرآنی رسم خط سے متعلق جو سوال ہے اُسے صدق میں دے رہا ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ ہفتہ وہ دفتر سے پہنچے گا۔ اور آئندہ نمبران میں جوابات آئیں گے۔ والسلام۔ دعاگو۔ عبدالماجد"

اس نامہ سیاہ نے ان کی مذکورہ بالا تحقیق سے اختلاف کیا اور یہ عرض کیا کہ یہ عربی کا لفظ ہے۔ انگریزی لغات تو عربی ماخذات سے نابلد ہیں اور اس کے ثبوت میں کئی مثالیں بھی پیش کیں۔ میری اس تحریر کا کوئی جواب تو نہیں آیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب وہ لکھنؤ آئے اور ملاقات ہوئی تو موصوف نے میری ہرزہ سرائی کی داد دی اور حوصلہ بڑھایا۔

۱۰ر تاریخ اور ۲۸، ۱۹۷ء تو پڑھا جاتا ہے۔ مہینہ ایسے لکھ دیا ہے کہ مکتوب الیہ مرحوم بھی اگر زندہ ہوتے تو وہ بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ موصوف نے خود کئی جگہ صدق میں اپنے تحریری حروف کی شکل و صورت کے بگڑنے کا اقبال کیا ہے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ ڈاک خانے کی مہریں بھی صاف نہیں ہیں، جن سے مہینے کا پتا لگایا جا سکتا۔ تحریر ملاحظہ ہو۔

"برادر سلمہ اللہ - وعلیکم السلام - عربی لغات کو اپنی بساط کے اندر کھنگالنے سے پتا چلا کہ "سُندُس" کے مُعَرَّب ہونے پر سب کا اتفاق ہے یعنی سب ہی نے یہ لکھا ہے کہ عربی میں یہ لفظ باہر سے آیا ہے - لیکن یہ بہت کم کسی نے لکھا ہے کہ آیا کہاں سے ہے' یعنی کس زمانے میں اور کس زبان سے آیا ہے - کسی نے ہندستان کو لکھا ہے' اور کسی نے ایسے ہی گول چھوڑ دیا ہے' معنی سب نے باریک ریشم کے لکھے ہیں - عربی لغت نویس کو ماخذ کی طرف جانا ضروری تھا بھی نہیں - افسوس ہے کہ اکاڈمی والوں نے نور اللغات کا مسئلہ بیچ ادھر میں چھوڑ دیا ہے - خیال یہ ہے کہ اس میں صدر صاحب مُخل ہو رہے ہیں - والسلام -
دعا گو - عبدالماجد :

والا نامے کے سیاق و سباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاکسار نے سندس کے لفظ کی تحقیق کے بارے میں عرض کیا ہوگا - اسی وجہ سے مرحوم محترم و معظم نے بجائے السلام علیکم کے وعلیکم السلام لکھا - پھر اس محقق نے ان کو عریضہ ارسال کیا جس میں اپنی حقیر دریافت سندس کے بارے میں لکھی - اور یہ بھی گزارش کی کہ یہ لفظ خالص ہندی ہے جس کی صورت بدلتے بدلتے عرب جا کر سندس ہو گئی -

۱۰ر مئی ۷۶، ۱۹ء کا مکرمت نامہ ہے - "برادرم سلمہ اللہ - وعلیکم السلام - زندہ ہوں اور بہر حال زندگی کی مدت موعود پوری کر رہا ہوں - والسلام - عبدالماجد :

اس والا نامے سے بھی یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ فرشتہ صفت ہستی کو اس ظاہر نے اُن کی بیماری کے بارے میں کوئی عریضہ ارسال کیا تھا جس کا جواب دیا گیا - اسی گرامی نامے میں نور اللغات کے نظاہر نہ چھپنے کے اسباب پر اردو اکاڈمی اور ایک ڈاکٹر صاحب کے سیدھے سادے ہونے کا ذکر بھی کیا ہے - جس کا نقل کرنا یہاں بیکار ہے - ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اس کے بعد تو بیماری کا سلسلہ لامتناہی چل پڑا - اور مولانا مرحوم دریاباد کو لکھنؤ سے آ گیا - کئی بار یہ ناکارہ ان کی خدمت میں عیادت کے واسطے حاضر ہوا - اور دیدار کر کے واپس آ گیا - دسمبر ۷۶ء کے آخر میں خود بھی بستر علالت پر تھا کہ اخبار سے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کے مرحوم ہونے کی خبر نے بدحواس کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ان کا دنیا سے کوچ بڑے نازک وقت پر ہوا - وہ علم و عمل کا مشرقی سرمایہ تھے جو موت کے ڈاکوؤں نے ہم سے زبردستی چھین لیا - وہ فرشتہ تو نہیں تھے مگر فرشتہ خصال ضرور تھے - اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن - ثاقب لکھنوی کے شعر میں ذرا سی ترمیم حسب حال ہو گی کہ

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ تمھیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

سدا رہے نام اللہ کا - ہم سب کو ایک نہ ایک دن وہیں جانا ہے - جہاں ہمارے پیشرو گئے -

---

مولانا عبدالماجد دریابادی - تاثرات و ملاحظات — بقیہ صفحہ ۲۲

ایک معتدل نقطۂ نظر رکھتے ہیں، ان سے ملنے والا محسوس کر سکتا تھا کہ وہ بیک وقت شبلی کے علم و ادب، اکبر کی مشرقیت، محمد علی کی ملی غیر دینی حمیت، مولانا تھانوی کی روحانیت، سید سلیمان ندوی کی جامعیت اور مناظر احسن گیلانی کے علم و اسلامیت سے مستفیض ہو رہا ہے۔

وہ غزالی کی طرح "پیچ و تاب رازی" کے راستوں سے ہو کر "سوز و ساز رومی" تک پہونچے تھے۔ اس لیے ان کی ذات میں مذہب و عقلیت، دین و دانش، اور علم و ایمان کا خوشگوار اجتماع ہو گیا تھا۔ وہ مشرقی و اسلامی تمدن کا ایک ایسا نمونہ تھے جس میں عقل و وجدان میں ہم آہنگی تھی، فلسفیانہ تدبر و تفکر کے ساتھ مذہب کی حقیقت پسندی اور اقدار و اخلاق کی پابندی جمع تھی، وہ ایک مجتہدانہ ذوق اور زندگی کے بہت سے مسائل میں اپنی خاص رائے رکھتے تھے، ان کی مشرقیت بھی دلائل و براہین پر مبنی تھی اور ان کی اسلامیت بھی علم و تلاش حق کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے غزالی و ابن رشد اور ابن تیمیہ کی طرح اس برصغیر کو ایک بار پھر اپنی عملی مثال سے یہ دکھا دیا کہ مذہب و عقل میں کوئی تضاد نہیں اور علم کے راستے سے مذہب و روحانیت کی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے اور مادیت و مغربیت کی شب تاریک میں ایمان و یقین کا نور ہی قندیل رہبانی ثابت ہو سکتا ہے۔

تسنیم فاروقی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی یاد میں

چپہ چپہ پہ اس کی شخصیت
اک گھنیرے درخت کی مانند دور تک چھاؤں بن کے پھیل گئی
اُن گنت راہرو تھکے ماندے
اس کے سائے میں آکے بیٹھ گئے
"اس کی تحریر اس کے خط کا جمال
اس کا ہر رنگ میں شکوہِ خیال"
اس نے کتنے دماغ والوں کو
نقد و تحقیق کا شعور دیا
زندگی اعتبار کرتی تھی
اس سے تہذیب پیار کرتی تھی

ایک چشمہ تھا جس کی لہروں نے
کھوج کی سنگلاخ دھرتی پر
زیبِ تخلیق کیاری کیاری کی
عمر بھر اس نے آبیاری کی
وہ کہ تھا روشنی کا مینارہ
وہ مفسر کتابِ نور کا تھا

ایک عالم تھا اک مدبر تھا
اس کے افکار کی کمندوں میں
تھی وہ تاثیر جیسے کرنوں سے چڑھتا سورج لپیٹ لیتا ہے
وادیوں کی تمام رعنائی

فکر گاہوں میں ہے اُداس اُداس
کلکِ فن کو ہے روشنائی کی پیاس
چھن گیا اس کی انگلیوں کا لمس
جس کا وہ پاسباں رہا برسوں وہ قلم اس کے انتظار میں ہے

اس کا کردار ایک مشعل تھا
اس کے فن کی حرارتیں لے کر
جانے کتنے چراغ جل اُٹھے
وقت اس کے سحر میں گم تھا

تختۂ کائناتِ علم و ادب
اس نے اپنے قلم سے ناپ دیا

جمیل مہدی

مولانا عبدالماجد دریا بادی

مولانا عبدالماجد دریا بادی، ہندستانی مسلمانوں کی اس دیوزاد نسل کے ایک فرد تھے جو ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں سیاسی اور مذہبی افق پر نمودار ہوئی تھی، مولانا محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، نذرالاسلام محمد علی جناح، شبلی نعمانی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، وغیرہ اس نسل کی پہلی صف میں تھے اور مولانا حسرت موہانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری، سید حبیب، مولانا کرم علی، ڈاکٹر سید حسین، بیرسٹر آصف علی، ڈاکٹر اشرف، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دوسرے لوگ اس کی دوسری صف میں۔

یہ وہ دور تھا کہ سیاست کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مذاہب کو مدد کے لیے باہر نکلنا پڑا تھا اور خالص سیاست اور خالص مذہب کے حلقے متعین نہیں ہوئے تھے، یہ حلقے تو خیر ابھی تک مقرر اور متعین نہیں ہو سکے تاہم اس زمانے میں، جو کہ تحریک حریت کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا، مذاہب کی بنیاد پر سیاست کا قالب تیار کرنے کی ایک ایسی تحریک نمودار ہوئی تھی جس نے ہندو اور مسلمانوں میں جوش و خروش کا ایک ایسا طوفان پیدا کر دیا تھا جس کی مثال پھر ابھی تک دکھائی نہ دے سکی۔

خلافت تحریک، جو اپنی نوعیت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے ایک مذہبی تحریک تھی، ہندستان میں، اسلامی اور ہندو مذہب کی نشاۃ ثانیہ کا سرچشمہ کہی جا سکتی ہے، اسی تحریک کی ہم نوائی اور معاونت کے علم بردار بن کر گاندھی جی نے ہندستان کی قومی سیاست میں وہ اہمیت اور عظمت حاصل کی جس کی بدولت وہ ہندستان کی تحریک آزادی کی سب سے بڑی علامت اور نشان بن گئے۔ اس نظریہ کی وضاحت مطلوب ہو تو مولانا ابوالکلام کا وہ عظیم الشان بیان اسیری دیکھنا چاہیے جو انھوں نے تحریک عدم تعاون کے شباب کے زمانے میں کلکتہ کی عدالت میں پڑھا تھا اور جسے گاندھی جی نے

" THE GREATEST STATEMENT EVER -DELIVERED

(اب تک دیے گئے بیانات میں عظیم ترین بیان)

قرار دیا تھا، اسی بیان میں مولانا آزاد نے کہا تھا۔

ہندوؤں میں مذہب کے احیاء جدید کا جو نعرہ گاندھی جی نے سنہ ۱۹۲۲ء میں بلند کیا ہے، الہلال اس سے سنہ ۱۹۱۲ء میں فارغ ہو چکا تھا۔

مذاہب کے احیاء جدید کا یہ رجحان جس نے 'سوامی شردھانند، گاندھی جی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، بیرسٹر مظہر الحق، خواجہ حسن نظامی، اکبر الہ آبادی اور مولانا ظفر علی خاں جیسے زبردست عبقریوں کی رہنمائی میں بے مثال جوش و خروش کی ایک تاریخی لہر پیدا کر دی، سیاست اور تحریک آزادی میں ایک ایسی قوت کے نمودار ہونے کا سبب بنا جس نے غیر ملکی حکومت کے خلاف

سیاسی جدو جہد کو ایک مذہبی فرض کے بطور عوامی سطح پر قابل قبول بنادیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، اس رجحان کے سب سے بڑے علم بردار کے روپ میں پورے ساٹھ برس تک صحافت، ادب اور تصنیف و تالیف کے میدان میں کھڑے رہے اور یہ اتنی بڑی مدت ہے جو ان کے کسی پیشرو اور ہم عصر کو حاصل نہ ہو سکی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے شعوری ارتقا، اور دہریت سے مذہب کی طرف واپسی کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، خود مولانا اپنی تحریروں کے ذریعہ اس تبدیلی کو زبردست واقعہ کی صورت میں پیش کرتے رہے، مولانا کی زندگی میں اور ان کے مدح خوانوں اور ناقدوں نے اس ذہنی تبدیلی کو اپنی نگارشات اور خیال آرائیوں کا موضوع بنایا ہے۔ کئی لوگ تو اس حد تک چلے گئے ہیں کہ انھوں نے اس ذہنی تبدیلی کے عوامل اور اثرات کو امام غزالیؒ کے قلب و ذہن پر گزرنے والی تبدیلی کے مشابہ قرار دیا ہے، تاہم مولانا دریابادی کے کام اور کارناموں کے سلسلے میں اس تبدیلی کی اہمیت میری نظر میں بہت زیادہ نہیں ہے، مولانا عبدالماجد جو کچھ بھی تھے، جو کچھ بھی وہ بنے، جن عناصر اور جن رنگوں سے ان کا وہ کردار بنا جو صحافت اور تصنیفی شعبوں میں لازوال رہے گا وہ سب کا سب اس ذہنی تبدیلی کے بعد ہی تعمیر ہوا، اگر مولانا دریابادی محض ایک فلسفی، برکلے کی تحریروں کے مترجم اور دہریت کے علم بردار بنے رہتے تو ان کی وہ شخصیت ہرگز نہ بن پاتی جو سچ اور صدق جدید کے مدیر اور محمد علی کی ڈائری اور تفسیر ماجدی کے مصنف کی حیثیت سے بنی، اور جس نے انھیں ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک مایۂ ناز اور تاریخی اہمیت رکھنے والا انشا پرداز بنایا۔

جہاں تک ذہنی واردات کا تعلق ہے، ہندستان کی بڑی شخصیتوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے ذہنی سفر میں نظریاتی تبدیلیوں نے فیصلہ کن اثرات چھوڑے ہیں، خود گاندھی جی نے تلاش حق میں جو ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے، اس طرح کی ذہنی تبدیلی کی طرف اشارہ کیا ہے بلکہ تفصیل کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے جس نے بالآخر انہیں مسٹر گاندھی کے بجائے مہاتما گاندھی بننے کے تمام خصائص مہیا کیے، خود مولانا آزاد تک جو ہندستانی مسلمانوں میں مذہب کے احیاء جدید اور مذہبی رنگ کے غلبہ کے ساتھ قومی سیاست میں زبردست قوت پیدا کرنے کے سب سے بڑے علم بردار ہیں، اس ذہنی تبدیلی کی واردات سے گزرے ہیں، انھوں نے اپنی نجی زندگی کی سربستہ تہوں کو کھولنے اور تفصیل کے ساتھ عام لوگوں کو اپنے ماضی میں جھانکنے کی دعوت دینے سے ہمیشہ گریز کیا اور اس سلسلے میں وہ اتنے محتاط رہے کہ زندگی بھر اور اس کے بعد بھی پراسراریت کا مخصوص ہالہ انکی شخصیت کے گرد قائم رہا، تاہم وہ بھی اس ذہنی کشمکش، نظریاتی سفر اور تقلب ماہیت کا اعتراف اتنے طاقت ور الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں کہ

"میں عقائد میں شرک کی اور اعمال میں فسق کی حدود تک پہنچ کر واپس لوٹا ہوں۔"

جس طرح گاندھی جی اور مولانا آزاد ـــ جو کچھ بھی بنے وہ ان ذہنی تبدیلیوں کے بعد ہی بنے جنھوں نے بالآخر ان کے سامنے نصب العین اور راستوں اور منزلوں کی جستجو اور تعین کے سارے دروازے کھول دیے، اسی طرح مولانا عبدالماجد بھی ـ جو کچھ بھی بنے ان ذہنی کیفیتوں کے بعد قرار کی اس منزل کے بعد ہی بننے شروع ہوئے جو ان کے بقول "دہریت سے استقامت دین کی توفیق" کے بعد انھیں حاصل ہوئی تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی کی شخصیتوں میں جو فرق ہے وہ ان ذہنی تبدیلیوں کے بارے میں ان کے رویہ سے ظاہر ہو سکتا ہے، مولانا آزاد اپنی فاسقانہ اور مشرکانہ زندگی کا تذکرہ ایک فاتح کی حیثیت سے کرتے ہیں اور اس دنیا کو جو انہیں ورثہ میں ملی تھی اور جس کی بدولت وہ بھٹکے پر مجبور ہوے ایک ایسی دنیا قرار دیتے ہیں، جسے انھوں نے اپنی باغیانہ فطرت سے مسمار کر دیا اور اس کے ملبہ سے اپنی ایک نئی دنیا تعمیر کر لی گاندھی جی اس گمرہی پر متاسف لیکن اس گمرہی کو ترک کر کے سیدھا راستہ اختیار کرنے پر مطمئن نظر آتے ہیں اور انھیں یہ بات ظاہر کر کے خوشی ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی کوتاہیوں اور گمراہیوں پر

بغیر کسی بیرونی مداخلت اور رہنمائی کے قابو پالیا ان کے برعکس مولانا عبدالماجد دریابادی زندگی بھر اپنی اس گمراہی اور دہریت پرشیمان، نادم اور رنجیدہ رہے اور مدت العمر اسے دور جاہلیت قرار دے کر اس کا ماتم کرتے رہے اور اس سے تائب ہونے کے واقعہ کو عظیم الشان واقعہ قرار دے کر مغفرت کی دعاؤں میں مصروف رہے اور اس سلسلے میں مولانا محمد علی، سید سلیمان ندوی اور اکبر الہ آبادی کے احسانات کو یاد کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے رہے جن کی بدولت وہ اس دلدل سے نکلنے میں کامیاب ہو سکے جو ان کے نزدیک ان کی دنیا کے ساتھ عقبیٰ کو بھی خراب اور برباد کر دینے والی تھی۔

دنیا کو بسر کرنے اور میر تقی میر کے بقول زلیست کرنے کی خواہش اور زندگی کے سلسلے میں رویوں کا یہ فرق جو گاندھی جی، مولانا آزاد اور مولانا عبدالماجد کے مابین پایا جاتا ہے دراصل شخصیتوں کے درمیان پائے جانے والے فرق اور رجحان وطبیعت کے سلسلے میں اس قدرتی اختلاف کا نتیجہ ہے جس کے نمونے افراد کے درمیان عام طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں، مولانا آزاد اور گاندھی جی اپنی لغزشوں کو ایک گذراں واقعہ کی شکل میں دیکھتے ہیں اور فراموش کر جاتے ہیں، ان کے برعکس مولانا عبدالماجد ایسا گناہ سمجھتے ہیں جس کی تلافی کے لیے شرمندگی اور پشیمانی کا مسلسل اظہار ان پر مذہبی تقاضوں کے مطابق عائد ہوتا ہے۔

انھوں نے صحافتی زندگی کو ایک پیشہ کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے بجائے ایک مشن اور اس کے مطالبوں کی بدولت عائد ہونے والی ذمہ داریوں کی بجا آوری کی شکل میں قبول کر کے زندگی بھر نبھایا۔ وہ ایک ایسے مسلمان تھے جو اسلام کو اسلامی زندگی کو، اور ہر اس شعبہ کو جو اسلامی تمدن کا مظہر کہا جا سکتا ہے ہر طرح اور ہر طرف کے حملوں سے، کمزوری اور اضمحلال کے ہر امکان سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، نئی تہذیب سے انھیں نفرت نہیں تھی لیکن اس کے آثار واثرات کے سلسلے میں وہ اتنے چوکنے بلکہ خوف زدہ تھے کہ اس کا سایہ تک ان قدروں پر دیکھنا انھیں گوارا نہ تھا جنھیں وہ ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ اسلامی تمدن کا سرمایہ سمجھتے تھے عورتوں کی بے پردگی کو وہ عفت وعصمت کے پرانے پیمانوں کی شکست کی ابتدا قرار دیتے تھے اس لیے وہ زندگی بھر اس کی مخالفت کرتے رہے، عورتوں اور مردوں کے مخلوط مجمع کو بھی وہ مذہبی تقاضوں کے خلاف اور انحراف کی طرف ایک ایسا اقدام سمجھتے تھے جو ہر کی نزد اس مشرقی زندگی کی قدروں اور حدود کے لیے نقصان دہ تھی جو انھیں اسلام کے بعد سب سے زیادہ عزیز تھی، دہریت کے نقصان اور اس کوچہ کی راہ نوردی کے نتائج سے وہ خود واقف تھے اس لیے اس کا تو سایہ تک وہ افراد واجتماعیت میں دیکھنا پسند نہ کرتے تھے، ہندوؤں میں بھگوان داس، گاندھی جی، سری پرکاش، جواہر لال نہرو، ٹیگور، پنڈت سندر لال، یہاں تک کہ برج کشن لمیانی اور ہری چند اختر تک کے وہ ممدوح اسی لیے تھے کہ ان لوگوں کا رویہ انھیں اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں ہمدردانہ اور فراخدلانہ نظر آتا تھا، عرش ملسیانی اور ہری چند اختر کی نعتیں صدق جدید میں ہمیشہ "ہندو کی نعت" کے عنوان اور تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔

مستشرقین، عیسائی مشنریوں اور متعصب اور اسلام دشمن مورخوں اور اہل قلم کے مقابلے کے لیے انھوں نے "صدق جدید" کو ایک ہتھیار کی صورت میں استعمال کیا، وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی کتابوں کو جمع کرتے اور اپنے زیر مطالعہ رکھتے تھے جو ان کی نظر میں اسلام مخالف حلقوں اور مرکزوں سے شائع ہوتی تھیں اور اپنے قارئین کو ان حملوں اور تحریفوں کی نوعیت سے باخبر رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے جو اسلام پر اسلام مخالف قوتوں اور افراد کی طرف سے آئے دن کی جاتی رہتی ہیں، اس دور آخر میں وہ اسلام کے سب سے بڑے مدافع اور مبلغ تھے لیکن ان کی انشا پردازی کی زبردست صلاحیت اور خلاقانہ قوت کی بدولت ان کی تحریروں میں خشکی اور تقشف کے بجائے جو مذہبی داعیوں اور مبلغوں کا خاصہ بن جاتی ہے ایسی

دلآویزی، ایسا جمال اور دلبری یا تاثیر پیدا ہوگئی تھی جو بہت کم اہلِ قلم کے حصے میں آتی ہے۔"

حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں کے زوال اور اودھ کے تعلقہ داروں کی بربادی کے احوال انھوں نے مرثیہ کے قسم سے لکھے ہیں، ان کے اس طرح کے مضامین میں، جو رومان ہے، جو دلکشی اور تاثیر ہے شکستِ دل کی جو جھنکار ہے وہ اسی جذبہ کی دین ہے جو اسلامی تمدن کے تحفظ اور اس سلسلے میں ان کی بے بسی کے احساس سے پیدا ہوا ہے۔ وہ اس سارے سلسلے کو جس کے پیچھے تاریخ کا تسلسل اور وقت کی پوری قوت موجود تھی، انقلاب گردوں اور ستم ہائے روزگار سے تعبیر کرتے رہے، اور ان واقعات کو جو ایک پورے دور کے فطری خاتمہ اور تبدیلیوں کے منطقی نتائج اور مآل و انجام کو ظاہر کرتے تھے، تاریخ اور اس کی کروٹوں کے پس منظر میں دیکھنے کے بجائے انھوں نے ہمیشہ تہذیب و ملت کے زوال کے زخموں کی روشنی میں دیکھا، ان قدروں کی کمزوری اور نقصان کا خیال جو مشرقی تہذیب کی رفتہ آب و تاب کو قائم رکھے ہوئے تھیں ان کے سبھی خیالات و محرکات پر ہمیشہ غالب آجاتا تھا اور وہ بے اختیار دکھائی دینے لگتے تھے۔

وقتی سیاست، معاشی مسائل، طبقہ واری کش مکش، گروہی مسابقت، رست و خیز کی وہ زبردست کیفیت جس نے ایک طوفان کی شکل میں ہندستان کو گھیر رکھا ہے ان کے فکر و نظر کی حدود سے خارج تھے، وہ ان سب چیزوں اور ان مسائل کو اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے اور سیاسی اور گروہی اور جماعتی کش مکش کے سلسلے میں ان کا قلم ہمیشہ ایسے پہلو تلاش کر لیتا تھا، جو تہذیبِ رفتہ کی علویت اور نئے طور طریقوں کی پستی اور اخلاق یا تنگی کا فرق واضح کر سکتے ہوں، شرافت، وضعداری، بھول جانے اور معاف کر دینے کی عادت، مخالفت اور دشمنی میں بھی اخلاقی تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی روائتیں جو مشرقی تہذیب کی امتیازی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں، انھیں اتنی عزیز تھیں اور ان خصوصیات کے معیار اور پیمانے ان کے نزدیک اتنے بیش قیمت اور لازوال تھے کہ ان کے خلاف چھوٹی سے چھوٹی حرکت بھی ان کے لیے اذیت ناک اور ناقابلِ برداشت بن جاتی تھی، شریف و رذیل، اعلیٰ ظرفی اور تنگ ظرفی، شرافت و رذالت، گرانی اور ارزانی، بے اعتدالی اور زود ائی وار دیار جیسے سیکڑوں الفاظ ان کی تحریروں کے روزمرہ استعمال میں آتے تھے اور اس عہد کے ساتھ ان کی مکمل وابستگی بلکہ شیفتگی کو ظاہر کرتے تھے جو ان کے سامنے ہی مرگیا تھا اور جس کی بازآمد کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ان کا قلم میکالے کا قلم تھا اور ان کی زبان برک کی زبان تھی لیکن مولانا عبدالماجد کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی وہ گفتار کے آدمی ہی نہیں تھے، مجمعوں سے گھبرانے والے، تقریر سے جی چرانے والے نجی صحبتوں تک سے گریز کرنے والے ایک ایسے باکمال انشاپرداز، عالم اور صحافی تھے جو خلوتوں میں ہی اپنی محفل جماتے اور تنہائیوں ہی میں اپنے تخیلات و جذبات کی دنیا سجانے کے عادی ہوتے ہیں، تحریر وار ذریعہ تھا جسے وہ اپنے آپ کو ظاہر اور دنیا پرائے اندرون کو منکشف کرنے کے لیے کام میں لاتے انھوں نے اپنے آپ کو معمول کا اتنا پابند بنا لیا تھا کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا احترام، اور نازک سے نازک رشتوں کا خیال بھی انھیں اس معمول کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ کر سکتا تھا، وقت کو انھوں نے ایسی سختی اور ایسی طاقت کے ساتھ اپنے قابو میں کر لیا تھا کہ گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ کر بتایا جا سکتا تھا کہ وہ اس وقت کیا کر رہے ہوں گے اور کون سے کام میں مصروف ہوں گے انھوں نے جنون جیسی محنت اور طاقت کے ساتھ جتنا کام کر دیا ہے وقت کی پابندی ہی اس کا اصل سبب تھی، اس سلسلے میں وہ ذرا بھی رورعایت کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے، انھوں نے صحافتی اور تبلیغی زندگی ــــ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ایک مشن اور ایک عبادت کے بطور اختیار کی تھی اس لیے اس میں عبادت جیسا انہماک اور وابستگی بھی آخر تک قائم رہی، اسی انہماک اور مشغولیت کی بدولت

وہ اتنا زبردست اور معیاری ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں جو ایک ادارے کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔

مولانا عبدالماجد کی شخصیت یوں تو بڑی پہلودار تھی کہ صحافت، ادب اور مذہب کے مختلف شعبوں میں انھوں نے قابل رشک تصنیفات کے ذریعے اضافہ کیا۔ ادب، سوانح، سفرنامے، ترجمے، تفسیر اور تحقیقی موضوعات میں سے شاید ہی کوئی صنف ایسی بچی ہو جس میں ان کے قلم نے گلکاری نہ کی ہو، تاہم ان تمام حیثیتوں پر صحافتی حیثیت ہی غالب تھی، صحافت کے ذریعے ہی انھوں نے نام کمایا، صحافت کے ذریعے ہی انھوں نے امتیاز اور انفرادیت حاصل کی، صحافت کے ذریعے ہی انھوں نے اور دوسرے شعبوں میں راہ پائی اور صحافت کے ذریعے ہی ان کے دوسرے کمالات کو نمایاں ہونے کا موقع ملا، اگر سچ اور صدق نہ ہوتے تو تفسیر ماجدی بھی منصۂ شہود پر نہ آسکتی، نہ معاصرین کی تالیف کا موقع ملتا نہ محمد علی کی ذاتی ڈائری جیسی دستاویزی کتاب عالم وجود میں آتی، یہ تمام پہلو جو ایک کے بعد ایک تصنیف کی صورت میں سامنے آتے رہے ایسی کرنوں سے مشابہ کہے جاسکتے ہیں جو صحافت کے سورج سے ہی نکلی ہیں، اور مولانا ماجد کی شخصیت کو پہلودار بنانے میں حصہ لیتی ہیں ان کی زبان، ان کا بیان ان کا لہجہ، اس لہجہ کی کاٹ، اس کی تراش خراش، اس کی توانائی، پھر اسلوب کی وہ خصوصیت جو پختگی کی سب سے بڑی خصوصیت کہی جاسکتی ہے، صحافتی زندگی کی مشق اور مشغولیت کے سبب انھیں حاصل ہوئی تھی۔ یہ پہلو جو ان کی شخصیت کے قلمی پیکر کے خدوخال اور رنگوں کو ظاہر کرتے ہیں سراسر داخلی اور طبعی پہلو ہیں، شخصی طور پر وہ ایک ایسی شخصیت کے روپ میں ڈھل گئے جو عظمت، تقدس اور احترام کے مرعوب کن حصار میں محفوظ تھی اور ایک ہی رُخ اس میں نمایاں رہتا تھا، چھوٹوں کی حوصلہ افزائی، بڑوں کا احترام (ان کی زندگی میں ان سے بڑا رہ ہی کون گیا تھا) اور برابر والوں سے اخلاق کا برتاؤ کرنے کے اخلاقی مطالبوں نے جو ایک جسمانی ہیئت اختیار کرلی تھی وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت تھی، وہ فطری طور پر بڑے سنجیدہ، کم آمیز، دیر آمیز اور کام سے کام رکھنے والے بزرگ تھے، وقت کو ضائع کرنے سے بڑا کوئی جرم ان کے نزدیک نہیں تھا، اس لیے وہ ہر ایک سے بس ضرورت کے مطابق ہی کلام کرتے تھے، ضرورت اور کام سے ایک لمحہ زیادہ بھی گفتگو یا صحبت ان کے لیے ناپسندیدہ ــــ اور آخر آخر تو ناقابل برداشت بن گئی تھی۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو سفر اور حضر میں اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیتے تھے اور مہمانی اور میزبانی کی دونوں حالتوں میں، ان معمولات کو نباہنے کی اتنی قوت اور اختیار بھی انھوں نے حاصل کرلیا تھا جو اس زمانے میں لاثانی اور بے مثال کہا جاسکتا ہے۔

ان تحریروں میں غزالی کا مستحکم ایمان، حافظ ابن حجر کی ژرف نگاہی اور گہری علمیت، شبلی کی مورخانہ نظر اور غالب کا نثری سلیقہ، ایک جگہ نظر آتا ہے، صحافت کو علمی رنگ اور ادبی اسلوب کے ساتھ برتنے اور نباہ لینے کی صلاحیت ان کے قلم سے زیادہ کسی اردو صحافی میں نہیں ملتی، وہ مولانا ابوالکلام کے بعد دوسرے صحافی ہیں، جنھوں نے صحافت میں علمی شان اور ادیبانہ شگفتگی کے ساتھ شخصی وقار کو قائم رکھا، اور تبصروں کو شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے مضمون کو ادا کردینا ان کی تحریر کی ایسی خصوصیت ہے جس کی مماثلت تو کیا تقلید بھی کسی سے ممکن نہیں، زبان اور بیان پر ان کی پوری گرفت اور مکمل قدرت کا اظہار ان کی تحریر کی ایک ایک سطر اور ایک ایک فقرے سے ہوتا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں ایسی مہارت اور فنی کمال بہم پہونچایا تھا کہ ان کے رنگ میں دس جملے بھی لکھ لینا کسی کے لیے آسان نہیں، ضرب الامثال، محاوروں، روزمرہ اور تلمیحات پر ان جیسا عبور ان کے بعد شاید ہی کسی بڑے سے بڑے اردو ادیب کو حاصل ہوسکے، یہ عناصر جو ان کی تحریروں میں شگفتگی، قوت اور زبردست خیال انگیزی اور تحریک کو پیدا کرتے ہیں، دراصل غزل کے بنیادی

عناصر ہیں، اور ان کا کامیاب استعمال نثر میں مولانا عبدالماجد کے سوا کسی سے ممکن نہ ہو سکا۔

وقت کی قدر کے خیال نے ان کی تحریر میں بھی امتیازی مقام حاصل کر رکھا تھا وہ تمہید میں وقت ضائع کیے بغیر جو بھی بات کہنا چاہیں، اسے شروع کر دیتے تھے، موضوع پر انکی گرفت اتنی زبردست ہوتی تھی کہ پہلے جملہ کے ساتھ ہی ان کا قاری ان کے ساتھ ذہنی سفر شروع کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا، وہ اسے جہاں تک چاہتے اپنے ساتھ رواں دواں رکھتے اور جہاں چاہتے اسے ہکا بکا چھوڑ کر اچانک خاموش ہو جاتے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں نے کئی بار ایسے ہمہ گیر اور عوامی جوش کو جگانے میں کامیابی حاصل کر لی جو کسی معیاری تحریر اور خواص پسند اہل قلم کے لیے ناممکن تھی، اس سلسلے میں دو واقعات کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا ایک واقعہ میں ان کی مخالفت اور حملے کا نشانہ نیاز فتح پوری جیسا زبردست اہل قلم اور انشا پرداز بنا اور دوسرے میں یگانہ چنگیزی۔ ان دونوں شخصیتوں کے خلاف مولانا عبدالماجد نے عوامی سطح پر اتنا ہیجان انگیز ماحول اپنے قلم اور اپنی تحریر کے ذریعہ پیدا کر دیا کہ ان کی شخصیت، سماجی حیثیت اور ذاتی احترام میں سے کوئی چیز بھی انھیں سخت اور اہانت انگیز عوامی رد عمل سے محفوظ نہ رکھ سکی اور عام لوگوں نے دونوں کے ساتھ رسوا کن برتاؤ کیا کہ نیاز فتح پوری کے لیے اعلانیہ طور پر معافی مانگنے اور اپنے خیالات سے تائب ہونے اور یگانہ چنگیزی کے لیے کنج عزلت اور گوشہ گمنامی میں چلے جانے کے سوا سلامتی کی کوئی راہ باقی نہ رہی اور سارے ہندستان میں بدنامی کا داغ الگ سے ان کے حصہ میں آیا۔

الفاظ کی اتنی زبردست تاثیر اور تحریر کی یہ بے مثال قوت۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا۔ الفاظ کے پیچھے مولانا عبدالماجد کی شخصیت کی موجودگی نے پیدا کر رکھی تھی، مذہب کے ساتھ ان کی گہری وابستگی، اسلام کے ساتھ ان کے والہانہ تعلق، اخلاص اور ایمان کی قوتوں سے مسلح ان کے اسلوب اور ادب انشا کے موثر ترین عناصر سے مزین ان کے لہجے نے عظمت و احترام اور تقدیس و تکریم کا جو ہالہ ان کی شخصیت کے لیے تیار کیا تھا وہ ان کی تحریر کے پیچھے ہمیشہ موجود رہتا تھا ان کے فنی کمال کی حد یہ تھی کہ ان کے الفاظ اس شخصیت کے لیے پردہ کے بجائے جھروکے کے کام میں آتے تھے، اور وہ لوگوں کو اپنے غم و غصہ، نشاط و مسرت، دکھ درد، اذیت اور جھلاہٹ کی کیفیتوں سے پورے طور پر واقف کرانے بلکہ اپنا ہم نوا بنا لینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

انھوں نے بڑے پرخطر زمانے میں اس دنیا کو چھوڑا، اس زمانہ میں کہ شخصیتوں سے محرومی اور نقصان کا احساس عام طور پر مفقود ہوتا جا رہا ہے، یہ ایک ایسا زمانہ ہے کہ دنیا کی اور واقعات کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ نشاطیہ اور المیہ نقوش کا قائم رہنا دشوار ہوا جاتا ہے، اس لیے اس میں حیرت کی تو کوئی بات نہیں کہ مولانا عبدالماجد کی جدائی اور ان کی شخصیت سے محرومی کا ویسا ماتم دیکھنے کو نہیں مل سکا جیسا کہ اب سے پچیس تیس سال پہلے تک ممکن تھا، تاہم بڑے افسوس اور تشویش کی بات ہے کہ اپنے اکابرین کے سلسلے میں غفلت اور بے تعلقی کا رویہ ایک عام بات ہوتی جا رہی ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی کے سلسلے میں بھی عام طور پر جس رد عمل اور محرومی کے جتنے احساس کا مظاہرہ سامنے آیا ہے وہ یقیناً اس سے کہیں زیادہ یادگاری کے مستحق تھے، انھوں نے اپنی تصنیف و تالیف اور اپنی تحریر کے ذریعے اردو کی جتنی خدمت کی، جیسی مستعدی اور ہمت کے ساتھ وہ آدھی صدی سے زیادہ مدت تک تخلیقی کام میں منہمک رہے، اس انہماک اور ان تھک کاموں کے ذریعے انھوں نے ادب اور صحافت کے دامن کو جتنا وسیع اور مالا مال کیا وہ یقیناً فراموش اور معدوم نہیں کیا جا سکتا، وہ اپنی کتابوں اور اپنے افکار، اپنے جذبہ اور اپنی ہمت سمیت اردو ادب و صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ مرحوم رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں "حب عزم صمیم کار عظیم اور لطف عمیم میں سے کوئی چیز قابل فراموش نہیں ہو سکتی"، تو مولانا عبدالماجد کیسے فراموش ہو سکتے ہیں جن کی شخصیت میں تینوں عناصر موجود تھے۔

✦

ڈاکٹر ولی الحق انصاری

اُستادِ عصر عالمِ دوراں چلا گیا

روحِ ادب وہ، علم کی وہ جاں چلا گیا — فخرِ وجود تھا جو، وہ انساں چلا گیا
آب و ہوائے گلشنِ عالم نہ آئی راس — تھا مرغِ قدس ہو کے پریشاں چلا گیا
یارانِ علم و حلقۂ اربابِ دل کے ساتھ — بزمِ ادب کو چھوڑ کے گریاں چلا گیا
ہیں بلبلانِ گلشنِ تحقیق سوگوار — جانِ چمن، وہ فخرِ گلستاں چلا گیا
اُجڑی سی آ رہی ہے نظر ہر بساطِ دل — کر کے دیارِ علم کو ویراں چلا گیا
رہتے تھے جس کی بو سے معطر دل و دماغ — باغِ خرد کا وہ گُلِ خنداں چلا گیا
جس کے ہر ایک لفظ میں نشتر کی تھی چبھن — وہ صاحبِ قلم وہ زباں داں چلا گیا
وہ جس کے دم سے بحرِ صحافت تھا موج خیز — جولانیٔ قلم کا وہ طوفاں چلا گیا
سیکھیں گے کس سے اب فنِ انشا کی ندرتیں — اُستادِ عصر عالمِ دوراں چلا گیا
الحاد سے جو آیا تھا ایمان کی طرف — افسوس وہ مفسرِ قرآں چلا گیا
اسلام جس پہ فخر کرے اور کفر ناز — وہ فیلسوفِ مردِ مسلماں چلا گیا
اک وہ تھا جس کو علم سے ایماں ہوا نصیب — وہ بھی تھے جن کا علم سے ایماں چلا گیا
دل مانتا نہیں ہے کہ ما[illegible]دا ہوا — کہنا ہی پڑ رہا ہے مگر "ہاں چلا گیا"

آں زبدۂ خلائق و فخرِ زمانہ رفت
مرغِ بہشت بود، سوے آشیانہ رفت

مولانا عبدالماجد دریابادی ـــــ کچھ یادیں

مرزا جعفر حسین

ہماری ریاست میں بہت سے ایسے قصبات ہیں جو ایک زمانے میں بہت مردم خیز تھے۔ بڑے بڑے باکمال وہاں پیدا ہوئے اور پھر اسی خاک کا پیوند ہوگئے۔ سیتاپور میں خیرآباد بڑی ممتاز حیثیت کا مالک رہا ہے۔ لکھنؤ میں قریب ہی شرف کاکوری کو حاصل تھا۔ لیکن عہد قدیم میں بارہ بنکی کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہاں سرزمین سہالی سے ملا نظام الدین کے ایسے شہرۂ آفاق عالم پیدا ہوئے۔ تحصیل فتح پور میں شاہ سارنگ کا جگمگاتا ہوا مزار مبارک اب بھی مرجع خواص و عوام ہے۔ بانسہ میں مولانا عبدالرزاق اور دیوہ شریف میں حاجی وارث علی شاہ کے ایسے عارفان باثر پیدا ہوئے جنھوں نے اخوت و انسانیت اور صداقت و شرافت کا بنی نوع انسان کو درس دیا تھا۔ اسی ضلع میں ایک قصبہ دریاباد ہے جس کی خاک سے بھی بڑے گراں قدر انسان معرض وجود میں آئے تھے۔ برادران ہنود میں رائے سدھوناتھ بلی فراقی صاحب کی ذات گرامی تھی جو عربی، فارسی اور اردو زبانوں کے ماہر تھے۔ ان کے تبحر علمی کا پتہ ان کے رامائن کے ترجمے سے لگتا ہے۔ مسلمانوں میں مولانا مفتی مظہر کریم کی ذات گرامی تھی جو عالم و فقیہ ہوتے ہوئے زبردست شیدائے وطن تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہیبت ناک دور میں یہ انھیں کا جگر تھا کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ انجام ظاہر تھا۔ گرفتار ہوئے۔ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی لیکن ابرو پر بل نہیں آیا۔ خندہ پیشانی سے مصیبت کو قبول کر لیا۔ تخمیناً پینتیس برس کے بعد انھیں کی اولاد میں ایک ایسی جلیل القدر شخصیت معرض وجود میں آئی جس نے ہر نہج سے اپنے جد بزرگوار کا نام نامی روشن کیا۔ یہ شخصیت مولانا عبدالماجد دریابادی کی تھی۔

مولانا دریابادی نے قوم پروری اور وطن پرستی کی خصلتیں متروکہ میں پائی تھیں۔ مبدار فیاض نے ان کے خمیر میں ذہانت و ذکاوت کے جوہر کوٹ کوٹ کے بھر دیے تھے۔ علم و دانش کا یہ پیکر تھے، عرفان کے نور سے ان کا دماغ منور تھا اور محبت کے سرچشمہ سے ان کے دل کی آبیاری ہوئی تھی۔ اس دنیا میں بہت سے ایسے چہرے نظر آتے ہیں جن میں تقدس کی جھلکیاں ضوفگن رہتی ہیں۔ لیکن دلوں میں سیاہی و کثافت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ بہت سے ایسے خوش گفتار ملتے ہیں جو علم و ادب کی باتیں کرتے ہیں لیکن ان کے شعور کی گہرائیوں میں جہالت چھپی ہوتی ہے۔ ماہرین سیاسیات میں ملک و وطن کے بیشتر خادم ہوتے ہیں لیکن ایثار و قربانی اور بے غرض خدمت ملک و قوم کرنے والے خال خال ہوتے ہیں۔ کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیاداری کئے بغیر بہت کم لوگ زندگی کاٹ لے جاتے ہیں۔ ایک بلند پایہ انسان وہی کہلانے کا مستحق ہے جس کے علم پر جہالت غالب نہ ہو۔ جس کے تقدس کے پردہ میں معصیت پوشیدہ نہ ہو، جس کی گفتار کردار سے پیوند رکھتی ہو، جو فرشتہ خصلت ہوتے ہوئے آدمیوں کے زمرے میں شامل رہے، جس کے دل میں بنی نوع انسان کی ناقابل تقسیم برادری کا تخیل جاگزیں ہو اور وہ خدمت خلق اپنا شعار بنائے۔ سیاسیات سے مادری ہو کر ملک و قوم کا شیدائی ہو اور مذہب کے قید و بند میں عقلاً و شعوراً پابند رہ کر اپنا دامن فکر و عمل عصبیت و تنگ نظری سے بچا لے جائے۔ مولانا دریابادی ان تمام خصوصیات کے حامل تھے۔

علوم کا ذخیرہ مشرق اور مغرب کی زبانوں میں ملتا ہے یا یوں سمجھیے کہ ہم ہندستانیوں کے لیے یہی زبانیں یعنی عربی، فارسی اور انگریزی وسیلۂ حصول علوم ہیں۔ عموماً علوم مشرقیہ سے فارغ التحصیل ہو کر طالبان علم انگریزی و لاطینی زبانوں کی طرف توجہ کیا کرتے

تھے۔ بہت کم ایسے ماہرین علوم گزرے ہیں جنھوں نے بیک وقت ان سب باتوں میں کمال حاصل کیا ہو۔ مولانا دریا بادی نے ابتداءً انگریزی تعلیم حاصل کی۔ سیتاپور سے میٹرک پاس کرکے لکھنؤ کیننگ کالج میں داخلہ حاصل کیا۔ اسی کالج سے بی۔اے پاس کیا۔ ان درجات میں ان کا ایک مضمون عربی تھا لیکن انھوں نے صرف درسی کتابوں پر توجہ نہیں کی اور جب بی اے پاس کیا تو اسی وقت وہ فارسی اور عربی زبانوں پر قدرت حاصل کر چکے تھے۔ یہ ساری قابلیت گھر ہی میں پڑھ کر حاصل کی تھی جو خود انھیں کے ذوق طلب علم کا نتیجہ تھی۔ بی۔اے کی تعلیم کے دوران جس مضمون نے انھیں بہت گرویدہ کیا وہ فلسفہ تھا چنانچہ ۱۹۱۲ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فلسفے کے ایم اے کلاس میں داخلہ لیا تھا لیکن چونکہ وہاں فلسفہ کی تعلیم کا معقول بندوبست نہ تھا اس لیے ۱۹۱۳ء میں دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ بعض ناگزیر اور ناگفتہ بہ حالات کے تحت ایم اے پاس نہیں کر سکے لیکن فلسفہ کا مضمون پسند کرنا ہی ان کے مزاج کی تفکر و تعقل سے وابستگی کا پتہ دیتی ہے۔ وہ حقیقتاً تفکر و تعقل کی وادیوں میں راہ پیما تھے اور فلسفہ سے ان کے دماغ و دل کو ایک فطری تعلق تھا جس کا پتہ اُن کے تخلیقات سے چلتا ہے جو آج بھی بہتات کے ساتھ فراہم ہیں اور جن کی تعداد راقم کی اطلاع میں تخمیناً پچاس کتب و رسائل تک پہونچتی ہے۔

خیالات و عقائد کی ترویج کے لیے جرائد اور رسالے ہی بہترین ذریعہ ہوتے ہیں۔ مولانا دریا بادی نے اس اہم خدمت کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے انجام دینا شروع کر دیا تھا۔ ان کا سب سے پہلا کارنامہ غالباً غذائے انسانی کے نام سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں بہت اہم کارنامہ انگریزی میں وہ تصنیف تھی جس میں سیاسی رہنماؤں کے نفسیات پر بحث کی گئی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ فلسفہ جذبات کے نام سے شائع ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بعض کارناموں کا انگریزی ترجمہ یا انگریزی اصل متن لندن میں بھی شائع ہوا تھا۔ یہی واحد واقعہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان کو اس بدیسی زبان پر بھی کمال حاصل تھا۔ ایک مختصر مضمون میں تصنیفات و تالیفات کی کثیر تعداد کے نام پیش کر کے ان کے موضوعات کی تفصیل بتانا بھی محال ہے چہ جائیکہ کوئی تبصرہ یا تجزیہ کرنا۔ اس لیے اس مقام پر صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ مولانائے موصوف نے جن جن زبانوں کو پڑھا تھا ان پر پوری طرح قابو حاصل کر لیا تھا اور جن جن موضوعات سے دلچسپی لی تھی ان پر بھی پوری طرح کمال حاصل کر لیا تھا۔ ان موضوعات میں نقد و کلام کے علاوہ علم ادب، علم عروض، علم طب، سیاسیات وغیرہم شامل تھے۔ اور اپنے ان خزانہائے علم و معلومات سے دوسروں کو فیضیاب کرنے کے لیے انھوں نے جرنلزم کو پسند فرمایا تھا۔ اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ حصول علم کے بعد ہی سے اپنی ساری زندگی ایک گراں قدر اور بلند پایہ اہل قلم کی حیثیت سے گزاری تھی۔ ایک طرف قرآن و حدیث کا درس دیا تھا تو دوسری طرف قوم پرور رجحانات کو فروغ دینے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

مولانائے مرحوم کے ادبی خدمات کا اندازہ ان کے تصنیفات و تالیفات سے ہوتا ہے۔ لیکن ان کا شمار بہترین صاحبان قلم میں بھی تھا۔ جس کی غالباً یہ وجہ تھی کہ ان کو اس فن سے فطری تعلق تھا اور طبیعت میں ذوق بھی تھا۔ چنانچہ انھوں نے المعارف اور ماڈرن ریویو (MODERN REVIEW) کی ادارت میں شامل ہو کر گراں بہا خدمات انجام دیے تھے۔ ماڈرن ریویو ایک بلند پایہ رسالہ تھا اور اسی طرح المعارف کا درجہ بھی نقد و اصول میں بہت بلند رہا ہے۔ مولانا کا ان رسالوں سے وابستگی پیدا کرنا ہی ان کی بلندی شعور پر دلالت کرتا ہے اور یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ ان کے دوران کارکردگی ان رسالوں کی منزلت میں اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ وہاں سے انھوں نے علحدگی کیوں اختیار کی اس کا پتہ تو نہیں چل سکا لیکن غالباً یہ سبب رہا ہو کہ وہ آزادانہ طور پر اظہار خیال کے قائل تھے اور یہ اختیار صرف ایسے ہی جریدہ پر حاصل ہو سکتے تھے جو خود انھیں کی ملکیت

ہو پایہ کہ اس پر ان کو مالکانہ تحکم حاصل ہو۔ بظاہر یہ صورت حال صدق کی اشاعت میں پیدا ہو گئی تھی جس سے ان کا تعلق آخر عمر تک برقرار رہا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس اخبار کی آبیاری ہمیشہ انھیں سے متعلق رہی اور اس طرح متعلق رہی تھی کہ مولانا عبدالماجد اور صدق یہ دونوں نام توام ہو گئے تھے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا کیونکہ مولانا کا مسلک ہی صداقت پرستی تھا۔ صدق کی حمایت میں وہ تیغ بے نیام کی حیثیت رکھتے تھے۔

صدق جدید جو موجودہ شکل میں موجود ہے ۱۹۵۰ء میں جاری ہوا تھا۔ اس وقت اس کا نام سچ تھا اور اس کے بانی مولانا ظفر الملک تھے۔ ان کی دلچسپیاں الناظر سے بڑھتی چلی گئیں لہٰذا یہ اخبار مرحوم عبدالرؤف عباسی کی طرف منتقل ہو گیا۔ عباسی مرحوم کی دوکان ایام قدیم سے چوک میں تھی جہاں علمی و ادبی کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔ اس زمانہ میں چوک میں شام کے وقت سیر و تفریح کرنا شرفائے لکھنؤ کے عادات و خصائل میں داخل تھا۔ شعرا و ادیب بھی جایا کرتے تھے۔ من چلے نوجوان اپنا وقت گول دروازہ سے مسجد تحسین علی خاں تک گشت لگانے میں صرف کرتے اور اپنے چشم و گوش کو آسودگی فراہم کرتے تھے۔ لیکن متین و سنجیدہ لوگ اپنے ذوق علم و ادب کو تسکین دینے کے لیے بعض مخصوص دکانوں پر مجتمع ہو جایا کرتے تھے۔ انھیں دکانوں میں عبدالرؤف مرحوم کی بھی ایک دوکان تھی جہاں ہر شام کو علم و ادب اور شعر و سخن کے چرچے رہا کرتے تھے۔ امتداد زمانہ سے حالات بدلے، رفتہ رفتہ وہ دکان بھی ختم ہو گئی اور مولانا دریابادی کا یہ ہفتہ وار "سچ" ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک نکلتا رہا۔ پھر یہی اخبار صدق کے نام سے نکلا۔ دسمبر ۱۹۵۰ء سے یہی اخبار اب تک صدق جدید کے نام سے پابندیِ وقت سے شائع ہو رہا ہے۔ اس صحیفۂ گرامی کے ذریعہ مولانائے مرحوم نے تبلیغ و ترویج کے بڑے گراں قدر خدمات انجام دیے تھے۔ پرانی فائلوں کا مطالعہ ان کے تبحر علمی اور وسیع النظری کا ثبوت فراہم کرے گا۔ ان کے پاس علم کا بے پناہ ذخیرہ ہی نہیں تھا بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے اور اس کی ترویج کا سلیقہ بھی تھا۔ قلم میں اتنا زور تھا کہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ اپنے الفاظ کے ذریعہ دوسروں کے دلوں میں اتار دیتے تھے۔ ایک اچھے قلمکار کی یہی تعریف ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہو اپنے الفاظ کے ذریعے پڑھنے یا سننے والے کے دل و دماغ میں اپنا مفہوم پوری طرح اور صحیح صحیح حوالہ کر دے۔ مولانا اپنی تحریر پر بھی قدرت رکھتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کے چہرے بشرے اور حرکات و سکنات سے اس کے کردار کا پتہ چلتا ہے۔ اس اصول کے تحت جب راقم مولانا مرحوم سے اپنی پہلی ملاقات کا وقت یاد کرتا ہے تو دماغ کے سامنے ان کے لمبے قد، مضبوط و توانا جسم، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی، گورا چہرہ اور بھری بھری ڈاڑھی کا نقشہ آجاتا ہے۔ بنا گیا تھا کہ وہ پہلے تنگی مونچھیں اور ڈاڑھی صاف رکھتے تھے۔ لباس بھی ابتدا مختلف تھا لیکن جب میں نے ان کو پہلی بار دیکھا اور اس کے بعد جب بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا وہ ہمیشہ کھادی پوش ہی نظر آئے تھے۔ یہاں تک کہ سر کا عمامہ اور گلا نرھنے کا رومال بھی کھادی کا ہوتا تھا۔ جسم پر کبھی کبھی عبا پہن لیتے تھے لیکن عام طور سے لانبا کرتا اور اس کے اوپر صدری ان کا ملبوس ہوتا تھا۔ بات کرنے کا طرز بحد سنجیدہ اور ملائم تھا ان سے گفتگو کرنے میں مزہ ملتا تھا اور ان کو دیکھ کر ان کے علم و تقدس کا احساس ہوتا اور ایک طرح کا معنوی رعب بھی پڑ جاتا تھا۔

ان کے بہترین مخلص دوست پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ان کی علمی عظمت کے بہت قائل تھے اور ان کی یہ تمنا تھی جو نہیں پوری ہو سکی کہ اُن کے مجوزہ جشن مسعود کے موقع پر مولانا دریابادی کے ہاتھوں اُن کی تصنیف کردہ کتاب "واجد علی شاہ" کا رسم اجرا ادا ہو یعنی یہ کہ مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم زعمائے ملت اور ارباب اقتدار پر مولانا دریابادی کو ترجیح دیتے تھے اور اُن کے تبحر علمی کے پرستار تھے۔ مولانا مرحوم کو مسعود صاحب سے کتنی ارادت تھی وہ واقعہ بھی بیان کرنے کے قابل ہے۔

راقم کے ایک دوست کو مرکزی حکومت کے محکمۂ تعلیم میں اپنی کسی خاص ضرورت کے لیے مولانا دریابادی سے ایک سرٹیفکیٹ

حاصل کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اُن کے پاس مسعود صاحب مرحوم کا ایک سرٹیفکٹ بھی موجود تھا۔ انھوں نے یہ خواہش کی کہ مسعود صاحب کے ذریعہ سے مولانا کا سرٹیفکٹ بھی حاصل کرادیا جائے انھوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا کی خدمت میں ان کو نیاز حاصل تھا مسعود صاحب اس زمانہ میں علیل تھے اور صاحب حاجت کو مولانا کا سرٹیفکٹ حاصل کرنے میں تعجیل تھی۔ ان حالات میں راقم نے یہی فیصلہ کیا کہ میں خود اُن کو ہمراہ لے کر دریاباد چلا جاؤں۔ مولانا نے ایک بار فرمایا تھا کہ "مجھے میرے اصلی حال میں دریاباد ہی میں دیکھنا چاہیے" یہ فقرہ یاد تھا اور اسی اشتیاق میں ہم لوگ وہاں پہنچے۔ دو روز قبل اُن کو بذریعہ خط اپنے پہنچنے کی اطلاع کر چکا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ہاشم قدوائی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ منتظر تھے۔ ہم لوگوں کی میزبانی انھیں کے ذمہ تھی کچھ وقفہ کے بعد مولانائے محترم سے ملاقات ہوئی۔ میں نے حاضری کی وجہ پیش کی اور عرض مدعا کیا۔ یہ بھی گزارش کی کہ شام ہی کی گاڑی سے ہم لوگوں کی واپسی ہوجائے گی۔ انھوں نے تین بجے سہ پہر کو سرٹیفکٹ مرحمت فرمادینے کا وعدہ فرمایا۔ پھر یہ معذرت کی کہ وہ کھانے کے وقت ہمارے ساتھ شرکت نہ کرسکیں گے اس لیے کہ انھوں نے دن کا کھانا ایک لخت ترک کردیا ہے کیونکہ کھانا کھانے کے بعد دوپہر کو پڑھنا لکھنا سکون کے ساتھ نہیں ہوسکتا اور عدیم الفرصتی کا عذر کرکے رخصت ہوگئے۔ اُس زمانہ میں وہ قرآن مجید کا ترجمہ تحریر فرما رہے تھے۔ شام کو وقت کی پابندی سے تین بجے تشریف لائے اور جو انگریزی میں سرٹیفکٹ مرحمت فرمایا تھا اُس کا ترجمہ یہ ہے "مجھے مسرت ہے کہ میں ... کا نام کی سفارش کر رہا ہوا جہاں تک ان کی قابلیت کا تعلق ہے سید مسعود حسن رضوی کی رائے کو قطعی اور معتبر سمجھنا چاہیے" مولانا کی اتنی ہی سفارش کارگر ہوگئی لیکن انھوں نے صاحب حاجت کی علمی قابلیت پر اپنی جانب سے مہر تصدیق بھی ثبت نہیں کی تھی اس لیے کہ وہ کا حقہ ذاتی واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ یہی ایک واقعہ اُن کی صداقت پرستی اور مخلصانہ ہمدردی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

مولانا مرحوم اپنے اوقات کے سختی سے پابند تھے۔ اصول کے پکّے اور وضعداری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اونچے سیاسی حلقوں میں اُن کا احترام ہوتا تھا۔ سیاسی سوجھ بوجھ بہت تھی۔ وطن پرورانہ مسلک تھا۔ گاندھی جی کے پرستار تھے۔ کھادی پہننے والوں کی اولین صف میں داخل تھے لیکن سیاسیات میں عملاً کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ حکومت کی جانب سے عطا کردہ وہی اعزاز قبول کیے تھے جن کا تعلق علم و ادب سے تھا۔ اُردو زبان کے فطری طور پر پرستار تھے اور اس زبان کو فروغ دینے میں اُن کے خدمات کسی دوسرے سے کم نہیں تھے۔ بحیثیت انسان کے صاف گوئی اور صداقت پرستی کے ایسے بلند و پاکیزہ خصائل پر ہمیشہ کاربند رہے۔ اُن کے پرستاروں میں صاحبان اقتدار اور حاملان جاہ و جلال شامل تھے لیکن اُن کی علو طبیعت اور مستغنی المزاجی نے اُن کو خودداری کی منزل سے کبھی نیچے نہیں گرنے دیا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عظمت و بزرگی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے یا خود اُن کے علم و فضل نے اُن کو بلند و بالا کردیا تھا لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ایسے عظیم المرتبت انسان نظر آتے تھے جو شرافت و انسانیت حسن اخلاق و کردار بلکہ رفتار و گفتار میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے اُٹھ جانے کے بعد ہماری دنیائے علم و ادب اور عالم شرافت و اخلاق میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ جو مدتوں تک پورا نہیں ہوسکتا البتہ اُن کے فیوض اُن کے چھوڑے ہوئے متروکہ تصنیفات و تالیفات سے جاری رہیں گے بشرطیکہ ہم میں اکتساب کے جوہر بھی برقرار رہیں۔ زمانہ کی ناساعدت کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی مولانا دریابادی کی ہمت مردانہ کی تاسی کرنا پڑے گی۔

★

علی جواد زیدی

اک چراغ تھا نہ رہا

سالِ پیوستہ، میں بڑی پریشانی کے عالم میں چند دنوں کی رخصت لے کر تہران سے لکھنؤ آیا تو وہاں مولانا عبد الماجد دریابادی کی ناسازیِ مزاج کی خبر ملی۔ اگرچہ وقت بہت کم، مشغولیتیں بے شمار اور والدۂ ماجدہ کی شدید علالت کے باعث ایک منٹ بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا تھا لیکن یہ خبر سُن کر یہ کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ میں مولانا کی زیارت کے بغیر ہی واپس چلا آؤں۔ مرحوم سے بہت گہرے علائق تھے۔ وہ تحریک خلافت کے زمانے کے مجاہد تھے، بزرگ تھے، عالم تھے اور جن علما اور سیاست دانوں سے مجھے عقیدت تھی اُن سے بے حد قریب رہ چکے تھے پھر میرے طالب علمی کے زمانے کے دوست حبیب احمد قدوائی کلاب علموں کی تحریک کے رفیق (پروفیسر) محمد ہاشم قدوائی کے چچا اور خسر تھے۔ اس پورے گھر سے میرے تعلقات بہت قریبی تھے۔ حبیب صاحب اور ہاشم صاحب کے علاوہ حکیم عبد القوی صاحب سے بھی (جو ان دونوں کے بڑے بھائی بھی ہیں اور ہم زلف بھی) ملنا ہوں تو ہمارے درمیان مغائرت کے پردے نہیں ہوتے۔ مولانا ان سب کے بزرگ تھے۔ ان کی تمام عنایات اور عزت افزائیوں کے باوجود میں ان سے ہمیشہ ایک خوردہی کی طرح ملتا رہا اور ان کی شخصیت میں بزرگی کے ساتھ ادب نوازی کے ناقابل تسخیر جذبے کو محسوس کرتا رہا۔ اب جو معلوم ہوا کہ اُن پر فالج کا حملہ ہوا ہے تو میں نوا تو ان منزل پہنچا۔ دوپہر کا سورج ڈھلنے ہی والا تھا کہ مولانا برآمد ہوئے۔ بھائی حبیب صاحب نے تعارف کرایا، اسی دیرینہ محبت کا اضافہ فرمایا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ شدت مرض کے دائرے سے باہر نکل آئے تھے اور اب مالک حقیقی کے کرم سے اس کی بارگاہ میں ادا کی جانے والی نماز ظہر کی امامت کر رہے تھے۔

نماز ادا کرنے کے بعد نشست گاہ میں تشریف لائے، حال احوال پوچھتے رہے۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ "ادھر میں نے پروفیسر حسین نصر کی ایک انگریزی کتاب کا ریویو پڑھا ہے۔ کتاب اسلام سے متعلق ہے اور اسلامیات پر عصری ضروریات کے پیش نظر اظہار خیال کیا گیا ہے یہاں تو ملتی نہیں۔ وہاں ملے تو مجھے بھیج دیجیے۔" اس ایرانی مصنف اور فلسفی کی اس تازہ ترین تصنیف سے تہران میں رہنے کے باوجود میں بے خبر تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے ارباب خبر سے پوچھا، کتب فروشوں سے سراغ لگایا تو معلوم ہوا کہ شاید مرحوم کے پیش نظر IDEALS AND REALITIES OF ISLAM، کا ریویو ہے۔ کچھ دیر اس موضوع پر بات چلتی رہی۔ پھر لکھنؤ کی اذیت رساں شیعہ سنی کش مکش کا ذکر چل پڑا جو اب ایک ناسور کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اتحاد ہم دونوں کا محبوب موضوع رہا ہے لیکن کچھ اپنی عدیم الفرصتی اور زیادہ تر مولانا کی نادرستی مزاج کا خیال کر کے میں نے بحث میں مزاح المومنین کا پہلو پیدا کرنا چاہا اور وہ سوال دہرا دیا جو میں اکثر شیعہ اور سنی علما سے کر دیا کرتا ہوں کہ "حضور سرور کائنات شیعہ تھے یا سنی؟" کوئی اور ہوتا تو اس گستاخانہ سوال پر شاید چیں بر جبیں ہو جاتا لیکن مولانا خدانخواستہ

تاہد خشک نہ تھے۔ وہ تو طنز کے سب سے بڑے اداشناس تھے۔ اُن کے دُور رس ذہن نے اس کرب بھرے سوال کے پیچھے چھپے ہوئے اس طنز کو فوراً پالیا اور مولانا کے سُرخ و سپید چہرے پر ایک عالمانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس بزرگانہ مسکراہٹ کی روحانی فضا کے خوشگوار تاثرات لیے ہوئے میں "خاتون منزل" سے رخصت ہوا۔ اس ملاقات میں ضعف اور مرض کے کلیتہً ختم نہ ہونے کا احساس تو ضرور ہوا لیکن میں یہ سوچنے پر بالکل تیار نہیں تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ تہران واپس آکر میں نے کتاب فراہم کی اور اس کا منتظر ہی تھا کہ کوئی مرد معقول مل جائے تو میں یہ کتاب ممدوح کی خدمت میں پیش کردوں لیکن ع

آن قدح بشکست وآن ساقی نماند

۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو دو مہینے کم بچاسی برس کی یہ چلتی ہوئی دل کش کہانی ختم ہوگئی۔ البتہ ہم جیسے نیازمندوں کے لیے کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔

نئی نسل والوں نے تو مولانا کو فقط ' مولانا عبدالماجد ' کی حیثیت سے جانا اور پہچانا ہے۔ وہ مسٹر عبدالماجد سے واقف نہیں ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کو یہ ناز تھا کہ "مسٹر ہوں نہ مولانا" لیکن مولانا "مسٹر" بھی رہ چکے ہیں اور "مولانا" بھی۔ نیاز فتح پوری اور عبدالرزاق ملیح آبادی پہلے مولانا تھے لیکن بعد میں "مسٹریت" کی سرحدوں کے قریب پہنچ گئے تھے اور ظاہر تو بالکل مسٹروں جیسا اختیار کر لیا تھا۔ لیکن مولانا عبدالماجد زمانے کی ہوا کے برعکس چلے اور مسٹر سے مولانا ہو گئے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ انھوں نے دور و تسلسل کا ایک چکر پورا کر لیا۔ مولانا، دریاباد کے ایک علم دوست گھرانے کے فرد تھے۔ آپ کے دادا مولوی مظہر کریم عالم دین اور مفتی شرع متین تھے۔ سن اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا اور اس جرم میں کالے پانی کی سزا پائی۔ وہاں چھ برس تک قید سخت کی مشقتیں جھیلیں اور علم و ادب کی خدمت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ وہیں عربی کی ایک ضخیم کتاب کا ترجمہ کر ڈالا۔ مقامی حکام میں ایک مستشرق بھی تھا جو مولانا کی علمیت سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے آپ کی رہائی کی سفارش کی۔ اس طرح چھ برس قید فرنگ میں گزار نے کے بعد مفتی مظہر کریم رہا ہوئے۔ عبدالماجد کے والد مولوی عبدالقادر بھی عربی، فارسی اور علوم دینیہ میں اچھی نظر رکھتے تھے۔ لیکن ان کی زندگی نذر ملازمت ہوئی۔ وقت کتنے ہی زخموں کا مرہم ہے اور پلک جھپکاتے ہی کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک انقلاب تھا کہ انگریزوں کے باغی مفتی مظہر کریم کے صاحبزادے عبدالقادر نے شان سے ڈپٹی کلکٹری کی اور گھر میں علم دین کی خدمت کا ماحول ایسا تبدیل ہوا کہ ان کے بڑے بیٹے عبدالمجید اور چھوٹے صاحبزادے عبدالماجد دونوں ہی چند دنوں عربی اور فارسی کے رسمی درس میں زانوے ادب تہہ کرنے کے بعد باقاعدہ انگریزی مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے لیکن حالات کے اس طوفان میں بھی مفتی مظہر کریم کی روح جاگتی رہی اور علوم مشرق کی تو انائیاں پھر مولانائے دریابادی کے قالب میں جلوہ گر ہوئیں۔

انگریزی تعلیم کی موجوں میں "حلقۂ صد کام نہنگ" پوشیدہ تھا اور یہ حلقہ اپنے کام سے غافل نہیں تھا لیکن قطرہ بچ بچا کے دامن صدف تک پہنچ ہی گیا جب قومی موجوں نے اس صدف کو ساحل پر پھر اچھالا تو دہن صدف کے کھلتے ہی یہ شاہوار موتی چمک اٹھا۔ گہر بننے تک قطرے پر کیا گزری یہ بھی ایک دل چسپ داستان ہے۔

مارچ ۱۸۹۲ء کا تصور کیجیے۔ تقریباً ایک صدی بیتنے کو آئی۔ عربی و فارسی کی تعلیم دہی پرانے طرز کی ہوتی جس میں سارا وقت گردانیں ہی گردانتے گزرتا تھا۔ عربی ادب یا علوم دینیہ تک رسائی کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ البتہ دینیات کے مبادیات اور کلام پاک کی تعلیم ضرور الگ سے دے دی جاتی تھی۔ کھاتے پیتے زمیندار اور دیندار گھرانوں میں ماحول بھی بہت کچھ سکھا دیتا تھا۔ شب و روز کے مذہبی اذکار اور گھر میں آنے والے رسالوں یا ذاتی کتاب خانے کی کتابوں سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا۔ نماز روزے کی پابندی لازمی تھی، گھر کے اندر قدم قدم پر اخلاقی تربیت کا سامان تھا۔ عبدالماجد کو ایک زاہدانہ اور عابدانہ ماحول وراثت میں ملا تھا۔ علمی اور ادبی چرچوں میں دن گزرتے تھے۔ اسی ماحول نے

انھیں مطالعے کا ننھے والا شوق دیا۔ ابتدائی عربی و فارسی تعلیم پر
زیادہ زور نہیں دیا گیا اور انھیں جلد ہی انگریزی اسکول میں داخل
کر دیا گیا۔ سیتاپور (یو۔پی) سے ۱۹۰۸ء میں میٹرک کولیشن (ہائی اسکول)
پاس کرنے کے بعد لکھنؤ کیننگ کالج میں داخل ہوئے۔ یہیں سے اس
دور کی ابتدا ہوئی جسے خود مولانا نے "دور الحاد" سے تعبیر
کیا۔ یہ وہی کیننگ کالج ہے جس کی بنیادوں پر لکھنؤ یونیورسٹی
بنی ہے اور جس کا ترقی پسند خیالات کے فروغ میں بڑا حصہ
رہا ہے اور جس کی گود میں سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر علیم،
احتشام حسین، سردار جعفری وغیرہ نے یا تو تعلیم پائی ہے یا تعلیم
دی ہے۔ یہ دور مولانا عبد الماجد سے تقریباً دو دہائیوں کے بعد ابھری،
لیکن یہاں کے آزاد تعلیمی ماحول میں اثرات پہلے سے کارفرما تھے۔
مولانا کی ابتدائی آزاد خیالی کسی تحریک سے وابستہ نہ تھی بلکہ ایک
انگریزی کتاب پڑھ کر غیر محسوس طور پر وجود میں آئی تھی۔ وہیں کے
کتب خانے میں تاریخ و ادب کی ایسی کتابیں بھی پڑھنے کو ملیں جس نے
انھیں روحانیت سے بیزار کر دیا۔ فلسفہ اور نفسیات کے مطالعے
نے کڑوے کریلے کو نیم چڑھا دیا اور مولانا ہی کے الفاظ میں نتیجہ یہ
ہوا کہ قلب میں الحاد و ارتیاب پیوست ہو گیا اور دماغ اپنے کو
"مسلم" کہلانے کے بجائے "ریشنلسٹ" اور "اگناسٹک" کہلانے
میں فخر محسوس کرنے لگا۔ اب سبھی ملّاؤں نے زور لگانا شروع
کیا، لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

اگر نبض مریض صرف ملّاؤں کے ہاتھوں میں رہتی تو شاید مرض کا
استیصال کبھی نہ ہو پاتا لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مسیحائی کی
مہدی افادی، مولانا محمد علی جوہر اور اکبر الہ آبادی جیسے غیر عالموں نے۔
اکبر کی بات تو پھر بھی دوسری تھی کہ ان کے بارے میں رقیبوں کو کھلے
میں رپٹ لکھوانا پڑی تھی کہ وہ اس دور الحاد میں بھی خدا کا نام
لیتا ہے، لیکن دوسرے بھی کم حاذق ثابت نہیں ہوئے اور انھوں
نے ان کے دل میں روحانیت کی بجھتی ہوئی شمع کی لو تیز کر دی۔
دس برس بعد یعنی ۱۹۱۸ء میں بدھ مذہب اور ہندو فلسفہ
کی طرف علی العموم اور تھیاسوفی کی طرف علی الخصوص توجہ ہوئی۔

مسز اینی بیسنٹ، آروند گھوش، ڈاکٹر بھگوان داس، مہاراج تلک
اور ایڈمنڈ ہومز کی کتابوں نے مادیت کی گرفت بالکل ہی ڈھیلی
کر دی۔ پھر شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی اور محمد علی لاہوری کا انگریزی
ترجمۂ قرآن پڑھنے کو مل گیا اور مولانا اپنے قول کے بموجب "از سر نو مسلمان"
ہوئے اور رسول مقبولؐ سے عقیدت، جو دور الحاد میں کم ہو چلی تھی اور
استوار اور گہری ہو گئی۔

غرض دور ارتیاب رہا ہو یا دور اعادۂ روحانیت و تقویت دینی
مولانا جس دور سے بھی گزرے مطالعہ، تحقیق اور علم کی وساطت سے گزرے۔
اپنے خیال میں بھٹکے بھی مطالعے کی بدولت اور سنبھلے بھی اسی مطالعے
کی بدولت۔ پھر جو کچھ محسوس کیا اُسے بے کم و کاست لکھ دیا۔ چنانچہ
جب آپ کی تصنیف فلسفۂ اجتماع شائع ہوئی تو علمائے
اسلام نے کفر کے فتوے صادر کیے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس پر
سب سے سنجیدہ احتجاج مہدی افادی کا تھا:

"آپ نے گو آنحضرت کی تنقیص نہیں کی تاہم اظہار خیال کی باریک
تہ میں ایک طرح کی تضحیک پائی جاتی ہے اور یہ متعلمانہ رنگ ہے،
مستشرقانہ سنجیدگی نہیں ہے۔"

لیکن یہ دور بھی گزر گیا اور اب جو دور آیا اُس کی حکایت اکبر
الہ آبادی کی زبانی سنیے:

"میں نے بے ساختہ آپ کی نسبت لکھ دیا تھا ع
آہوے دشت ہوئیم از ما سوا رمیدہ
میں خوش ہوں کہ اس کی صداقت کے آثار آپ کی صاف
اور بلند طبیعت میں نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے مکرم
ڈپٹی صاحب مرحوم کو شاید شبہ و افسوس تھا کہ لڑکا دین سے
بیگانہ ہوتا جاتا ہے، اب فرشتوں سے یہ سن کر اُن کی روح
خوش ہو گی کہ وہ لڑکا حقیقت آشنا ہوتا جا رہا ہے
اور انشاء اللہ بہت جلد کہہ دے گا ع
بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس"

اگرچہ ان منازل کی بلندیوں سے ہم "آوارۂ کوے بتاں" جو
نئی روشنی کی بدولت "آوارہ تر" ہو گئے ہیں، ابھی تک ناآشنا

رہی ہیں، لیکن اس داستان کے دہرانے اور قدرے تفصیل سے دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ اس دور کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجائے مغربی تعلیم کے زیر اثر تقلیدی مسلّمات عقائد کس تسلسل سے ہیجان کے شکار رہتے تھے، پرانی قدریں کیسے دھیرے دھیرے ختم ہوتی جارہی تھیں اور اُن کی جگہ نئی قدریں کس طرح اور کن نامعلوم دروازوں سے در آئی تھیں، ایک فرد کی ذہنی تبدیلی نے حساس اور ذی علم طبقوں کو کس طرح متوجہ کر لیا تھا اور کیسے منفی اور مثبت ردِ عمل بیک وقت پیدا ہو گئے تھے۔ مُلّا تو کفر کا فتویٰ دے کر اپنے فرض سے سبک دوش ہو گیا تھا لیکن ادیب، شاعر، مزاح نگار، سیاسی اور روشن خیال مولوی اسے راہ پر لانے کی متحدہ کوشش میں مصروف ہو گئے تھے۔ زمزمہ آہو کو سکونِ خلوت خاص سے بدل دینا، مولوی عبدالقادر ہی کا دلی منشا نہ تھا بلکہ اُن کا ذہنی کرب پورے معاشرے نے بانٹ لیا تھا۔ تصوراتی اور فکری انقلابات میں یہ منظر سبھی جگہ دیکھنے میں آتا ہے اور یہ تلاطم و ہیجان، یہ بہم خوردگی اور ٹکراؤ ایسی صورت پیدا کرتے ہیں جس سے ماضی کی کوتاہ اندیشیوں کا ازالہ ہوتا ہے اور حال کی افراط و تفریط کا مداوا۔ افراد کی بے راہ روی، انفرادی مسئلے کی حدوں سے گزر کر ایک سماجی مسئلہ بن جاتی ہے۔ یہ ذاتی واقعہ عام مورخ کے لیے سماجی تجزیے کا سامان بھی مہیا کرتا ہے اور سوانح نگار کے لیے مولانا کے کردار کا یہ اہم پہلو بھی سامنے لاتا ہے کہ وہ عقلیت کی راہ سے حسن جادے پر جا پڑے تھے وہاں سے روحانیت کے میدانوں کی طرف نکلے تو اس شان سے کہ روحانیوں نے آپ کے لیے صدر میں جگہ خالی کر دی۔ صبح کا بھولا، شام کو گھر آگیا تو اسے بھولا کون کہے گا۔ مرزا عبدالقادر کا یہ دھڑکا کہ ان کے نوجوان بھتیجے نے بے راہ روی اختیار کر لی ہے، پدرانہ شفقت کا پیدا کردہ تھا ورنہ مولانا صحیح معنوں میں کبھی بھٹکے نہیں تھے۔ ان آزاد فضاؤں کی سیر نے ان کی اعتقادی نظر میں تازہ وسعت پیدا کی اور آنے والے اعتقادی طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے ان میں نئی توانائی اور قدرت پیدا کر دی۔ کل کا

مجدّد اور متشکک تازگی ایمان کا مینارہ بن گیا۔

جس زمانے میں طبیعت مادیت سے روحانیت کی طرف راجع ہو رہی تھی، تقریباً اسی زمانے میں "تحریک خلافت" کا بھی آغاز ہوا اور مولانا ترکِ موالات اور سیتہ گرہ کی تحریکوں کے روحانی پہلوؤں سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنے ذمے یہ فرض لے لیا کہ مغربی تہذیب و تمدن، تعلیم و تصورات سے متاثر ہونے والے نوجوانوں کی رہنمائی کریں گے اور انھیں مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد کریں گے اور مشرقیت کی کشتی کو آنے والے طوفانوں سے بچائیں گے۔ تھوڑی تھوڑی دور ہر راہرو کے ساتھ چلنے کا دور ختم ہو چکا تھا اور اب عبدالماجد نے اپنی منزل پالی تھی۔ یہ بھی مفتی مظہر کریم کی سیاسی وراثت کی بازیافت تھی۔ اس میدان میں بھی آپ نے کچھ دنوں حصہ لیا اور اودھ کی "خلافت کمیٹی" کے صدر رہے۔ قیدِ فرنگ کا ورثہ البتہ نہ مل پایا۔ اپنے بڑھتے ہوئے مذہبی مشاغل اور عالمِ گوشہ نشینی کے باعث انھیں اس دور کے تمام سیاسی محرکات کا قریبی جائزہ لینے کا موقع نہ ملا۔ سیاست سے ظاہری ربط اُن کی زندگی بھر کی کھدر پوشی سے برابر ظاہر ہوتا رہا۔ کھدر کا علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ قمیص اور صدری یا اسکٹ کے اوپر سرخ رنگ کے کھدر کی عبا کے علاوہ کھدر ہی کی ٹوپی بھی پہنتے تھے جو عام گاندھی ٹوپی سے دیوار کی چوڑائی کے اعتبار سے مختلف تھی۔ لیکن مولانا محمد علی کی ٹوپی سے اونچائی میں ملتی جلتی تھی۔ مولانا کا ظاہر محمد علی جوہر کے ظاہر سے اتنا ملتا جلتا تھا کہ آپ کو دیکھتے ہی حضرت جوہر کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ ٹوپی کی دیوار کی بلندی میں خفیف کمی اور ہلالِ نو کا فقدان محسوس بھی نہ ہوتا تھا۔

مولانا محمد علی سے مشابہت تمام تر محض اتفاق نہیں ہے بلکہ قربتِ خاص کے واسطے سے اکتسابی بھی ہے اس کی تفصیل کے لیے مولانا نے محمد علی کی جو سوانح عمری لکھی ہے اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ محمد علی اور عبدالماجد میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ اول الذکر ادیب اور شاعر ہوتے ہوئے بھی سیاست ہی کے

مرد میدان بنے رہے اور آخر الذکر سیاست سے قریبی لگاؤ رکھنے کے باوجود علم و ادب کے دریاؤں کی شناوری ہی کرتے رہے۔ اگر اس فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو ظاہری اور باطنی دونوں ہی اعتبارات سے آپ دونوں میں مجانست تام نظر آئے گی۔ دونوں ہی سیاست کے میدان میں خلافت کی بدولت آئے دونوں ملکی مسائل میں مسلمانوں کے موقف پر زیادہ زور دیتے رہے اور بے باکی سے اظہار خیال کرتے رہے۔ دونوں ہی سیاست و ادب کے کارواں میں بیک وقت شریک رہے اور دونوں ہی نے صحافت کی سرحدیں ادب عالیہ سے ملا دیں۔ مسلم سیاست سے جذباتی وابستگی کی بدولت دونوں ہی جذباتی سیاست میں بھی بعض اوقات الجھ گئے لیکن مولانا محمد علی عمل کے معاملے میں انتہا پسند تھے جبکہ مولانا عبدالماجد اعتدال کا مرقع تھے، اعتدال بھی ایسا جس کی سرحدیں سیاسی بے عملی سے مل جاتی ہیں۔ مسلم لیگ سے بھی ایک زمانے میں ایسی ہی بے عملی کا تعلق تھا۔ اس جماعت میں انھوں نے اتنا بھی حصہ نہیں لیا جتنا وہ تحریک خلافت میں لے چکے تھے۔ دراصل عملی سیاست ان کے بس کا روگ نہ تھی اور وہ بہت جلد اس خارزار سے دامن بچا کر نکل آئے، جو جذباتی وابستگی باقی رہی بھی اسے جماعتی پیمانوں سے ناپنا مشکل ہے۔ وہ ملک کے مداح تھے، وہ جواہر لال نہرو کے ثنا خواں تھے، وہ محمد علی جناح کے مذہبی انحرافات کے ناقد تھے، لیکن وہ ملک ’گاندھی اور نہرو پر بھی نکتہ چینی کرتے تھے اور جناح و ابوالکلام آزاد کے معترف بھی تھے۔ خود مجھے اُن کی سیاست کی جذباتیت پر اکثر اعتراض ہوا اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ وہ مذہبی بنیادوں پر جس سیاست سے بعض اوقات وابستگی کا اظہار کر جاتے ہیں اس کا فائدہ ملت کو نہیں بلکہ غیر ملکی اور سامراجی مفادوں کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ اظہار ”آپ سے ملیے“ نامی کتاب میں واضح طور پر موجود ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد چودہ برس تک میں برابر مولانا ممدوح کی خدمت میں نیازمندانہ حاضر ہوتا رہا اور انھوں نے کبھی ناراضمندی یا کبیدگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ میرا خیال ہے کہ ان کا کرم وسیع تر ہی ہوتا گیا۔

پاکستان بننے کے بعد علما اور ادبا کا ایک قافلہ بڑی تیزی اور بڑے انہماک سے عازم پاکستان ہوا۔ کچھ کو وہاں والوں نے بلایا اور کچھ خود سے قسمت آزمائی کے لیے نکل پڑے۔ مولانا کو بھی وہاں سے کئی بلاوے آئے اور بعض صاحبان اقتدار نے بڑا اصرار کیا۔ ایک بار ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے سابق گورنر جنرل غلام محمد صاحب کے بلانے پر وہ پاکستان گئے لیکن ایک ہفتے کراچی اور تین روز لاہور میں قیام کے بعد واپس آ گئے۔ پھر ۱۹۵۷ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی مذاکرے میں شرکت کے لیے گئے لیکن کبھی وہاں رُکے نہیں۔ ایک ہندستانی کے لیے ہندستانی بنے رہنا، فخر کی بات ہے، لیکن غیر ملکیوں کی ترغیب و تشویق کے باوجود اپنے وطن کی وابستگی کو ظاہری فوائد پر ترجیح دینا زیادہ بڑے فخر کی بات ہے۔ علما اور ادبا کی صف میں کئی ایسے ہیں جو اس امتحان میں پورے نہ اتر سکے لیکن مولانا کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔

سیاست ہی کی طرح میلان طبع کچھ دنوں ملازمت کی طرف بھی لے گیا۔ آپ نے کچھ دنوں ریاست حیدرآباد کے دارالترجمہ میں ملازمت بھی کی تھی، اس کے پہلے چند دنوں کے لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے معاون کی حیثیت سے بھی کام کیا لیکن طبع رواں کچھ اور وسعتوں کی تلاش میں تھی۔ ملازمت ترک کی اور تا عمر ایسے جھمیلوں کے قریب نہیں گئے۔ اُن کو تعلیمی اور ادبی مشاغل کے جاری رکھنے کے لیے حیدرآباد سے جو وثیقہ ملتا تھا اس سے انکار نہیں کیا۔

سیاست و ملازمت، بقول انیسؔ ع

کچھ نکا ہوا کا تھا ادھر آیا اُدھر گیا

صحافت و ادب وہ ایسے مشاغل تھے جیسے انھوں نے مدت العمر ہوتا نہ ایسے عمر کی تیز رفتاری گھٹا پائی نہ جواب دیتے ہوئے قویٰ۔ جن اداروں سے ان کی وابستگی باقی رہی وہ ادبی اور مذہبی ہی تھے۔ دارالمصنفین، ہندستانی اکیڈمی الہ آباد، انجمن اردو لکھنؤ، اتر پردیش

اردو اکاڈمی وغیرہ ایسے ادارے ہیں جن سے آپ برابر وابستہ رہے ہیں۔ صحافت سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ جب بارہ برس کے تھے تبھی سے مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ وکیل امرت سر، الندوہ، الناظر، معارف وغیرہ میں مستقل مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں ہفت روزہ سچ مولانا ظفر الملک کی شرکت میں نکالا پھر صدق جاری کیا جو تھوڑی سی ترمیم کے بعد اب صدق جدید ہو گیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد سے بھی وابستہ رہے۔ مولانا کی صحافت عام صحافت سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ ان کا محور بیشتر ادبی اور اخلاقی موضوعات رہے ہیں اور جس حربے سے مولانا نے سب سے زیادہ کام لیا ہے وہ طنز کا ہے اور اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں طنز کے اس سے زیادہ کامیاب تجربے کسی اور نے نہیں کیے ہیں۔ اس سے پہلے بھی صرف ایک اہم نام اکبر الٰہ آبادی کا آتا ہے۔ دونوں ہی مغربی زندگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں لیکن جہاں اکبر کی اپیل سراسر جذباتی ہے۔ مولانا سے دریابادی کے یہاں عصری تقاضوں کا بھی گونہ احساس پایا جاتا ہے۔ عبارت دونوں ہی کی سہل ممتنع ہے اور دونوں جا بجا رعایت لفظی کا سہارا بھی لیتے ہیں لیکن مولانا کے یہاں حسین تلمیحات، مناسب اقتباسات اور دلنشین استعارات کا متناسب امتزاج اُن کی عبارت کو سحر حلال بنا دیتا ہے۔ عبارتوں میں بلا کی شوخی ہوتی ہے، مزاح نہیں۔ وہ شوخی کو مزاح پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ شوخی میں مزاح کی بہ نسبت توازن زیادہ ہوتا ہے۔ اس شوخی کی لذت آفرینی کو مولانا ہی کے لفظوں میں سنیے:

"قہقہہ آفرینی نہیں بلکہ ایک انبساطی کیفیت جو بہت پھیلی تو ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرائی اور بس۔ یہ محرک قوی نہیں جو حرارت جسم کو اشتعال میں لے آئے، صرف مسکتی جو سرّ کی ہلکی ٹھنڈک جسم میں دوڑا دے۔ وصال نہیں، صرف خیالِ وصل، بقول شخصے ع

خیال ہی میں مزے وصل دلربا کے لیے"

اس سلسلے میں آپ کی "سچی باتیں" خصوصیت سے مشہور ہیں۔ میں نے اپنی کتاب "اب سے پہلے" میں آپ کے جذبۂ احتساب کا تذکرہ خاص طور پر کیا تھا۔ "سچی باتیں" وہ چھوٹا سا روزن ہے جس سے مولانا اپنے اطاق تنہائی سے باہر کی دنیا کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اس لنگڑی لولی دنیا میں احتساب کے لیے بڑا میدان پڑا ہے۔ اس اونٹ کی کون سی کل سیدھی ہے۔ کسی شخص کے لیے یہ ناممکن ہے کہ اس دنیا کا ہمہ گیر احتساب کر سکے۔ مولانا کا احتساب مذہبی اور اخلاقی ہے۔ جب وہ اپنے حجرے سے جھانکتے تو انھیں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا اور ان کا قلم چل پڑتا۔ ایسا احتساب دنیا سے الگ تھلگ رہ کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ مولانا نے اپنے طنز سے اس احتساب کا بیڑا اٹھایا۔ کسی ملک میں طلاقوں کی تعداد بڑھ جائے، کسی اسلامی ملک میں نوجوان لڑکیاں بے پردہ اسٹیج پر آ جائیں (معاف کیجیے گا اسٹیج پر آئیں گی تو بے پردہ تو ہوں گی ہی)، مصر و پاکستان میں آزاد خیالی کے مظاہرے ہوں، زیردستوں پر کہیں زیادتی ہو، ہندوستان میں قول و عمل کا کہیں تضاد نظر آئے، مولانا خوردبین لگائے سب دیکھتے رہتے ہیں اور انھیں اپنے طنز کے تیروں کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ جذبۂ احتساب کے جوش میں مولانا نے "سچی باتیں" سے باہر نکل کر بڑی قلمی جنگیں کی ہیں ان میں سے دو کا عینی شاہد میں بھی رہا ہوں۔ ایک تو ۱۹۳۵ء میں جب انگارے کی اشاعت ہوئی، تو مولانا نے قلمی جہاد کا آغاز کیا۔ انگارے کے مصنفین میں سجاد ظہیر اور احمد علی نمایاں تھے۔ پرانے زمانے میں تو "ریش بابا" سے بازی کرنے والوں کو بھی بری نظر سے دیکھا جاتا تھا اور یہاں تو بات اس ذات تک جا پہنچی تھی جہاں صفات و ذات کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ مولانا نے پورا زورِ قلم صرف کر دیا۔ یہاں تک کہ سجاد ظہیر کے حقیقی چچا شبیر حسن قتیل صاحب بھی اپنے بھتیجے کے خلاف میدان میں اتر پڑے اور پھر ان حضرات نے انگارے کو ضبط کرا کے ہی دم لیا۔

دوسرا شدید ہنگامہ یگانہ چنگیزی کی رباعیات کو لے کر ہوا۔ ان رباعیوں کی دل آزاری کے لیے ثبوت درکار نہیں تھا۔ یہ

یہ اس وقت تک کہیں شائع نہیں ہوئی تھیں لیکن یگانہ نے چھیڑنے کی خاطر یہ رباعیاں (جو ظاہر ہے کہ کہیں پڑھی نہیں جا سکتی تھیں) مولانا کے پاس بھیج دیں یا کسی طرح مولانا کے ہاتھ آ گئیں۔ کافی پرانی بات ہوئی اس لیے مجھے تفصیلات تو ٹھیک سے یاد نہیں رہ گئیں۔ ان پر ہر طرف سے احتجاج اور غم و اضطراب کی آوازیں بلند ہو پڑیں اور یگانہ کو اپنی گستاخیوں کا بھگتان اسی دنیا میں بھگتنا پڑا۔ عوام قانون اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اگر بروقت مداخلت نہ کی گئی ہوتی تو شاید صورتِ حال اور خطرناک ہو جاتی۔

ان دو موقعوں پر گل افشاں قلم کی شعلہ افشانیاں میں دیکھ چکا ہوں لیکن ایسے مواقع شاذ تھے۔ فرقوں اور مذہبوں کے درمیان اتحاد بھی آپ کا محبوب موضوع رہا ہے اور اس کی طرف میں شروع میں اشارے کر چکا ہوں۔ لکھنؤ جیسے مخرب ماحول میں جہاں اچھے خاصے لوگ سنی شیعہ تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں، مولانا کے حلقۂ احباب میں اثرؔ لکھنوی، علی عباس حسینی، مسعود حسن رضوی ادیب، اختر علی تلہری، احتشام حسین، جیسے شیعہ موجود تھے۔ جب وہاں کھنچاؤ اور تضاد کی شکل سنگینی اختیار کرنے لگی تو دوسرے عمائدِ قوم کے ساتھ مل کر اتحاد و اتفاق کی ایک اپیل شائع کی تھی۔ آپ کے قلم سے مختلف فیہ مسائل پر بھی دل آزار باتیں نہیں نکلتی تھیں بلکہ اتحاد ملی کا درد ایک ایک لفظ سے نمایاں ہوتا تھا۔

یہ مولانا عبدالماجد دریابادی، ۱۹۲۰ء کے آس پاس 'مسٹر' سے 'مولانا' بننا شروع ہوئے تھے اور اس کے لیے انھوں نے بڑا ریاض کیا تھا۔ لباس، وضع قطع مذہبی ہو گئی تھی، داڑھی بڑھائی تھی، نماز روزے کی پابندی اور بڑھ گئی تھی۔ مزار محبوب الٰہیؒ پر چلّہ کشی کی تھی، محافل سماع میں شرکت کرنے لگے تھے، روحانی مشقت و ریاض و فکر کی منزلوں سے گزر رہے تھے، مذہبی کتب سے شغف بڑھایا تھا۔ روحانیات کے مدارج طے کیے تھے، مراقبہ و مکاشفہ کے ساتھ مشاہدہ و مطالعہ بڑھ گیا تھا اور تنظیم اوقات کے باوجود تقریباً سارا وقت مطالعے میں صرف ہونے لگا تھا۔ اور پھر یہ معجزہ دیکھنے میں آیا کہ کل کا ملحد آج کا مفسر بن گیا۔ تفسیر و متعلقاتِ تفسیر، تصوف، اخلاق، حدیث و ادعیہ اور مواعظ ان موضوعات پر ایک دفتر مولانا نے یادگار چھوڑا ہے۔ مانا کہ باقاعدہ درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کی، دستار بندی نہیں ہوئی، آپ نے کبھی فتوے نہیں دیے اور نہ مفتی ہونے کا دعویٰ کیا، لیکن یہ سب علم ناپنے کے پیمانے بھی کب ہیں؟ ارباب جبہ و دستار چاہے جو بھی کہیں لیکن اس ترک و ہلک کے ماہر علوم دینیہ، ان کی صفوں میں کتنے ہوں گے؟ مولانا عبدالماجد جیسا علمی تبحّر اور تنوع شاذ ہی ہمارے علما کے حصے میں آیا ہوگا، کتنے ہیں جو علوم مشرق کے ساتھ علوم مغربی میں بھی دستگاہ رکھتے ہوں ــــ آپ کو مولانا نہیں بلکہ علامہ کے لقب سے یاد کرنا زیادہ زیب دیتا ہے کیونکہ در حقیقت ادیب علماء میں آپ علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سلیمان ندوی کی صف کے عالم ہیں۔ اس وقت آپ 'دارالمصنفین' جیسے بلند پایہ علمی ادارے کے صدر تھے اور پہلے مدتوں اس کے رکن اور معارف کی مجلس ادارت کے ہنما رہے ہیں۔

اب تک آپ کی ۹۴ سے اوپر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ (الف) صوف میں (۱) تصوف اسلام اور (۲) فیہ مافیہ۔ (ب) تفسیر اور متعلقاتِ تفسیر میں (۱) تفسیر ماجدی (انگریزی) (۲) ترجمہ قرآن (انگریزی بغیر حواشی) (۳) تفسیر ماجدی (اُردو) (۴) تفسیر ماجدی کا دوسرا اڈیشن (مع اضافہ کئی جلدوں میں) (۵) جغرافیہ قرآن یا ارض القرآن (۶) حیوانات قرآن یا الحیوانات فی القرآن (۷) شخصیات قرآنی یا اعلام القرآن (۸) جدید قصص الانبیا کے دو باب (۹) بشریت انبیاء (۱۰) خطبات ماجدی یا سیرۃ نبوی قرآنی (۱۱) مشکلات القرآن یا قرآن کا مطالعہ (تکرار کا مجموعہ) (ج) حدیث و ادعیہ: (۱) ترجمہ و شرح مناجات مقبول تھانوی (۲) شرح چہل حدیث ولی اللّٰہی (د) فلسفہ منطق، نفسیات: (۱) فلسفہ جذبات (۲) فلسفہ اجتماع

(۳) سائیکالوجی آف لیڈرشپ (۴) مکالمات برکلے (۵) فلسفیانہ مضامین (۶) مبادی فلسفہ (حصہ اول) (۷) مبادی فلسفہ (حصہ دوم) (۸) فلسفہ اور اس کی تعلیم (۹) ہم آپ (۱۰) منطق (ھ) تراجم: (۱) تاریخ اخلاق یورپ (۲) تاریخ تمدن (حصہ دوم) (۳) تاریخ یورپ (۴) پیام امن (د) سفرنامے: (۱) ڈھائی ہفتے پاکستان میں (۲) سفر حجاز (ت) سوانح:- (۱) محمد علی (۲) حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات (مولانا اشرف علی تھانوی کی ضخیم سوانح عمری) (ج) مجموعہ مضامین (۱) مردوں کی مسیحائی (۲) سچی باتیں (سچ اور صدق میں نکلنے والی سچی باتیں) (۳) صاحب رسولؐ (۴) یتیم کی جیت (۵) یتیم کا راج (۶) تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام (۷) تمدن اسلام کی کہانی (ط) ادبی: (۱) زود پشیماں (ڈرامہ) (۲) مثنوی بحرالمحبت (۳) مقالات ماجد (۴) انشائے ماجد (حصہ اول و دوم) (۶) نشریات ماجد (حصہ اول) (۷) مضامین عبدالماجد (۸) اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں (۹) مکاتیب اکبر (۱۰) مکتوبات سلیمانی (حصہ اول) (۱۱) مکتوبات سلیمانی (حصہ دوم) (۱۲) خطوط مشاہیر (حصہ اول) (ی) متفرقات: تحفۂ خسروی (۲) قرآن و الدین (۳) مشاہیر سائنس (۴) خطبہ صدارت استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس لکھنؤ، ۱۹۲۷ء (۵) نورانی جہیز (ک) شروع میں دو مقالے بھی رسائل کی صورت میں شائع ہوئے تھے (۱) محمود غزنوی اور (۲) غذائے انسانی۔ اس موقع پر مجھے جگر مرادآبادی کا ایک شعر یاد آتا ہے

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا شیشہ اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

آج واعظ کی کتابیں فضا میں بلند ہیں اور ادھر سے بھی برق چمکتی نظر آرہی ہے۔ ایک نہیں بلکہ بیک وقت چالیس پچاس بجلیاں لہرا رہی ہیں۔ مولانا جس موضوع پر بھی فلسفہ و منطق ہو یا تفسیر فلسفہ وہ ایک ادب پارہ ہے۔ قدم قدم پر نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں، نئی کلیاں کھلتی ہیں اور لفظوں میں نئی جان معانی جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ کشت زہد کی آبیاری بھی جمالیات سے کرتے ہیں "مشاہدۂ حق کی گفتگو" ہو تو بھی مولانا کے قلم سے قلقل مینا کی آواز آتی رہتی ہے۔ شیشے کھنکتے ہیں شمعیں روشن ہوتی ہیں، ساقی جام بدست و سبو بردوش حافظ و خیام درومی سے آنکھیں ملاتا ہے لیکن وہ اس کے باوجود تصنع اور بے جا عبارت آرائی سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ اسی حسن بیان نے اُن کی تحریروں میں بڑی شگفتگی، روانی اور سلاست پیدا کر دی ہے۔ وضاحت اور ایجاز کا برمحل صرف بھی انھیں خوب آتا ہے۔ جہاں وہ احتسابی زبان استعمال نہیں کرتے وہاں اُن کے استدلال میں دل سوزی یعنی والی سادگی اور پرکاری آجاتی ہے۔

فکری اعتبار سے ان کی دین یہ ہے کہ انھوں نے تعقل کے دروازے بند نہیں کیے اور نئی صداقتوں کی روشنی میں نئی راہیں ڈھونڈھنے پر چیں بہ جبیں نہیں ہوئے۔ انھوں نے مادیت کی نفی نہیں کی بلکہ مادیت کی تہ میں دبی ہوئی روحانی معنویت کی تلاش کو انسانی حیات کا بہتر مقصد قرار دیا اور اس طرح آیندہ تفکر کے لیے راہیں کھلی رکھیں مذہب کی دنیا میں یہ کشادگی نئی نسل کے لیے فال نیک ثابت ہوئی کیونکہ وہ مزعومات اور توہمات کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوئی اور اس میں تاریخی اور منطقی شعور زیادہ تیز ہوا۔

ادبیات میں بھی یہ دور بڑی دُور رس تبدیلیوں کا رہا ہے۔ اسی دور میں پہلے ترقی پسند تحریک کا اور بعد میں عدم مشروطیت کا غلغلہ بلند ہوا۔ مولانا کے مذہبی اعتقادات کا حال سب کو معلوم ہے لیکن اس کے باوجود عام ترقی پسندوں کی طرف ان کا رویہ معاندانہ نہیں رہا۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے سجاد ظہیر، رشید جہاں اور احمد علی کو اُن کے "انگارے" پر اپنے شدید ترین احتساب کا نشانہ بنایا، لیکن انھیں نے احتشام کو حالی کے بعد اردو کا سب سے بڑا نقاد بھی کہا۔ اس سے ان کی ادبی نگاہ کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

اترپردیش اردو اکاڈمی کی کئی مجلسوں میں مولانا کے ساتھ شرکت کا موقع ملا۔ وہاں بھی مولانا کی رائے دوٹوک اور بے غل و غش ہوتی تھی اور اس میں ہمیشہ اعتدال و توازن ہوتا تھا۔ یہ اعتدال ان کی طبیعت کا خاصہ بن چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ بے انتہا حساس

ہونے کے باعث آپ پر اکثر غصے کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا، لیکن تیز ہوا کے جھونکے کی طرح رکتا نہیں جاتا تھا۔ ادھر آیا، ادھر گیا۔ غصہ روکنے میں "کاظمین غیظ" کی صفت کے ضبط کرنے والے تھے۔ کبھی طبیعت کو بے قابو نہیں ہونے دیتے تھے۔ جب غصہ فرو ہوتا تو غصے کی یہ ہلکی سی لہر بھی اُن کے نیک اور پاک ضمیر میں کھٹکتی اور وہ فوراً اس کی تلافی کر دیتے تھے۔ البتہ اخلاقی اور مذہبی معاملے میں رفع و در گزر کے قائل نہیں تھے۔

مولانا وقت کے بڑے پابند تھے۔ انھوں نے اپنے لیے ایک نظام اوقات مرتب کر لیا تھا اس میں حتی الوسع کوئی ردو بدل بھی نہیں ہونے دیتے تھے بلکہ اپنے اعزا تک پر نظام اوقات کی پابندی کے لیے زور دیتے۔ جب گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر رہتے تو اُن کے لیے فوراً ایک ٹائم ٹیبل ترتیب دیا جاتا جس میں بیداری سے خواب کے درمیانی وقفے میں نماز، ناشتہ، کھانا، تحصیل، تقریری مقابلہ سب کے لیے وقت مقرر ہو جاتا۔ انھوں نے روزمرّہ کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ ان کے عزیز بھیجے اور قریبی دوست بھی ان کے مقررات میں تبدیلی نہیں لا سکتے تھے۔ گوشہ نشینی نے ان کو خلوت کے وسیع لمحے عطا کیے تھے اور اس کا بیشتر حصہ وہ تصنیف و تالیف و مطالعہ میں یا مخلصوں اور دوستوں کے خطوں کا جواب دینے میں صرف کرتے تھے۔ تنہائی اور کشمکش کے ان لمحوں میں کسی کا بھی دَرّانہ چلے آنا حسن و لطف کی اس فضا کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان محفلوں میں جو لوگ سادت ناچاہتے کہ شاید ان کی حق تلفی یا اُن کے ساتھ کی توہین ہو رہی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ایک ہی ساتھ ہر محفل کی فضا سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ اس گوشہ نشینی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انھوں نے ترک لذات کر لیا تھا۔ انھوں نے زندگی کی لذتوں کو قریب سے دیکھا ہے اور حیات کا یہ عرفان، یہ ضبط نفس، فضا سے ہم آہنگی کا خیال اور انضباط اوقات اُن کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ زندگی میں وہ ہنسے بھی ہیں اور روئے بھی ہیں۔ آمرزش روحانی کے ساتھ ورزش جسمانی کا بھی خیال رکھا ہے۔ اگرچہ دن بھر مشغول دل و دماغ روشن رکھی ہے تو کبھو کی ٹھنڈی چاندنی میں آرام بھی کیا ہے۔

مولانا کی چھوٹی سی گھریلو زندگی بھی رہی ہے۔ اولاد ذکور میں کوئی بھی نہیں ہے لیکن لڑکیاں چار ہیں اور سبھی آپ کے بھتیجوں کو منسوب ہیں۔ جیسی سادہ زندگی بسر کی تھی اسی سادگی سے شادیوں کے مراسم بھی انجام دیے۔ شادی کے موقع پر بھی ادبی خدمت کا پہلو نکال لیا۔ ہر نکاح پر آپ ایک مخصوص خطبہ لکھتے اور محفل عقد کے سامنے پڑھتے تھے۔ بیوی سے بھی ویسی ہی محبت کرتے تھے اور اکثر سفروں میں وہ شریک سفر بھی ہوا کرتی تھیں۔ اس خانگی محبت کا ایک بار مہدی افادی نے یوں ذکر کیا تھا:

"آپ لکھتے ہیں 'اب وقت اپنا ہے، فکر اپنا ہے، دماغ اپنا ہے۔' ایک صاحبہ فرماتی ہیں، 'یہ کیوں نہیں لکھتے، بیگم اپنی ہیں'۔" یہ نکتہ رہ گیا تھا، کمی پوری کیے دیتا ہوں۔ "اس رشتے کی لطافت کے مولانا شروع سے قائل تھے اور مہدی افادی کی طرح کے دوستوں کو شریک راز بھی بنائے رہتے تھے۔ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ایک بار لکھنؤ سے (باندہ) سسرال جا رہے تھے۔ سالیاں بھی ساتھ تھیں، سونے پہ سہاگہ ریل کا سفر فطری طور پر دلچسپ رہا۔ اس کا تذکرہ مولانا نے ایک خط کی وساطت سے مہدی افادی سے کیا۔ "آپ کا پرستان سفری، وہ بھی تخت رواں (ریل) پر بہت ہی قابل رشک رہا۔" آگے چل کر مہدی افادی نے "جنس لطیف کی پاکیزہ کا فراوانی" کا بھی ذکر کیا ہے۔ معلوم نہیں مولانا نے کیا لکھ دیا تھا کہ مہدی افادی یوں چل نکلے۔

مولانا کی زندگی کے کئی پہلو ہیں اور اس پہلو دار زندگی پر لکھنے کے لیے وقت چاہیے، بنیادی مواد چاہیے۔ یہاں سٹہیرات میں بیٹھ کر دونوں کی کمی شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ خورشید احمد صاحب مدیر "نیا دور" کا اصرار شدید ہے کہ فوراً کچھ لکھ بھیجو، بکھرے ہوئے خیالات کا سمیٹنا مشکل ہو رہا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ پھر بھی اردو کی ادبی دنیا میں ایسی نابغہ شخصیت مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ آگے آنے والے بہت کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی نہ ہوں گے۔ وہ اپنے ساتھ ایک پورا عصر، ایک پوری فضا، ایک پورا ماحول لے گئے ۔ رہے نام اللہ کا ۔

★

نہال رضوی

یادِ علامہ ماجد

کارواں اہلِ قلم کا ہو گیا بے سربراہ
ہجرِ ماجد سے ہر اک دل کا ہے شیرازہ تباہ

کیا بیاں ہوں بے مروت موت کی بے رحمیاں
رات دن یہ لوٹتی ہے زندگی کی بستیاں

یہ بھی اک اس کے سلوکِ ناروا کا ہے اثر
رقص کرتی ہیں، چمن اندر چمن بے کیفیاں

اس کی آنکھوں کو مروت سے نہیں کوئی لگاؤ
اس کے حسنِ کار میں شامل ہیں حشر انگیزیاں

جو کسی طاقت کے بھی روکے سے رک سکتی نہیں
چلتی ہیں وہ اس کے دامن کی ہوا سے آندھیاں

قید روز و شب بھی اس کی راہ میں حائل نہیں
بے تکلف اس نے لوٹے زندگی کے کارواں

جس کی کرنیں دور کرتی تھیں اندھیرے جہل کے
گل کیا ہے ایک اس نے وہ چراغِ ضوفشاں

کیوں نہ ہو اس کے فراقِ دائمی کے غم سے
آہ بر لب، درد در دل، محفلِ دانشوراں

موت نے چھینا، اسے ہم سے بطرزِ راہزن
وہ کہ جس کی شخصیت تھی خود بجائے انجمن

ہائے ہم سے چھٹ گیا وہ عالمِ علم کلام
بخشا رہتا تھا جو ہم کو شعورِ واقعی

اس مفسر، اس مولف، اس مصنف کی حیات
جس کے مکتوبات وارشادات کی تابندگی

دور کر دیتی تھی ذہنوں سے جہالت کے نقوش
جس کے افکارِ جمیلہ کی مقدس روشنی

مختصر جملوں میں، معنی و بیان کی کائنات
وہ سمو دیتا تھا، اس کی بات تھی کچھ اور ہی

داغِ فرقت دے کے ہم کو بے مروت موت نے
چھین لی اردوئے صحافت سے، تجلی چھین لی

آج ہم میں وہ نہیں ہے اس کی تحریریں تو ہیں
اس کی تحریروں سے ہم حاصل کریں گے رہبری

اس کے زریں مشوروں سے ہو گئے محروم ہم
اس لیے محسوس ہوتی ہے بہت اس کی کمی

مخلصِ اردو کی رحلت سے ہوا یہ انقلاب
آسمانِ علم و دانش ہو گیا بے آفتاب

صباح الدین عمر

مولانا عبدالماجد دریابادی، بہ یک وقت مفسر قرآن بھی تھے، ادیب بھی، ناقد بھی اور صحافی بھی۔ لیکن اگر ان کی ادبی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ بنیادی طور پر صحافی تھے۔ اب سے تقریباً ۷۴ برس پہلے، ان کا ایک مراسلہ ۱۹۰۴ء میں، جب کہ وہ صرف بارہ برس کے تھے (پیدائش: ۱۸۹۲ء) لکھنؤ کے مشہور روزنامے اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اردو کے تقریباً ایک درجن سے زیادہ روزناموں، ہفتہ وار اخبارات اور ماہانہ رسائل میں ان کا قلم کچھ نہ کچھ گوہر باری کرتا رہا، مضمون، کبھی علمی اور سیاسی ہوتے تو کبھی ادبی، کبھی مذہبی۔ کبھی ایڈیٹوریل نوٹ لکھتے اور کبھی تنقید اور تبصرے۔ دو ہفتہ وار اردو اخبارات سچ اور صدق (بعد میں صدق جدید) کے تو وہ باقاعدہ ایڈیٹر ہی تھے مگر ان کے علاوہ جن اردو اخبارات اور جرائد میں کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے مراسلے، نوٹ، تبصرے اور مضامین نکلتے رہے ان کے نام یہ ہیں: اودھ اخبار، ضیاء الاسلام، وکیل، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، الناظر، الندوہ، العصر، ادیب، صبح امید، معارف، ہمدم، ہمدرد، حقیقت۔ (ان اخبارات و رسائل کے بارے میں آگے چل کر اپنے معلومات کی بنیاد پر یا تو مضمون ہی میں یا فٹ نوٹوں میں مختصر الفاظ میں کچھ وضاحت کردی گئی ہے) جس فرد کے مضامین، ایڈیٹوریل، نوٹ، تبصرے، وغیرہ ۷۴ برس کی طویل مدت تک مختلف رسائل و اخبارات کے صفحات کی زینت بنتے رہے ہوں، جس ہستی نے ایڈیٹری یا مضمون نگاری کے علاوہ بعض اہم اخبارات کے مہتمم کی حیثیت سے بھی کام کیا ہو اور جس نے ایک طویل مدت تک دو نہایت مشہور و معروف ہفتہ وار (سچ اور بعد میں صدق و صدق جدید) کی ادارت ہی نہ کی ہو بلکہ اس کے تقریباً سارے صفحات صرف اس کے قلم کے رہین منت رہے ہوں، اسے بنیادی طور پر صحافی ہی تسلیم کرنا پڑے گا اور صحافی ہی نہیں بلکہ اس کی مخصوص طرز نگارش کی بنا پر "صاحب طرز صحافی"!

مولانا عبدالماجد نے اردو ہی میں نہیں، بعض انگریزی اخبارات و رسائل میں بھی مراسلہ نگاری اور مضمون نگاری کی۔ ایسے اخبارات و رسائل کی فہرست یہ ہے: انڈین ڈیلی ٹیلی گراف لکھنؤ۔ ایڈووکیٹ (لکھنؤ)۔ نیچر (لندن)، سنڈے ریویو (لندن) ایسٹ اینڈ ویسٹ (بمبئی)، تھیاسوفسٹ (مدراس) ماڈرن ریویو (کلکتہ) انڈین ریویو (مدراس) وغیرہ۔ انڈین ڈیلی ٹیلی گراف، جو آئی۔ ڈی۔ ٹی کے نام سے مشہور تھا، لکھنؤ کا روزنامہ تھا۔ ایڈووکیٹ، لکھنؤ کے مشہور سیاسی اور سماجی کارکن

اس مضمون کی تیاری میں، مولانا عبدالماجد کے بڑے بھتیجے، حکیم عبدالقوی صاحب سے جو خود بھی ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں، جو بیش بہا تعاون ملا ہے، اس کا اعتراف ناگزیر ہے۔ مولانا عبدالماجد کی نجی اور ادبی زندگی کے متعلق حکیم صاحب کو جتنا کچھ معلوم ہے، وہ کسی دوسرے کو نہیں۔

منشی گنگا پرشاد ورما کا ہفتہ وار اخبار تھا۔ نیچر؛ لندن کا سائنسی جریدہ تھا۔ سٹوڈے ریویو بھی لندن کا مشہور اخبار تھا، باقی جریدے ہندستان میں شائع ہوتے تھے۔ ماڈرن ریویو میں، مولانا کے قلم سے اکثر اردو کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان تبصروں کے آخر میں مولانا کے پورے نام کی جگہ "اے۔ ایم" (A.M) لکھا ہوتا تھا۔ اسی رسالے میں مولانا کے کچھ اور مضامین کے علاوہ گاندھی جی کی ستیہ گرہ کی تائید میں ایک مضمون "ستیہ گرہ اور اسلام" بھی شائع ہوا تھا جس میں مذہبی نقطۂ نظر سے ستیہ گرہ کی تائید اور حمایت کی گئی تھی۔ خود مولانا نے انگریزی رسائل و اخبارات میں شائع شدہ اپنے بعض مضامین کی بابت ان الفاظ میں ایک مرتبہ لکھا تھا:-

"ایک زمانہ تھا کہ ناز اپنی عقل پر تھا، اور غرور اپنی فلسفہ دانی کا۔ زندگی کی آرزو سب سے بڑی یہ تھی کہ اپنا بھی شمار کسی دن اگر افلاطون و ارسطو کی صف میں نہیں تو ان کے شاگردوں کے زمرے میں ضرور ہو جائے ۔۔۔۔ ادھر دو ایک چھوٹے سے مراسلے لندن کے سائنسی ہفتہ وار نیچر میں نکل گئے تھے۔ اور ایک مراسلہ لندن کے سٹرڈے ریویو میں۔ اور ہندستانی ماہ ناموں میں دو چار مضمون نجے، ایسٹ اینڈ ویسٹ (بمبئی) اور تھیاسوفسٹ (مدراس) اور ماڈرن ریویو (کلکتہ) اور انڈین ریویو (مدراس) میں بھی چھپ چھپا گئے۔ اب کیا تھا، دماغ عرش معلیٰ پر تھا ۔۔۔۔ الحمدللہ کہ وہ نشہ مدت دراز ہوئی اتر چکا۔ یونانیوں اور فرنگیوں کی وہ ساری نکتہ سنجیاں محض لفاظی کا طلسم اور اصطلاحات کی بھول بھلیاں نظر آنے لگیں ۔۔۔"[۱]

بہرحال، جہاں تک اردو اخبارات میں مضمون نویسی کا تعلق ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، مولانا عبدالماجد ابھی اسکول کے ایک کم عمر طالب علم ہی تھے کہ انھیں مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ابتدا میں وہ عام طور سے اپنے نام سے مضمون نہیں لکھتے تھے۔ یہ مضمون یا تو بغیر کسی نام کے لکھے جاتے تھے یا دوسروں کے نام سے۔ کم عمر طالب علم کو شاید اس دور میں یہ خیال ہو کہ معلوم نہیں اس کا مضمون شائع ہو یا نہ ہو یا شائع بھی ہو تو پتہ نہیں گھر کے بزرگ اس مضمون نویسی کو پسند کریں یا نہ کریں۔ وجہ کچھ ہو، مولانا کی غیر مطبوعہ آپ بیتی کے مطابق ان کا پہلا مراسلہ ان کے نام سے اودھ اخبار[۱] لکھنؤ میں ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ امرت سر کے ضیاء الاسلام[۲] اور اسی شہر کے ایک مشہور اخبار وکیل[۳] میں مختلف موضوعات پر اپنے مضمون بھیجنے لگے اور وہ شائع بھی ہونے لگے۔ وکیل نے طالب علم عبدالماجد کے مضامین شائع ہی نہیں کیے بلکہ ان کے دو مضمونوں "محمود غزنوی" اور "غذائے انسانی" کو اتنا اہم سمجھا کہ کتابچوں کی شکل میں انھیں الگ الگ شائع کر دیا۔ ان مضمونوں کے لکھتے وقت مولانا ایف اے کے طالب علم تھے مگر یہ مضامین اتنے ٹھوس، وقیع اور پر از معلومات تھے کہ وکیل بک ڈپو نے غالباً یہ سمجھ کر کہ ان کا لکھنے والا، طالب علم تو کیا، کوئی "مولانا" ہی ہوگا، مضمون نگار کے نام کے پہلے "مولانا" بھی لکھ دیا اور اس

---

[۱] صدق جدید۔ ۵ / اگست ۱۹۶۶ء [۱] اردو کا مشہور روزنامہ جسے منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں شائع کرنا شروع کیا۔ یہ اخبار ۱۹۵۰ء تک پابندی سے جاری رہا۔ اردو کے بعض نہایت مشہور ادیب جن میں پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی شامل ہیں، اس کے ایڈیٹر رہے۔ منشی نول کشور کے انتقال کے بعد ان کے وارثوں نے ۱۹۵۰ء تک اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ [۲] امرت سر کا ایک پندرہ روزہ پرچہ جو کچھ عرصے تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔ [۳] امرت سر کا مشہور ہفت روزہ جو کچھ عرصے تک سہ روزہ اور روزنامہ بھی رہا۔ یہ پرچہ ۱۸۹۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مہتمم شیخ غلام محمد تھے اور پہلے دو پرچوں کے ایڈیٹر مرزا حیرت۔ دوسرے ایڈیٹروں میں سید جالب، مولوی عبداللہ منہاس، مولوی شجاع اللہ، حکیم فیروز الدین وغیرہم تھے۔ (تاریخ اردو صحافت جلد ۳۔ از مولانا امداد صابری) مولانا ابوالکلام آزاد بھی ایک زمانے میں کچھ عرصے تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ یہ اخبار شروع ہی سے بڑا قوم پرور تھا اور ابتدا ہی سے سودیشی کا پرچار کرتا رہا۔ آزادی ہند کا بھی بڑا علم بردار تھا۔

لقب کا پتہ طالب علم مضمون نگار تو اس وقت چلا جب ان کتابچوں کی کاپیاں ان سے موصول ہوئیں۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد مولانا عبدالماجد نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا اور یونی ورسٹی کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ[1] میں اپنے مضامین بھیجنے لگے۔ یہ دور، مولانا کا "دور الحاد" تھا۔ انھیں ادب کے ساتھ فلسفے سے بھی خاص دلچسپی پیدا ہوگئی اور آخر اس نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ مغربی فلسفیوں اور ان کے فلسفے پر مولانا شبلی کی مشہور کتاب الکلام کی تردید میں "طالب علم" کے نام سے لکھنؤ کے مشہور ماہ نامے الناظر[2] میں متعدد قسطوں میں ایک طویل مضمون لکھا۔ اس مضمون کی خاصی شہرت ہوئی کیوں کہ مولانا عبدالماجد نے ایک نئے انداز میں مولانا شبلی کی کتاب اور ان کے نظریات کی تردید کر ڈالی تھی۔ اس طویل مضمون میں متعدد جگہ اسلام کی مخالفت کے پہلو بھی واضح تھے۔ بعد میں مولانا عبدالماجد فلسفیانہ موشگافیاں کرتے کرتے اسلام اور خدا کے پھر قائل ہوگئے اور الحاد پسندی میں انھوں نے جو شدت دکھائی تھی اس سے کہیں زیادہ شغف اسلام اور شریعت اسلام سے انھیں پیدا ہوگیا۔ لیکن مولانا کے اس مضمون میں ان حصوں کو چھوڑ کر جن سے اسلامی نظریات کی مخالفت ہوتی تھی، باقی مضمون کی افادیت اپنی جگہ تھی۔ مولانا کے احباب کو بھی اب پتہ چل گیا تھا کہ یہ مضمون کس کا ہے اس لیے بعض نے اصرار کیا کہ مضمون کے قابل اعتراض حصے نکال کر اسے ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے لیکن مولانا نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے دور الحاد کی یہ یادگار کتابی شکل میں چھپے۔ پھر بھی مولانا کے دوسرے فلسفیانہ اور ادبی مضامین کا سلسلہ جاری رہا اور الندوہ[3]، ادیب[4]، العصر[5] اور الناظر میں یہ مضامین برابر شائع ہوتے رہے۔

مہاراجہ محمود آباد (سر) علی محمد خاں کی ملکیت اور اردو کے مشہور صحافی سید جالب دہلوی کی ادارت میں لکھنؤ سے ۱۹۱۶ء میں روزنامہ ہمدم جاری ہوا اور ایک عرصے تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔ اس وقت تک بحیثیت ایک مصنف اور صحافی مولانا عبدالماجد کی شہرت اس قدر زیادہ ہوگئی تھی کہ ایڈیٹر ہمدم نے اخبار کی پہلی ہی اشاعت کے لیے ان سے ایک طویل مضمون مانگا اور مولانا نے اسے لکھ بھی دیا۔ اس طویل مضمون کے بعد بھی مولانا کے چھوٹے بڑے مضمون اس میں شائع ہوتے رہے۔ البتہ کسی مضمون میں تو مولانا اپنا نام دے دیتے تھے اور کوئی بغیر نام کے شائع ہوتا تھا۔ مولانا محمد علی کے اردو اخبار ہمدرد کے دور اول[6] میں بھی مولانا عبدالماجد کے کچھ مضامین اس میں شائع ہوئے۔ جس سال لکھنؤ سے ہمدم نکلنا شروع ہوا اسی سال یعنی ۱۹۱۶ء میں دار المصنفین، اعظم گڑھ سے (جو مولانا شبلی کی یاد میں اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے قائم ہوا تھا) ایک مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی ماہ نامہ معارف شائع ہونا شروع ہوا۔ (اب بھی سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے)

---

[1] سرسید نے علی گڑھ سے جاری کیا تھا۔ اس میں ان کے مضامین بھی ہوتے تھے ۲۶-۲۵ء تک جاری رہا۔ بعد میں مسلم یونی ورسٹی گزٹ نام ہوگیا۔ [2] لکھنؤ کا مشہور علمی، ادبی، سیاسی ماہ نامہ جس کے ایڈیٹر اردو کے مشہور لکھنے والے اور قومی کارکن مولانا ظفر الملک علوی کاکوروی (مولانا اسحاق علی) تھے ۱۹۰۹ء سے شائع ہونا شروع ہوا اور ۴۴-۴۳ء تک شائع ہوتا رہا۔ [3] مولانا شبلی نے غالباً ۴-۱۹۰۳ء میں نکالنا شروع کیا۔ شروع شروع میں مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمان کے نام ایڈیٹروں کی حیثیت سے نکلتے تھے ۱۹۱۳ء میں بند ہوگیا۔ بعد میں مولانا علی میاں نے نکالا مگر پھر بند ہوگیا۔ [4] الہ آباد سے ۱۹۰۶ء میں نکلا۔ ایڈیٹر میر حسیم عظیم آبادی تھے۔ مولانا عبدالماجد کے کئی مضامین اس میں شائع ہوئے۔ ایک اہم مضمون کا عنوان تھا "عادت و فلسفۂ عادت"۔ [5] مشہور عیسائی ادیب منشی پیارے لال شاکر میرٹھی نے پہلے لکھنؤ سے شائع کیا پھر میرٹھ سے (تقریباً ۱۲-۱۹۱۱ء میں) صرف دو تین سال زندہ رہا۔ [6] ہمدرد (دہلی) کا دور اول ۱۹۱۲ء کے اخیر سے ۱۹۱۴ء تک رہا۔ پھر بند ہوگیا۔ لیکن ۲۴ء میں دوبارہ جاری ہوا اور مولانا محمد علی کی وفات سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔

معارف کے پہلے ایڈیٹر، مولانا شبلی کے جانشین (اور اردو کے فاضل ادیب اور مورخ) مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اس میں "اخبار علمیہ" کے عنوان کے ماتحت کثرت سے نوٹ اور تبصرے لکھتے رہے اور ان کے علاوہ انگریزی کے بعض مضامین کے ترجمے بھی ان کے قلم سے شائع ہوئے۔ مولانا سلیمان ندوی تحریک خلافت کے سلسلے میں یورپ اور حجاز گئے تو معارف کے ایڈیٹوریل نوٹ بھی مولانا عبدالماجد ہی لکھتے رہے۔ مولانا سلیمان ندوی کی وفات تک معارف کی مجلس ادارت میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام بھی شائع ہوتا رہتا تھا۔

اردو کے نامور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست نے ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ سے ایک ماہ نامہ صبح امید نکالنا شروع کیا۔ پنڈت کشن پرشاد کول بھی ان کے شریک کار تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس رسالے میں کئی کئی ادبی مضامین لکھے جن میں "ہندو مصنفین اردو" بہت مقبول اور مشہور ہوا۔ افسوس ہے کہ یہ رسالہ غالباً دو برس بعد ہی بند ہوگیا۔ صبح امید کی اشاعت کے ایک سال بعد ۱۹۱۹ء میں مولانا کے شاگرد اور عزیز انیس احمد عباسی صاحب نے ایک ہفتہ وار حقیقت لکھنؤ سے جاری کیا۔ (جو بعد میں عرصے تک روزنامے کی حیثیت سے نکلتا رہا اور اب انیس احمد عباسی صاحب کی یاد میں ان کے بھانجے احمد توفیق صاحب ہفتہ وار پرچے کی حیثیت سے نکال رہے ہیں۔ حقیقت کی اشاعت کے کئی مہینوں تک زیادہ تر مولانا عبدالماجد ہی اس کے ایڈیٹوریل اور نوٹ لکھتے رہے اور بعض علمی مضامین کے ترجمے بھی ان کے قلم سے اس میں شائع ہوئے۔ البتہ اس کے بعد یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ لکھنؤ سے رسالہ الناظر اب بھی نکل رہا تھا۔ مولانا نے ۲۲ء کے بعد دو سال تک "فیہ ما فیہ"[1] کے عنوان کے ماتحت "چلپی" کے نام سے اس میں ادارتی نوٹ بھی لکھے کتابوں پر تبصرے بھی۔ اس اثنا میں مولانا محمد علی کا اخبار ہمدرد بند ہوگیا تھا مگر ۲۴ء میں وہ دہلی سے پھر نکلنا شروع ہوا۔ اس بار مولانا محمد علی کے اصرار پر مولانا عبدالماجد کے اس کے انتظامی امور میں بھی حصہ لینا شروع کیا اور جب ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی اپنے علاج کی غرض سے یورپ گئے تو اخبار کی ادارت اور انتظامی امور کی نگرانی کلیتہً مولانا عبدالماجد کے سپرد کر گئے۔ اس دور میں بھی مولانا عبدالماجد کے قلم سے کئی مضامین ہمدرد میں شائع ہوئے جن میں "شیر کی گرج" اور "نہرو رپورٹ" خاصے کے مضامین تھے جنھیں عام طور سے بہت پسند کیا گیا۔

مولانا کا مشہور ہفتہ وار سچ ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ سے نکلا۔ شروع میں اس کے ایڈیٹر مولانا ظفر الملک علوی تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالرحمان ندوی نگرانی شریک ادارت تھے۔ سچ کے پہلے صفحہ پر "سچی باتیں" کے عنوان سے مولانا عبدالماجد نے اپنے انداز میں نوٹ لکھنا شروع کیا کہ یہ نوٹ تو نوٹ ان کا عنوان (سچی باتیں) ہی ایک خاص شہرت کا حامل ہوگیا۔ ایسے اکثر نوٹوں کے نیچے صرف حرف "م" لکھا ہوتا تھا۔ بہر حال، کچھ ہی عرصے بعد سچ کی ادارت تمام و کمال مولانا عبدالماجد کے سپرد ہو گئی اور مولانا ظفر الملک علوی اس کے ناشر اور مہتمم بن گئے۔ گویا سچ پہلا اخبار تھا جس کے بانی علاوہ ایڈیٹر مولانا عبدالماجد تھے۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی "سچی باتیں" مولانا کے انداز تحریر کا بڑا اعلا نمونہ تھیں۔ اردو کے متعدد اخبار انھیں اسی عنوان کے ماتحت نقل کرتے تھے اور عنوان دیکھ کر ہی ہر پڑھنے والا یہ سمجھ لیتا تھا کہ سچ سے انھیں نقل کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں "سچی باتیں" اور مولانا عبدالماجد دریابادی لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ سچ قوم پرور اخبار تھا اس نے تحریک

---

[1] شیخ حسام الدین چلپی، مولانا روم کے مرید خاص تھے۔ فیہ ما فیہ مولانا روم کے بعض ملفوظات اور ارشادات کے ایک مجموعے کا نام ہے۔

آزادی کی ہمیشہ حمایت کی اور یہ جتانے کی برابر کوشش کرتا رہا کہ مسلمانوں کا مسلک اپنے وطن سے محبت اور غیروں کی غلامی سے آزاد رہنا ہے۔ اسی کے ساتھ سچ کے صفحات پر اسلام کے خلاف حملوں کا جواب بھی ہوتا تھا اور مغربی تہذیب کے مضر اثرات اور رجحانات سے بچنے کی بھی مسلمانوں کو تلقین کی جاتی تھی۔ سچی باتیں میں بعض اوقات اتنا گہرا اور شدید طنز ہوتا تھا کہ مخالف تلملا اٹھتا تھا۔ جولائی ۳۰ء میں اس کے بعض مضامین کی بنا پر انگریزی حکومت نے سچ سے ضمانت طلب کر لی اور چونکہ ضمانت داخل نہیں کی گئی اس لیے اخبار بند کر دیا گیا۔ البتہ ۳۰ء کے آخر میں اسے پھر نکالا گیا لیکن ۳۳ء میں بعض وجہوں سے اسے بالکل بند کر دیا گیا۔

دو برس بعد یعنی ۳۵ء میں یہی پرچہ، مولانا کے دوسرے شاگرد اور عزیز عبدالرؤف عباسی صاحب کے زیر اہتمام و انتظام صدق کے نام سے جاری ہوا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی بدستور اس کے ایڈیٹر رہے۔ اخبار کی پیشانی پر لکھا ہوتا تھا کہ جملہ ادارتی امور اور مضامین کے سلسلے میں ایڈیٹر سے دریاباد کے پتے پر خط و کتابت کی جائے (کیونکہ مولانا دریاباد میں رہتے تھے اور وہیں سے ہفتہ کو پرچے میں شائع ہونے والا سارا مواد بھیج دیا کرتے تھے) اور انتظامی امور نیز ترسیل زر کے سلسلے میں منیجر صدق سے لکھنؤ کے پتے پر۔ صدق پہلے دو روزہ پھر ہفت روزہ ہوا اور پھر کچھ عرصے کے لیے سہ روزہ نکلتا رہا۔ صدق میں "کچھ سچی باتیں" کے عنوان سے مولانا کے شذرات نکلتے اور ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے اکثر اخبارات میں بہ کثرت نقل ہوتے رہے۔ صدق کی عمر سچ کے مقابلے میں کافی طویل رہی اور وہ ۵۰ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ مگر ۵۰ء کے شروع میں وہ بوجوہ بند ہو گیا اور دسمبر ۵۰ء میں مولانا کی ادارت اور حکیم عبدالقوی کے اہتمام میں صدق جدید کے نام سے نکلنا شروع ہوا۔ مولانا حسب دستور دریاباد سے مضامین بھیجتے تھے اور کتابت، پروف خوانی، طباعت، خریداروں کو ترسیل حکیم عبدالقوی صاحب کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ مولانا کی وفات تک پابندی سے جاری رہا۔ مارچ ۷۴ء میں مولانا پر فالج کا پہلا حملہ ہوا۔ اس حملے سے انھیں پورا افاقہ تو نہیں ہوا، پھر بھی وہ اخبار کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ لیکن اب انھیں لکھنے میں تکان ہونے لگا تھا۔ وہ ہاتھ جو، برس سے مسلسل اور مختلف موضوعات پر یکساں خامہ فرسائی کیا کرتا تھا، اب شل ہونے لگا تھا۔ مولانا کے ہاتھ کی تحریر پہلے بھی ہر ایک کے لیے پڑھنا مشکل تھی، اب اسے پڑھنے میں اور دقت ہونے لگی تھی۔ اس پر غضب یہ کہ بعض اوقات جملہ نامکمل رہ جاتا تھا مگر حکیم عبدالقوی جو ان کی طرز خط سے مکمل طور پر آشنا تھے، یہ جملے مکمل کر لیتے تھے۔ اکتوبر ۷۵ء میں، مولانا لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور اپنے مکان "خاتون منزل" (محلہ گولہ گنج) میں قیام پذیر تھے کہ ایک رات کوٹھے پر گر پڑے اور کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اسی دن سے وہ صاحب فراش ہو گئے اور بالآخر ۶ جنوری ۷۶ء کو وہ قلم جو ۲، برس سے ہزاروں صفحات پر گل کاریاں کر چکا تھا، ہمیشہ کے لیے چلتے چلتے رک گیا۔ البتہ صدق جدید، جسے حکیم عبدالقوی مولانا کی علالت کے دوران بھی نکالتے تھے ان کی یادگار کے طور پر حکیم صاحب کی ادارت میں اب بھی نکل رہا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی سیاست، مذہب، وطنیت اور صحافت کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے اور سچ و صدق دونوں میں ان کے اسی نقطۂ نگاہ کی ترجمانی ہوتی تھی۔ ان دونوں پرچوں میں عام ملکی سیاست، سیاسی جماعتوں، مالی اور اقتصادی مسائل، بین الاقوامی آویزشوں سیاسیات عالم وغیرہ پر نہ مضامین چھپتے تھے نہ مراسلے۔ لیکن جن معاملات کا تعلق مسلمانوں سے، ان کے کلچر سے، ان کے مذہب سے، ان کی تعلیم سے ہوتا تھا یا مغربی تہذیب، جنسی جرائم، عصبیت وغیرہ کی کوئی مثال سامنے آتی تھی تو سچ اور صدق کے کالموں میں اپنے نقطۂ نظر کے تحت طنز سے بھرپور شذرات

ضرور لکھے جاتے تھے۔ بہر حال ان دونوں اخباروں کا دائرہ ایک محدود دائرہ تھا۔ مولانا اس محدود دائرے کا خود بھی اکثر اعتراف کرتے رہتے تھے۔ مثلاً صدق جدید مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۶۶ء میں ایک مراسلہ نگار کو مخاطب کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "صدق کا دائرۂ موضوع، بہت ہی محدود دائرہ تنگ ہے چھوٹے بڑے ہر ملکی مسئلے پر اظہار رائے کرتے رہنا، اس کا شعار نہ پہلے رہا ہے، نہ اب ہے۔ اس کی ہستی بہر حال انفرادی ہے۔" صدق جدید ہی کی ایک دوسری اشاعت مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایک اور مراسلہ نگار سے یہ کہتے ہیں: "صدق کا ایک مخصوص انداز و مزاج ہے۔ اس سے باہر کی چیزوں کے لیے ملک کے دوسرے پرچے موجود ہیں۔" اپنے ایک مضمون "ہفتہ وار صحافت کے آداب" صدق جدید ۲۹ مارچ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے اپنے پرچے کی پالیسی اور واضح کر دی ہے۔ صحافت کو تجارت نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت قرار دیتے ہوئے مولانا نے ہفتہ وار صحافت کے یہ آداب (مختصر لفظوں میں) متعین کیے ہیں: "مقصود دین و ملت کی خدمت رکھیے (عام خدمت خلق بھی اسی تحت میں آجاتی ہے)، ملک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کیجیے۔" "وطن کا بھی بڑا حق ہے جس طرح پڑوسی کے استاد کے اور اہل خاندان کے ہوتے ہیں البتہ مسلمان 'پرستار' وطن کا نہیں ہو سکتا، عبودیت کا یہ خصوصی تعلق صرف ذات حق کے لیے مخصوص ہے۔" "اپنی مقبولیت کے جذبے کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دیجیے۔ کسی کی دل شکنی نہ کیجیے۔ مروت کے حدود قائم کر لیے جائیں۔" "ہفت روزہ میں اپنے تبصرے سے یا کم از کم خبر کی سرخی ہی سے سہی، ہر چیز کو بامقصد بنا کر پیش کیجیے۔" "ملک کی اکثریت اور قانون کا لحاظ رکھتے ہوئے مرعوبیت اور احساس کمتری کی حد تک نہ پہنچیے۔" "صلح و سازگاری دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری۔" "ذاتیات پر نہ اتر آئیے مزاح اور پھکڑ بازی کے فرق کو نظر میں رکھیے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں ہرگز نہ شرمائیے۔"

طنز کی ایک خوبی یہ بھی جاتی ہے کہ وہ بہت گہرا ہو۔ مولانا کی تحریر کا طنز بہت گہرا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کا لب و لہجہ بعض اوقات غیر معمولی طور سے تیز، تند اور تلخ بلکہ کبھی کبھی درشت ہو جاتا تھا۔ اردو کے ایک بڑے ناقد ڈاکٹر خورشید الاسلام نے تو ان کے انداز تحریر میں "خشونت" بھی پائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام، وطنیت، قوم، رواداری، تعصب، زندگی کے اقدار، تہذیب اور کلچر، مذہب اور بے دینی وغیرہ کے بارے میں مولانا کا جو نقطۂ نظر تھا اس کے خلاف یا اس سے کچھ ہٹی ہوئی اگر کوئی تقریر یا تحریر پڑھتے یا کوئی واقعہ سنتے یا دیکھتے تو وہ اسے انگیز نہ کر پاتے اور اس پر انتہائی طنزیہ انداز میں تبصرہ ضرور کرتے۔ مولانا کے نقطۂ نظر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ انتہا پسندانہ تھا اور اس سے بہتوں کو اختلاف ہو سکتا ہے اور تھا، لیکن جس طرح مولانا کے نقطۂ نظر سے دوسروں کو اختلاف کا حق حاصل ہے اسی طرح مولانا کو اپنے نقطۂ نظر کی حمایت اور دوسروں کے زاویۂ نگاہ کی مخالفت کا بھی حق حاصل تھا۔ بہر حال، مولانا کا طنز چاہے جتنا بھی تیز و تند ہو مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اسی طنز نے ان کے انداز تحریر کو منفرد اور ان کی صحافت کو ایک مخصوص طرز کی صحافت بنا دیا تھا۔ البتہ ان کے قلم سے کسی کے خلاف توہین آمیز یا نازیبا کلمات نہیں نکلتے تھے اور بہ قول مولانا ضیا احمد بدایونی ان کا روئے سخن شخصی نہیں بلکہ شخصیت کی طرف ہوتا تھا۔

سچ اور صدق میں شائع شدہ مولانا کی تحریروں میں کچھ اور خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک تو ان کے شذرات یا مضامین کی سرخیاں، جن کے متعلق مولانا نے لکھا ہے کہ اپنے تبصرے سے یا کم از کم خبر کی سرخی ہی سے ہر چیز کو بامقصد بنا کر پیش کیجیے۔ دوسرے نہایت دلچسپ اور موثر انداز میں رعایت لفظی کا استعمال۔ رعایت لفظی کا یہ استعمال بعض اوقات بڑے بڑے مضمونوں کا کام کر جاتا تھا۔ مختصر جملے اور مختصر تبصرے ان کی تحریر کے دوسرے امتیازات تھے۔ تبصرے کے آخر میں اکثر

نہایت برمحل شعر بھی لکھ دیتے تھے۔ مولانا کی دی ہوئی سرخیوں اور تحریر میں رعایت لفظی کی کچھ مثالیں ذیل میں درج کی جارہی ہیں: (سرخیوں کے ماتحت جو تحریریں ہیں وہ یا ان کی تلخیص طوالت کے خیال سے پیش نہیں کی جاسکتیں۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ یہ شعر تبصرے پر پوری طرح چسپاں بلکہ اس کی تلخیص ہوتے تھے) "نشترکئے زبان نو خنجر کو مرحبا کہیے"۔ "نشہ طرفے نایاب نازراں لب"۔ "سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں"۔ "دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے"۔ "دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی"۔ "اک کشمکش برق و شرر دونوں طرف ہے"۔ "شیر اور شیر قالین"۔ "قال میں حال"۔ "فتح سنگھ کی فتح"۔ "گرانی کے ٹھاٹھ"۔ "دانا کی نادانی"۔ "مظلوم کا ظلم"۔ "بلندیوں کی پستیاں"۔ "بزدل سورما"۔ "جدت کی قدامت"۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ایک مختصر کتاب پر ایک ریڈیو تقریر کی (جو بعد میں چھپی بھی) سرخی دیتے ہیں "ذکر حسین ذاکر حسین کی زبان سے"۔ ایک مرتبہ لاہور میں مولانا ظفر علی خاں کا جشن منایا گیا اور مولانا سے پیغام مانگا گیا۔ مولانا نے یہ پیغام بھیج دیا اور اخبارات میں بھی شائع ہوا۔ پیغام میں صرف یہ مصرع لکھا ہوا تھا: کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں۔ ایک مرتبہ علی گڑھ جاتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کا ساتھ ہوگیا۔ اس سفر اور قیام علی گڑھ کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب سرور رفیق سفر ہو تو اب غم کیا۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جامعہ ملیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے سلسلے میں جو ڈاکٹر ذاکر حسین' صدر جمہوریہ کی زیر صدارت ہوا تھا' اپنی تقریر میں اردو کی کس مپرسی کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے صدق جدید میں لکھتے ہیں۔ "خوب ہوا جو 'رشید' کے یہ ارشادات 'مرشد' کے سمع ہمایوں تک براہ راست پہنچ گئے"۔

اور اب مولانا کے کچھ شذرات کے اقتباسات دیکھیے:

"الفاظ کا جادو"

"اگر آپ کا تعلق اونچے طبقے سے ہے تو کسی سرا میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعث توہین۔ لیکن کسی "ہوٹل" میں قیام کرنا ذرا بھی باعث شرم نہیں حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ "سرا" مشرقی ہے' دیسی ہے اور "ہوٹل" مغربی ہے' انگریزی' ولایتی۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ سرا کے فلاں "بھٹیارے" سے آپ سے یارانہ ہے تو آپ اس کا تہ توبح لینے کو تیار ہو جائیں۔ لیکن فلاں ہوٹل کے "مینیجر" سے آپ سے بڑا ربط ضبط ہے' اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں حالانکہ سرا کے "بھٹیارے" اور ہوٹل کے "مینیجر" کے درمیان' بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کونسا فرق ہے؟"

— سچ - ۱۹۳۱ء

"سازندہ کا اعزاز" (وائلین بجانے والے مشہور امریکی فن کار یہودی منوہن کو ملکۂ برطانیہ کی طرف سے کے۔ بی۔ ای کا خطاب دیے جانے پر)

"جو کہیں آپ کسی کی زبان سے بطور افواہ بھی یہ سن لیں کہ کسی طبلچی' کسی سارنگیے' کسی پکھاوجی کو فلاں شہنشاہ دہلی نے پنج ہزاری یا ہفت ہزاری منصب سے سرفراز کر دیا تھا' یا فلاں شاہ اودھ نے اسے اپنے دربار کے امرا میں شامل کر لیا تھا تو شرم سے آپ کی آنکھیں نیچی ہو جائیں اور عجب نہیں کہ تحقیر و تمسخر کے ساتھ آپ خبر پر ہنس بھی پڑیں لیکن یہی خبر جب برطانیہ سے' فرانس سے امریکہ سے آتی ہے تو اسے آپ احترام کے کانوں سے سنتے ہیں اور آپ کا دل و دماغ اسے آرٹ نوازی' فن کی قدردانی اور فن کار کی حوصلہ افزائی قرار دیتا ہے۔

سرفرازی ہوا ونٹوں کی تو گردن کاٹیے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو شیفتۂ ارتقا کہیے"

— صدق جدید۔ ۱۷ دسمبر ۶۵ء

"داغ اپنی ہمارے جاتا ہے" (لکھنؤ میں پتنگ بازی کے مقابلے پر تبصرہ کرتے ہوئے)

"شاباش لکھنؤ! اور زندہ باد ملت اسلامیہ! ایسے میدانوں کے مرد میدان' سوا "خیرات" کے اور کہاں مل سکتے ہیں!۔ ہوش رُبا گرانی نے مزہ نیم فاقہ کشی کا چکھا دیا ہو۔ خطرۂ قحط

کے بگل پر بگل بجتے جا رہے ہوں۔ بے نکروں کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور نہ چھوٹنے پائے!

محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا
اور داغ کو یہ دھن کہ آئے کوئی خوب رو دستہ[1] (کذا)

—— صدق جدید ۱۷ ردسمبر ۶۵ء

"ایک نئے طائفہ کی سرافرازی" (ہندوستان میں روس کے ایک ثقافتی وفد کی آمد کے سلسلے میں)

"ناچ مجرے کی محفلیں کوئی راجہ مہاراجہ، نواب گرم رکھے تو گردن زدنی۔ لیکن "انڈو سویٹ فیسٹول" نام رکھ کر ایک سوشلسٹ اسٹیٹ جو کچھ کرے قابل داد و لائق تحسین!"

—— صدق جدید ۱۳ رمئی ۶۶ء

"زبان پہ ڈاکہ" (قیج دہلی کی اس خبر پر کہ مردم شماری میں منشی گوپی ناتھ امن اور پنڈت آنند نرائن ملا کی زبان ہندی میں لکھی گئی)

"مال و جائداد عزت و آبرو پر ڈاکہ پڑتے سنا تھا، زبان پر ڈکیتی اور رہزنی کی مثالیں اب دیکھنے میں آئیں۔"

—— صدق جدید ۱۹ رجولائی ۶۸ء

یہ مولانا عبدالماجد کی طرز تحریر کے چند نمونے اور ان کی صحافتی زندگی کا ایک مختصر خاکہ ہے۔ مولانا نے سچ کی ادارت سنبھالنے سے پہلے مختلف اخبارات و جرائد میں مضمون نگار، تبصرہ نگار، مراسلہ نگار وغیرہ کی حیثیت سے جو حصہ لیا تھا اسے اگر نہ بھی شامل کیا جائے تو بھی باقاعدہ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی صحافتی زندگی کی مدت تقریباً ۴۹ برس ہوتی ہے۔ مولانا نے صدق جدید کی اشاعت مورخہ ۲۹ رمارچ ۱۹۶۸ء میں لکھا تھا کہ "صدق اپنے پہلے نام سچ کے ساتھ جنوری ۲۵ء میں جاری ہوا۔ شروع کے کچھ مہینے چھوڑ کر جب ادارت کی پوری ذمہ داری اپنے سر تھی اور درمیان کے کل سال ڈیڑھ سال کے ناغہ کو چھوڑ کر، کہنا چاہیے کہ پورے ۴۳ سال کا صحافتی تجربہ ہے۔" دس میں ۶ برس کا اور اضافہ کر لیجیے تو ۴۹ برس کی صحافیانہ زندگی بجائے خود ایک بڑی مدت ہوتی ہے۔ اس مدت میں انھوں نے جس انداز میں صحافت کی اور اردو صحافت کو جو نیا رنگ دیا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ ان کی پالیسی اور نظریات سے بہتوں کو اختلاف ممکن ہے لیکن ان کے "صاحب طرز صحافی" ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

★

۱؎ اصل مصرعہ اس طرح ہے۔ ع یاں یہ تلاش آئے کوئی خوب رو دستِ حنا

"آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں، جن کو عام حالت میں حق امتیاز و استثنا حاصل ہے اور ہماری مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نشان امید رکھتے ہیں۔ میں ان کی وقعت کرتا ہوں۔ انھیں چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبدالماجد بی۔ اے بھی ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچائے گا اور علوم حدیثہ کے تراجم میں ان سے بہت مفید مدد ملے گی جو اب تک اردو زبان میں گویا مفقود محض ہیں۔"

—— مولانا ابوالکلام آزاد
(الہلال ۱۲ رستمبر ۱۹۱۳ء)

مولانا عبدالماجد دریابادی کا سوگ

ڈاکٹر سلام سندیلوی

ہر گلشن پر غم کی گھٹا ہے، ہر گل پر اشکِ شبنم ۔۔۔ سارا جہاں سُونا سُونا ہے، اک عالم کی فرقت سے
علم و ادب، تفسیر و تصوف اب بھی لپٹ کے روتے ہیں ۔۔۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تربت سے

غرق ہیں اب بھی رنج و الم میں سارے شاعر اور ادیب ۔۔۔ اہلِ نظر ماتم کرتے ہیں، بے کیفی کی رات لیے
فکر و تخیل کی وادی پر اک ویرانی چھائی ہے ۔۔۔ اہلِ بصیرت اشک فشاں ہیں، "فلسفۂ جذبات" لیے

مرجھائی بیٹھی ہے تفنن طرازِ خم ہے فرقِ طنز و مزاح ۔۔۔ تیر و نشتر کی دنیا کو، پہونچی ہے تکلیف شدید
سوتی ہے آغوشِ خزاں میں، آج صحافت کی وادی ۔۔۔ ویراں ہے اخبار کی دنیا، افسردہ ہے "صدقِ جدید"

محوِ خواب ہے کنجِ چمن میں، پرواز مرغِ تخیل ۔۔۔ بیٹھ گیا ہے چلتے چلتے، صحرا میں اسپ خامہ
غمگیں ہے انشا پردازی، چاک گریباں ہے تنقید ۔۔۔ الماری کے اک گوشے میں، روتا ہے "اکبر نامہ"

دین و مذہب کی دنیا پر، ٹوٹ پڑا ہے کوہِ الم ۔۔۔ افسردہ خاطر ہیں دونوں، آج مقلد اور امام
سعدی، خسرو، حافظ، جامی، رنج و الم میں ڈوبے ہیں ۔۔۔ غم میں غرق نظر آتا ہے، آج تصوف اور اسلام

مشک کی صورت عطر فشاں ہے دنیا بھر میں ان کا نام ۔۔۔ کوئی نہیں ہے بھولا ان کو اب بھی ہے تازہ ان کی یاد
مولانا عبدالماجد دریابادی کی الفت سے ۔۔۔ گوشۂ دل ہے بارہ بنکی، خلد نظر ہے دریاباد

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شاعری

ہمارے ادب میں ایسے مشاہیر کی تعداد کم نہیں ہے جو شعر و شاعری کی بہترین صلاحیت رکھتے تھے اور اپنے فکر و فن سے اردو شاعری کو معیاری و مثالی بناکر اس کے سرمایہ میں اہم اور مفید اضافہ کرسکتے تھے۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ اردو شاعری کے ناپاک دفتر کی گندگی کو دور کرنے والوں کے پیشرو بھی تھے۔ انھیں بزرگوں کی کوششوں سے اردو شاعری قعر مذلت سے نکلی اور عصری رجحانات کا آئینہ دار بنی۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں

> تمھاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو نہیں تو ایک زمانہ تمھاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گئی۔

> کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ جو ہماری زبان جوش تاثیر سے خالی ہو اگر یہ شرم کی جگہ نہیں کہ اوروں کے سامنے ہماری زبان ضعف بیان کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو۔ اے خاک ہندوستان اگر تجھ میں امرا القیس اور لبید نہیں تو کالی داس ہی نکال۔[1]

ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی شاعری کو جھوٹ اور مبالغے اور بے اصل خیالی باتوں کا ملغوبہ بتایا ہے۔ لیکن وہ شعر و شاعری کو ضروری بھی سمجھتے تھے اس لیے اپنا لیکچر دینے سے پہلے "تبرکاً" اپنی نظم پڑھا کرتے تھے "کیونکہ نظم سے طبیعت میں جولانی اور گویائی میں روانی آجاتی ہے۔"

علامہ شبلی اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے اخلاقی شاعری میں طبع آزمائی کی اور تاریخی، مذہبی، سیاسی، سماجی عنوانات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تاریخی واقعات کو نظم کا جامہ پہنانے کی ابتدا شبلی ہی نے کی۔ لیکن ان سب حضرات کا خاص مقصد ادب کی اصلاح و فلاح کا تھا۔ وہ اپنے ادبی سرمایہ کی خامیاں دور کرنا، اور اس کو ہر اعتبار سے مفید اور جامع بنانا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ یہ مقصد صرف شاعری سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے انھوں نے مختلف علوم و فنون اور موضوعات پر قلم اٹھایا۔ مذہب، فلسفہ، تاریخ، تنقید، تحقیق، سوانح، ناول غرض کوئی ایسا موضوع نہیں تھا جس پر انھوں نے توجہ نہ کی ہو۔ اور اپنی انتھک محنت سے اس میں گرانقدر اضافہ نہ کیا ہو۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا شمار بھی انھیں بزرگوں میں کیا جانا چاہیے۔ ان کے اندر بھی شاعری کا ملکہ تھا، سخن فہمی اور سخن سنجی کی بدرجۂ اتم صلاحیت تھی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ گیسوے اردو سنوارنے لگے تھے۔ مشاہیر ادب اور اساتذۂ فن سے ملنے اور مستفیض ہونے کا شوق انھیں جنون کی حد تک رہا۔

---

[1] نظم آزاد، صفحہ ۳۰۔۳۱۔۳۲

خشک اور دقیق موضوعات کے علاوہ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی مگر وہ اپنے کو شاعر کہلانا یا بزم سخن میں اپنے اشعار سنانا، پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ صرف ان کا ذوق سخن تھا جو ان کی رہنمائی اور تربیت کرتا رہا۔

مولانا عبد الماجد کا عہد اردو شاعری کا حیات آفریں عہد تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں آزاد اور حالی نے تطہیر ادب کی جو مہم شروع کی تھی وہ کامیابی کی منزل تک پہنچ چکی تھی بشعر و ادب تنقید حیات اور تفسیر حیات دونوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ عشق و حسن کے معانی و مفہوم میں تبدیلی بھی آئی اور وسعت و جامعیت بھی۔ ادب "مسائل حیات انسانی" کے اظہار کا موثر ذریعہ بن گیا۔ وہ زندگی کے مسائل سمجھنے اور سمجھانے کا فرض انجام دے رہا تھا۔ اس نظریہ ادب کو، لکھنؤ، دہلی، حیدر آباد، عظیم آباد، رام پور، غرض ہر مکتب فکر نے اپنایا اور اردو شاعری کے مزاج اور اس کی فطرت کے بموجب عصری رجحانات بیان کیے۔ اکبر، اسماعیل میرٹھی، چکبست، سلیم، پانی پتی، اقبال اور جوش ملیح آبادی اس نئے شعری کارواں کی صف اول میں تھے۔ غزل گو شعراء میں شاد، صفی، اصغر، جگر، حسرت، آرزو، فانی، عزیز، ثاقب، سائل، وحشت وغیرہ جیسے اساتذہ تھے جنھوں نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو بنایا۔ اردو شاعری کا ہر اعتبار سے پورے ملک پر قبضہ ہوگیا، ہندستان کی دوسری تحریکوں، سیاسی، سماجی، مذہبی وغیرہ میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس لیے ہر شخص اس سے متاثر ہوا اور جس میں ذرا بھی شاعری کا ملکہ تھا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر عروس سخن کے گیسو سنوارنے لگا۔

مولانا عبد الماجد شباب کی منزل میں داخل ہو چکے تھے، اور شباب کی ساری رعنائیاں اور توانائیاں مطالعہ و مشاہدہ کی نذر کر رہے تھے۔ فلسفہ کے حسن و جمال کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ فلسفی عبد الماجد مشہور ہو گئے۔ ترجمہ و تالیف کا سلسلہ طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ مختلف ادبی رسائل میں مضامین بھی شائع ہونے لگے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا نے ایک مضمون غالب کے فلسفہ پر لکھا۔ یہ مضمون انڈین پریس الٰہ آباد کے رسالہ ادیب میں شائع ہوا اور اکبر الٰہ آبادی مرحوم کی نظر سے بھی گزرا۔ اکبر کو یہ مضمون بہت پسند آیا۔ مولانا نے غالب کے فلسفہ کی تشریح جس شاعرانہ لطافت اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ کی تھی، اکبر مرحوم نے اس کی بڑی داد دی، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں آپ کو مذاق شعر سے کس طرح بے بہرہ سمجھوں۔ غالب کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دلآویز ہے"[1]

اکبر مرحوم کی مردم شناس نظر نے مولانا عبد الماجد کو دیکھتے ہی یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس نوجوان میں شعر فہمی اور شعر گوئی کی صلاحیت موجود ہے[2]۔

اس مختصر سے جملے نے مولانا کے اندر یہ خیال ضرور پیدا کیا ہوگا کہ وہ بھی شعر کہہ سکتے ہیں اور اگر اس کی طرف ذرا بھی متوجہ ہو جائیں تو اچھے شاعر ہو سکتے ہیں۔ ہوا بھی یہی، مولانا کو شعر کی دیوی، رفتہ رفتہ اپنی طرف مائل کرتی رہی، بالآخر ایک سال بعد، وہ اس کی 'زلف گرہ گیر' کے دام میں اسیر ہوگئے اور اپنی پہلی غزل لکھ کر اکبر مرحوم کی خدمت میں روانہ کی۔ اکبر مرحوم نے غزل دیکھنے کے بعد مولانا کی بڑی تعریف کی اور حوصلہ بڑھانے کے لیے ایک تحسین آمیز خط لکھا:

عزیزی حبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ۔
مجھ کو حیرت ہوئی کہ آپ ایسے شعر کہہ سکتے ہیں جو رنگ سخن ظاہر

---

[1] خط نمبر ۴ - ۴ ستمبر ۱۹۱۳ء - خطوط مشاہیر صفحہ ۵۲۔

[2] مولانا جب بی اے کا امتحان دینے الٰہ آباد گئے تھے تو مارچ یا اپریل ۱۲ء میں اکبر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اسی وقت سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔

ہوتا ہے۔ وہ بہت پختہ ہے۔ کیا کہنا چاہیئے ؟ اور کیونکر کہنا چاہیے۔ اول میں کوئی جگہ اعتراض کی نہیں ہے بلکہ آپ کی تقلید مناسب ہے۔ دوم میں البتہ کہیں کہیں کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ بہرکیف میں آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

رہی ہر چند عقل صبر آموز   نہ گئیں بیقراریاں نہ گئیں

کیا خوب کہا ہے۔ آپ انشاءاللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے[1]۔"

اپنی شاعری کے متعلق خود مولانا عبدالماجد نے اعتراف کیا ہے کہ:

"سنہ سے میرا وہ غزل گوئی شروع ہوتا ہے۔ شادی سے دو سال قبل شروع ہوا اور شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد تک رہا۔ پہلی غزل "زاویاں نہ گئیں" کی زمین میں تھی۔ یہی غزل اصلاح کے لیے حضرت اکبر کی خدمت میں روانہ کی ہے خیال لا کہ طبیعت پر رنگ حسرت موہانی کا غالب تھا[2]۔"

اس طرح مولانا نے زیادہ سے زیادہ چار برس عروس سخن کے گیسو سنوارے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ناظر کے فرضی تخلص یا نام سے ایک "ڈرامہ زود پشیمان" لکھا۔ جس میں اس دور کی تہذیب و معاشرت کے محاسن و معائب پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ "ڈرامہ میں 'ارباب نشاط' نے بھی حصہ لیا ہے حسب موقع رقص و سرود کی محفلیں بھی آراستہ کی گئی ہیں۔ اور ناظر کی غزلیں گا کر 'نظیر جان طوائف نے' حاضرین و شائقین کو محظوظ کیا ہے۔ ایک غزل سنانے سے پہلے نظیر جان طوائف، 'ماسٹر صاحب' (ایک کردار) سے اجازت لیتی ہے کہ اگر حکم ہو تو میں ناظر کی ایک تازہ غزل سناؤں۔ 'ماسٹر' نے بڑے جبر و اکراہ کے ساتھ کہا:

اف! کس جہل گو کا نام لیا۔ اچھا خیر، سناؤ۔

نظیر جان کو اجازت مل گئی اور اس نے بڑے ناز و ادا کے ساتھ غزل سنانا شروع کی:

جانبازیوں کو خبط سے تعبیر کر چلے   تم یہ تو خوب عشق کی توقیر کر چلے

پیرو نہیں نظارہ کا در شوق سے ہو بند   اب دل میں نقش ہم تری تصویر کر چلے

منتی ہے آپ کی کوئی فرد قرار جرم   مانا کہ ہم شکایت تقدیر کر چلے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں مری وحشتیں کہ اب
غم خوار مجھ کو بستۂ زنجیر کر چلے

غالب زبانِ شوق پہ آیا نہ عیبِ حسن
لو ہم تمھارے آگے بھی تقریر کر چلے

حیراں ہوں ان کے حسن میں کیا ایسا سحر تھا
میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے

اگلا سا غیر سے نہیں اب لطف و التفات
بارے ہمارے نالے بھی تاثیر کر چلے

منسوب کر کے عشق کو اک بوالہوس سے تم
اس جذبۂ لطیف کی تحقیر کر چلے

یہ کیا ہوا کہ ان کی جفاؤں کا ذکر چھیڑ
ناظر بھی شکوۂ فلک پیر کر چلے

نظیر جان کی تان اور آواز نے غزل کے درد و اثر کو اور بڑھا دیا سننے والوں کے دل بے تاب ہو گئے۔ بے خودی و سرشاری کا سماں ہو گیا۔ لیکن نکتہ چیں قلم کب ماننے والا تھا، اس نے ماسٹر اور مشرف (نظیر جان کے ساتھی) کی زبان سے غزل کی جو گت بنائی وہ بھی سن لیجیے:۔

نظیر جان جب غزل سنا چکی تو ماسٹر نے اپنے ساتھی میاں "مشرف" سے دریافت کیا کہ غزل کیسی تھی؟

ماسٹر:۔ مشرف! یہ غزل بہ لحاظ شاعری کیسی ہے؟

مشرف:۔ میں کیا بتاؤں کیسی تھی؟ بہت سی شعریں تو میری سمجھ میں نہیں آئیں۔

ماسٹر:۔ تم نے سچ کہا۔ واقعی جہل کلام تھا۔ دلی میں غالب ایک بڑا جہل گو ہوا ہے۔ جہل گوئی کی کوئی کیا تقلید کرتا۔

---

[1] خط نمبر ۲۵۔ خطوط مشاہیر صفحہ ۶۳-۶۴۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء [2] حاشیہ خطوط مشاہیر صفحہ ۶۳۔

اس کا رنگ تو اچھا ہوا اس کے ساتھ ختم ہو گیا۔ مگر اسی زمانے میں مومن، شیفتہ، حالی، دو چار شخص اور بھی مہمل گوئی کرنے لگے، ان سب کے مرجانے کے بعد میں تو خوش تھا کہ یہ رنگ دنیا سے اٹھ گیا۔ مگر حسرت، ناظر، رسوا وغیرہ دو ایک شخص اب تک اسی روش پر چل رہے ہیں۔"

مشرت نے تو اسی پر اکتفا کی تھی کہ اس غزل کی بہت سی شعر یں ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہیں مگر ماسٹر نے تو اس کو بالکل مہمل کلام ثابت کر دیا۔ سب سے پہلے تو انھوں نے غالب کو اہل گویوں کا قبلہ و کعبہ بتایا، اس کے بعد مومن، شیفتہ اور حالی کو بھی مہمل گویوں میں شمار کیا ہے۔ اپنے دور میں حسرت اور رسوا کے ساتھ ساتھ ناظر کو بھی مہمل گو بتایا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا نے "ارحیہ ہجو" کی ہے اور وہ اپنی شاعرانہ حیثیت مذکورہ بالا "مہمل گویوں" سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ یہی غزل مولانا نے اکبر الہ آبادی کو اصلاح کی غرض سے بھیجی تھی اکبر مرحوم نے اس غزل کی تعریف میں لکھا:۔

"آپ کی غزل دیکھ کر کم تعجب ہوا اور زیادہ خوشی ہوئی۔ تعجب اس بات کا کہ ابتدا ہی میں ایسے کھرے شعر آپ کہنے لگے۔ تعجب میں کمی اس لیے کہ اچھی فطرتی سمجھ اور علم نے آپ کی طبیعت کو معنی کا عمدہ سانچہ بنا دیا ہے۔ نقص و زیادت کو دخل نہیں۔ خوشی اس بات کی کہ ان خیالات کو میں نے پسند کیا۔ طریقہ اظہار بھی خوب ہے۔ شاعری، پالیٹکس، اخلاق، عملی فلسفہ سب کی جھلک ہے رکاکت سے خالی۔

اس کے بعد اکبر مرحوم نے علاحدہ علاحدہ ایک ایک شعر کی تشریح و تعریف کی ہے۔

"اہل وفا بھی۔ الخ خوب ہے۔ نہایت صحیح و بامعنی ہے[1]۔
غالب زبانِ شوق۔ الخ بہت ہی بلیغ ہے۔

یہ کیا ہوا۔ الخ اس میں بھی معلوم ہے نامعلوم کی طرف کیا لطیف صعود ہے حیراں ہوں۔ الخ وجد آفریں شعر ہے۔ میرے دل کو بھی۔ اس میں بھی کیا بلاغت ہے۔ ماشاء اللہ، چشم بد دور۔ الغرض سب شعر کم و بیش اچھے ہیں۔ اب رہی زبان و طرز بیان اس میں کوئی نقص نہیں۔ البتہ افزائش حسن کی گنجائش ہے۔ طبیعت کا نشو و نما خود اس کو پیدا کرے گا۔ جب عالم معنی کے استغراق سے طبیعت آسودہ و بے فکر ہو کر حسن صورت کا مذاق پیدا کرے گی۔ تحریر میں ان اشارات سے زیادہ اس وقت میری قوت سے باہر ہے۔ بہر کیف آپ کو داد دیتا ہوں سبحان اللہ کہتا ہوں۔ ترقی عمر و اطمینان کی دعا کرتا ہوں[2]۔"

مولانا کی یہ دوسری غزل ہے انھیں کے الفاظ میں

"یہ دوسری غزل "تسخیر کر چلے، تدبیر کر چلے" کی زمین میں کہہ کر حضرت اکبر کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کی تھی[3]۔"

اکبر مرحوم نے "زبان و طرز بیان" کو سراہا ہے البتہ "افزائش حسن" کا مشورہ دیا ہے۔ یہ افزائش حسن، حسن صورت کا مذاق پیدا ہونے پر منحصر ہے۔ گویا اکبر نے انتہائی بلیغ انداز میں مولانا کو مشاہدہ "حسن و جمال" کی تلقین کی۔ اکبر کی یہ داد عارفانہ داد کہی جا سکتی ہے۔ وہ عمر کی اس منزل میں تھے جس کو آخری منزل کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت ان پر بسبب "تصوف" کے رجحانات اور خیالات غالب آ چکے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ سرشار فلسفی ماجد مولانا اور صوفی ماجد ہو جائیں۔ ان کا دل اسلام و ایمان کے نور سے منور ہو جائے۔ کیسے موثر انداز میں اپنی قلبی تمنا ظاہر کر رہے ہیں۔

حیراں ہوں ان کے تن میں کیا ایسا سحر تھا
میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے

اکبر کی نظر میں یہ شعر "وجد آفریں" ہے۔ میرے بھی دل کو، اس بھی

---

[1] یہ شعر مذکورہ غزل میں نہیں ہے۔ غالباً مصنف نے خارج کر دیا یا کاتب نے اصلاح کر دی۔ [2] خط نمبر ۳۸۔ خطوط مشاہیر صفحہ ۶۵، ۶۶۔
[3] حاشیہ خطوط مشاہیر صفحہ ۶۵۔

میں کیا بلاغت ہے۔ ماشاء اللہ چشم بد دور اس کمی نے اکبر مرحوم کو اس لیے متاثر کیا کہ اس سے یہ راز آشکار ہو جاتا ہے کہ فلسفی ماجد کا دل بھی سحر آمیز حسن سے متاثر و مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اکبر کے خیال میں مولانا عشق مجازی کے کوچے سے آشنا ہوتے جا رہے ہیں اور وہ اسی کوچے سے، عشق حقیقی کی منزل تک پہنچ جائیں گے اور معرفت و تصوف کی لذت سے مستفیض ہو گئے۔ جہاں تک غزل، اس کی زبان، اس کے موضوع، اس کے فن اور اس کے بیان کا تعلق ہے۔ مولانا عبدالماجد کو ان سب پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ شاعری کا ملکہ خداداد تھا، اس لیے اکبر مرحوم نے انھیں "شعر گفتن" اور "غزل گفتن" کا مشورہ دیا تھا۔ مولانا کے کلام کا وہ بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے رہتے تھے۔ تقریباً نو مہینے تک (دسمبر ۱۹۱۵ء تا ستمبر ۱۹۱۶ء) مولانا نے کوئی غزل اکبر کی خدمت میں نہیں بھیجی۔ اکبر مرحوم مولانا کی علمی مصروفیت سے واقف تھے۔ انھیں یہ علم تھا کہ مولانا کو تصنیف تالیف اور دوسرے ادبی و علمی کاموں سے دم مارنے کی فرصت نہیں ملتی ہے۔ اس کے باوجود وہ یہی چاہتے تھے کہ مولانا ایسے خشک اور دقیق کاموں سے کبھی کبھی وقت نکال لیا کریں اور دل و دماغ کو تر و تازہ کرنے کے لیے، غزل کہہ لیا کریں، اپنے ایک خط میں کس انداز سے شعر گوئی کی تلقین کر رہے ہیں:۔

"آپ کا دماغ سائنٹفک اور آپ کا دل ملائم اور لطیف۔ اس سبب سے میں آپ کو بہت زیادہ وقعت کا مستحق سمجھتا ہوں۔ شعر و سخن کا کیا حال ہے؟ آپ کی غزلیں بہت خوب تھیں۔"[1]

ناظر حسب معمول خاموش رہے۔ جواب ضرور دیا ہوگا لیکن شاعری کے سلسلے میں "ٹال گئے" ہوں گے۔ کچھ دنوں کے بعد جذبۂ شاعری نے قفل خاموشی کو کھولا ہی نہیں توڑ دیا اور کچھ اشعار کہہ کر اکبر کی خدمت میں روانہ کیے۔ اکبر نے ان اشعار کو سراہتے ہوئے کہا:

"آپ کے اشعار کی نسبت لکھنا بھول گیا کہ نہایت معنی خیز با مزہ ہیں لیکن آپ کو غزل کہنا چاہیے۔ جیسی غزلیں آپ نے پہلے کہی تھیں۔"[2]

اکبر کے اس مشورے پر مولانا اپنی علمی و ادبی مصروفیتوں کی وجہ سے شاید عمل نہ کر سکے۔ جب آٹھ ماہ سے زائد عرصہ گزر گیا تو اکبر نے پھر لکھا:

"کبھی دو چار شعر ضرور کہہ لیا کیجیے۔ جوہر قابل موجود ہے۔"[3]

جوہر قابل کی سند ملے مولانا کے دل میں آخر کار جذبۂ شاعری بیدار کر دیا۔ انھوں نے تین ہفتوں کے بعد ہی اپنی پرانی اور نئی غزلیں ایک ساتھ اکبر کے ملاحظہ کے لیے روانہ کر دیں۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا نے غزل گوئی کا سلسلہ ختم نہیں کیا تھا بلکہ وہ وقتاً فوقتاً غزلیں کہتے رہے تھے کسی وجہ سے اکبر کے پاس بھیج نہیں سکے تھے۔ بار بار تقاضوں کے پیش نظر، انھوں نے اپنی کل غزلیں اکٹھا کر کے ان کے پاس بھیج دیں۔ اکبر نے ان تمام غزلوں کو ملاحظہ کیا اور ان الفاظ میں داد دی۔

"ان غزلوں میں وسعت خیال زیادہ ہے۔ لیکن بلحاظ قواعد زبان، سابق غزلیں زیادہ کھری تھیں۔ اس کا سبب زبانی کہوں گا۔ اگر زندہ رہا۔ جہاں آپ کو بجا شبہ ہے نہ صرف وہاں بلکہ اور مصرعوں میں بھی تغیر و تبدل کی ضرورت ہے ان شاء اللہ دو چار دن میں واپس بھیج دوں گا۔"[4]

مولانا عبدالماجد نے غزلیں بھیجتے وقت کلام میں خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہوگا اور اپنے شکوک و شبہات لکھے ہوں گے۔ اکبر نے ان شبہات کو صحیح بتایا، نیز غزلیں دیکھنے کے بعد یہ رائے بھی دی کہ بعض مصرعوں میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اصلاح کرنے کے بعد اکبر نے یہ تمام غزلیں واپس کر دی ہوں گی۔ اسی مدت میں مولانا نے ایک نئی غزل بڑی شگفتہ اور شاداب زمین میں

۱؎ خط نمبر ۱۴ - خطوط مشاہیر صفحہ ۷۰ - ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء ۔ ۲؎ خط نمبر ۴۸ - خطوط مشاہیر صفحہ ۷۷ - ۹ فروری ۱۹۱۶ء ۔
۳؎ خط نمبر ۶۳ " " ۳ نومبر ۱۹۱۶ء ۔ ۴؎ خط نمبر ۷۶ صفحہ ۹۱ - ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء ۔

کبھی اور اکبر کے پاس بھیجی۔ اکبر مرحوم کو دو شعر خاص طور پر بہت پسند آئے۔ لکھتے ہیں:

"آپ کے یہ دو شعر بلحاظ معنی بہت خوب ہیں[1]:

وہ مدت ہوئی مل چکے ہیں عدو سے
مگر آہ اب تک اثر ڈھونڈھتی ہے

نگاہِ کرم اس ستم گر کی ناظر
فقط آپ کی چشم تر ڈھونڈھتی ہے

اس مقطع کو آپ خود بھی یاد رکھیے[2]"

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناظر پر حسن و عشق کا جادو اثر کرتا جا رہا تھا، ان کا فلسفی مزاج، جذبات محبت کے اظہار کرنے کی طرف مائل ہوتا جا رہا تھا۔ غالب نے کہا تھا۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

ناظر اب اسی مقام پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فلسفہ اور دوسرے دق مسائل نے ان کے دل و دماغ، مزاج و ماحول کو انتہائی سنجیدہ، خشک اور بے کیف بنا دیا تھا۔ اس کو پر کیف بنانے اور دل کو شگفتہ رکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ پاسبان عقل سے 'کبھی کبھی' دل کو آزاد کرا دیا جائے اور اس کو من مانی کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اقبال بھی اسی نتیجے پر پہنچے تھے:

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اکبر مرحوم بھی یہی چاہتے تھے وہ ہمیشہ یہی خواہش اور کوشش کرتے رہے کہ ماجد اپنی شاعرانہ صلاحیت سے باخبر رہیں اور اس کو ضائع نہ ہونے دیں۔ جب کبھی انھیں موقع ملتا وہ شعر کہنے کی فرمائش کرتے رہتے۔ یہ سلسلہ جنوری ۱۹۱۹ء تک جاری رہا۔ مولانا عبدالماجد خود بھی کبھی کبھی غزل لکھ کر اصلاح کے لیے بھیجتے رہتے تھے، اپریل ۱۹۱۸ء میں مولانا نے ایک تازہ مرصع غزل کہی اور اکبر کے پاس بھیجی۔ انھوں نے اس غزل کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

"آپ کی غزل خوب ہے۔ ترکیب الفاظ بہت صاف اور صحیح ہے اگرچہ آپ نرے تقلیدی فلاسفر نہیں ہیں لیکن شاعری آپ کو زیادہ تر اور جینیئلٹی کی طرف لے جائے گی۔ ابتدا کچھ شعر عاشقانہ طرز کا مضائقہ نہیں مناسب ہی ہے۔ اس باب میں پھر کچھ لکھوں گا۔ دو ایک شعر اس غزل میں بالخصوص داد کے مستحق ہیں[3]"

اس کے بعد جب مولانا نے کچھ عرصہ تک اپنا کوئی کلام نہیں بھیجا تو اکبر کبھی کبھی اپنے خطوں میں یاد دلا دیتے:

"فنا پر کچھ اشعار کہیے۔ عبرت کے رنگ میں یا فلسفیانہ۔ الحمدللہ آپ کو علم نے عمر سے بہت آگے کر دیا۔ لیکن یہ فطرتی سنجیدگی ہے[4]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"جب آپ کو فرصت ملے دو چار شعر موزوں کر لیا کیجیے[5]"

یہ جانتے ہوئے بھی کہ مولانا اپنے علمی و ادبی مشاغل میں انتہائی مصروف ہیں۔ اکبر مرحوم یہ مشورہ دینے سے باز نہیں رہے کہ

"آپ عدیم الفرصت ہوں گے ورنہ عرض کرتا کہ کبھی دو چار شعر کہہ لیا کیجیے[6]"

اکبر مشورہ دیتے رہے اور مولانا ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے موقع کی تلاش میں رہے بالآخر تقریباً چھ ماہ بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں داغ کی مشہور زمین میں غزل کہہ کر اکبر کے پاس بھیجی۔ اکبر نے اس کو دیکھنے کے بعد لکھا:

---

[1] خط نمبر ۷، صفحہ ۹۰ - ۳ جنوری ۱۹۱۸ء۔ [2] خط نمبر ۹، خطوط ماجد بیر صفحہ ۱۰۲ - ۹ مئی ۱۹۱۸ء۔
[3، 4، 5، 6] خط نمبر ۸ - ۹۶ - ۹۹ - صفحات ۱۰۳ - ۱۱۷ - ۱۲۰ -

"آپ کی غزل داغ کی غزل سے ہر اعتبار سے بہتر ہے۔ عشرت سلمۂ نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ بلکہ ایک شعر کی نسبت انھوں نے کہا کہ یہ نہایت اچھا ہے میں نے اور اشعار بھی منتخب کیے، داغ کے رنگ میں۔ اگر داغ سے آپ بڑھیں تو آپ کی عالمانہ اور اخلاقی متانت پر داغ آجائے لیکن اس غزل میں تو میری نگاہ میں داغ پھیکے رہے۔

آپ کی غزل اور داغ کی غزل پر انشاء اللہ مفصل ریویو کر کے آپ کو لکھوں گا یا آپ سے کہوں گا تاکہ وجہ ترجیح آپ کو معلوم ہو اور آپ تو خود سمجھتے ہیں ..... اسی ہی زمین میں میری بھی ایک مختصر غزل ہے۔[1]"

مولانا نے یہ غزل داغ کی اس مشہور زمین میں کہی تھی:

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

غالباً مولانا نے یہ آخری غزل اکبر کے پاس بھیجی تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور ناظر دریابادی کی شاعری بھی غائب ہو گئی۔

مولانا عبدالماجد نے اپنی پہلی غزل کے متعلق یہ اعتراف کیا تھا کہ ان کی طبیعت پر رنگ حسرت موہانی کا غالب تھا اور آخری غزل انھوں نے داغ کے رنگ میں کہی۔ ان کے علاوہ انھوں نے غالب کے رنگ اور زمین میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ ان کی ایک غزل غالب کی اس زمین میں "بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا" ہے۔ غالب کی غزل ۹ اشعار کی ہے اور ناظر کی غزل ۱۲ اشعار کی جس میں ایک شعر (آخری) غالب کا ہے۔ غزل کا مزاج، ماحول اور موضوع زیادہ تر عاشقانہ اور عارفانہ[2] ہے

زینت حسن ہے خود اپنے پہ نازاں ہونا
نازش زخم جگر زہن نمکداں ہونا
عاشقی کیا ہے بجز کشمکش عقل جنوں
دل کو آفت میں پھنسا آپ ہی حیراں ہونا
زندگی اصل میں ہے اک قفس طائر روح
موت کیا ہے اسی زنداں سے گریزاں ہونا[1]
نامرادی مری ہمزاد نکلی، تو کیوں یارب!
میری قسمت میں لکھا صاحب ارماں ہونا
ہم شہیدان وفا موت کے خود ہیں مشتاق
کفر اس شرع میں ہے طالب درماں ہونا
اے اجل آس ہے تیری ہی، دم یاس الم
تجھ سے زیبا نہیں انساں کو ہراساں ہونا
راز ہستی وہ گرہ ہے جو کبھی کھل نہ سکی
فلسفی کے لیے آخر ہے پشیماں ہونا
اس جفاکار نے اب کی بھی تلافی تو کیا
اب مقدر میں تو ہے قبر کا مہماں ہونا
میرا انجام ہے دنیا کو اک عبرت کا سبق
دوستو تم نہ کبھی عشق میں غلطاں ہونا
سب کو آخر ہے فنا، حسن ہو یا عشق وفا
اہل ہستی کبھی ہستی پہ نہ نازاں ہونا
لذت درد کے منکر کو سنا دو یہ شعر
ناظر آساں نہیں غالب سا سخنداں ہونا
"کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

ایک دوسری غزل قافیے کی تبدیلی کے ساتھ غالب کی زمین میں لکھی یہ غزل دس اشعار کی ہے جبکہ غالب کی غزل میں ۱۱ اشعار ہیں:[3]

مدت ہوئی ہے پاس نزاکت کیے ہوئے
آہ و فغاں سے شور قیامت کیے ہوئے
لو دیکھو آ گیا نہ زباں پر کسی کا نام
مدت سے ہم تھے ضبط محبت کیے ہوئے

---

[1] خط نمبر ۱۰۹ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۹ء صفحہ ۱۲۶۔ [2] اس مضمون میں چکبست کا شعر ضرب المثل ہے۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب۔ موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا۔ [3] غالب کی غزل کا مطلع یہ ہے۔ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے۔ جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے۔

اگلا سا وہ سکون و متانت کہاں کہ اب
شوریدگی ہے بندۂ وحشت کیے ہوے

پھرتا ہے پھر نظر میں کسی کا خرام ناز
سامان فتنہائے قیامت کیے ہوے

وہ دل کہ جلوہ گاہِ سرور و نشاط تھا
اب غم ہے اس کو مدفن حسرت کیے ہوے

یہ شوق دید ہے کہ چلا ہیں عدو کے گھر
خودداری و غرور سے رخصت کیے ہوے

پھر دل میں ہے کہ دیکھیے جراٴت کا امتحاں
انجام کو حوالۂ قسمت کیے ہوے

اب دل میں ولولہ بھی نہیں کوئی ہو کہ ہوں
اندازۂ زبونی قسمت کیے ہوے

بیگانہ وار در پہ کسی کے چلا ہوں پھر
سامان صد نہفتن الفت کیے ہوے

ناظر کے ہوش و عقل بھلا اب کہاں درست
ہے ست اس کو یادِ الفت کیے ہوے

دونوں غزلوں پر غالب کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ لیکن وہ بات کہاں؟ ناظر دریابادی کا کلام منتشر صورت میں مختلف رسائل میں موجود ہوگا۔ ان رسائل کی طرف گزشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے بارگاہ رسالت میں منظوم خراج عقیدت بھی پیش کی تھی۔ ان کی متعدد نعتیں شائع ہو چکی ہیں۔ راقم الحروف کو اب تک صرف تین نعتیں نعتیہ مجموعوں میں مل سکی ہیں۔ ان کے ادبی جانشین اور صدق جدید کے ایڈیٹر مجبی عبدالقوی دریابادی نے مزید کلام ناظر فراہم کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ مولانا نہ صرف یہ کہ شاعری سے تائب ہو چکے تھے بلکہ وہ اپنے تمام کلام اور ڈرامہ "زود پشیماں" کو اپنی تصانیف سے خارج کر چکے تھے۔ مذکورہ بالا غزلوں کے علاوہ اب صرف تین غزلیں اور تین نعتیں اور رہیں میں اس کو اپنا ادبی فریضہ سمجھتا ہوں کہ ان کو ناظرین کی خدمت میں پیش کر دوں۔ کم از کم مولانا کا یہ شعری سرمایہ ہی یکجا ہو کر محفوظ ہو جائے۔

مجھ کو محروم کرم میری وفا نے رکھا
ان کو مشغول ستم ان کی جفا نے رکھا

دل یہ کیا جانے کہ شمشیر ہو کیا، تیر ہو کیا
اس کو بسمل ترے انداز و ادا نے رکھا

یہ ترا شعلۂ رخ گیسوے مشکیں سے چھپا
یا چھپا کر مہ تاباں کو گھٹا نے رکھا

اک دم ہو نہ سکی ہم سے کبھی طاعت حق
ایسا پابند ہمیں حرص و ہوا نے رکھا

شوخیاں تیری نہ ظاہر ہوئیں خود تجھ پہ کبھی
تجھ کو دھوکے میں تری شرم و حیا نے رکھا

مرگ و انجام کا بھولے سے کبھی آیا نہ خیال
دل کو غفلت میں سدا نشو و نما نے رکھا

کس زباں سے کہے اپنے تئیں ناظر آزاد
قید الفت میں تو اس زلف دوتا نے رکھا

ان کے انداز میں الفت نہ وفا ہوتی ہے
ہاں اگر ہوتی ہے کوئی تو جفا ہوتی ہے

پھر ہے بیتاب زباں عرض تمنا کے لیے
دیکھتے دیکھیے پھر مجھ سے خطا ہوتی ہے

تجھ کو کھلنے نہیں دیتی کبھی عصمت تیری
شوخیوں پر بھی تری مہر حیا ہوتی ہے

مل ہی جاتی ہیں کبھی اپنی نگاہیں ان سے
وہ بھی جب ایسی ہی تقدیر رسا ہوتی ہے

لذت وصل کے منکر تو نہیں ہم لیکن
لذت کاہش ہجر اس سے سوا ہوتی ہے

اس نے خودداری ناظر کو مٹا کر چھوڑا
یہ محبت بھی عجب سخت بلا ہوتی ہے

شورشِ جوشِ جنوں، اب جلوہ دکھلانے کو ہے
یعنی جو کچھ دل میں تھا، سب لب پہ آجانے کو ہے
رخصت اے ضبط و تحمل، الوداع اے پاسِ وضع
بندشوں سے اب زباں آزاد ہو جانے کو ہے
ہو چکی صبر و سکون و خامشی کی انتہا
جامِ ضبطِ آہ و نالہ اب چھلک جانے کو ہے
تو مبارک تم کو اے اہلِ تماشا سیرِ نو
دستِ بسمل سے عنانِ ضبط چھٹ جانے کو ہے
خوب کر مشقِ جفا لیکن ستمگر یہ بھی سوچ
کیا وفا کیشی کا جذبہ اس سے مٹ جانے کو ہے
بے ادب لب، ان سے کچھ کہنے کو ہیں پھر مضطرب
ان کے چہرے پر حیا کی پھر جھلک آنے کو ہے
سچ بتا ناظرؔ مسرت تجھ کو اتنی کیوں ہے کیا
ان کی محفل میں کوئی تیری غزل گانے کو ہے

مولانا نے حالی کی غزل گوئی پر تبصرہ و تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:

"حالیؔ شریف ہیں اور متین۔ اول میں بھی متین اور آخر میں بھی متین۔ ذہانت، شوخی، ظرافت، طنز، موجود ان کے یہاں سب کچھ، لیکن متانت کی شان سب پر غالب۔"

ناظرؔ کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ بس حالیؔ کے بجائے ناظرؔ لکھ دیجئے۔ کلامِ ناظرؔ کی مختصر اور جامع خصوصیت معلوم ہو جائے گی۔ فرق صرف یہ ہے کہ حالیؔ متانت کی شان کے ساتھ، شاعری کرتے رہے اس کو نئے آہنگ، نئے رجحانات اور نئے تقاضوں کا آئینہ دار بناتے رہے۔ اور ناظرؔ پر ادبی متانت اتنی غالب ہو گئی کہ ان کو شاعری سے تائب ہونا پڑا۔ قدرت ان سے جو کام لینا چاہتی تھی اس کی تکمیل کے لیے ضروری بھی یہی تھا کہ وہ شعر و شاعری سے باز آجائیں۔

دورِ الحاد یا مولانا کی زبان میں دورِ ظلمت سے دورِ ہدایت تک پہنچنے گے بعد مولانا کی دنیا ہی بدل گئی۔ RATIONALIST (عقلیت پسند) اور AGNOSTIC (لاادری) کہنے کہلانے پر فخر و ناز کرنے والا مذہب و تصوف کے رنگ میں ایسا رنگا کہ رب العالمین کا سچا بندہ اور رحمۃ للعالمین کا سچا غلام بن گیا۔ محبِ رسول کے اس متوالے نے کس ناز سے کہا ہے:

پڑھتا ہوا محشر میں جب صلِ علیٰ آیا
رحمت کی گھٹا اٹھی اور ابرِ کرم چھایا
جب وقت پڑا نازک، اپنے ہوئے بیگانے
ہاں کام اگر آیا تو نام ترا آیا
پرسش تھی گناہوں کی اور یاس کا تھا عالم
بیکس کی خبر لینے محبوبِ خدا آیا
یہ نام مبارک تھا یا حق کی تجلی تھی
دم بھر میں ہوا فاسق ابدال کا ہم پایا
چرچے ہیں فرشتوں میں اور رشک ہر زاہد کو
اس شان سے جنت میں شیدائے نبی آیا
کیوں نزع کی دشواری آسان نہ ہو جاتی
تھا نام ترا لب پر اور سر پہ ترا سایا
اک عمر کی گمراہی، اک عمر کی سرتابی
جز تیری غلامی کے آخر نہ مفر پایا
حکمت کا سبق چھوڑا، عزت کی طلب چھوڑی
دنیا سے نظر پھیری، سب کھو کے تجھے پایا
سمجھے تھے سیہ کاری اپنی ہے فزوں حد سے
دیکھا تو کرم تیرا اس سے بھی سوا پایا
فاسق کی ہے یہ نیت، پر ہو تو تری امت
ہاں ڈال تو دے دامن کا اپنے ذرا سایا

طلب دید بڑھتی جا رہی ہے دیارِ محبوب بے چین کیے دے رہی ہے۔ اس عالمِ کرب و اضطراب میں دل یہ آرزو کر رہا ہے۔

اور اک شب تو با اثر ہوتی	وہ تجلی حق ادھر ہوتی
پائے اقدس پہ چشم تر ہوتی	شب گزرتی یونہی سحر ہوتی
نالۂ نارسا رسا ہوتا	سرمۂ چشم خاکِ در ہوتی

(بقیہ صفحہ ۷۶ پر)

اقبال ماہر الٰہ آبادی

روشنی کا پیکر

کرتے تھے جس کا دل سے فرشتے بھی احترام
وہ پاک باز عابد و زاہد نہیں رہا
اب کون ہوگا سینہ سپر اہلِ جور سے
اس دَور کا وہ مردِ مجاہد نہیں رہا
اب کون لے گا ہاتھ میں انصاف کا علم
میدانِ حرّیت کا وہ خالد نہیں رہا
اہلِ خرد میں مقصدِ فرزانگی نہیں
علم و ادب کا آج وہ ناقد نہیں رہا
لائے گا کون اب یہاں پیغامِ صبحِ نو
شہرِ تجلّیات کا قاصد نہیں رہا
اک مضمحل سکوت ہے بزمِ حیات میں
رونق تھی جس سے آج وہ ماجد نہیں رہا

مومن خاں شوقؔ

مولانا عبدالماجد

اک ایسی شخصیت ہم سے بچھڑ کر
روشنی کا علم کا، اخلاص کا جادہ بنی ہے:
شرافت فکر و فن، تہذیب و دانش
رواداری، محبت، حق شناسی
یہ سب اس شخصیت کی فکر و فن کا ایسا ورثہ ہیں
جنھیں آگے بڑھانا ہے، جنھیں تابندہ رکھنا ہے
تو اے لوگو!
قلم کو آگہی کی روشنائی میں ڈبو کر
حرفِ حق لکھو،
خدا فہمی کی دولت، دین و دنیا کا قبالہ ہے
جنوں تحریر میں لاؤ
وفا کے پھول مہکاؤ
خرد کو آگہی بخشو
تو ممکن ہے وہ شخصیت جو، اب ہم میں نہیں ہے
روح کو اس کی قرار آئے
خرابے میں بہار آئے

مولانا عبد الماجد دریابادی

کی

محفل میں

مولانا سے ہماری سلام دعا کوئی تیس سال پرانی تھی۔ مگر اس کا مولانا کو علم ہی نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ جہاں کسی بہت بڑی تقریب میں مولانا کو میر محفل دیکھا اور انتہائی عقیدت کے ساتھ ایک ہی نہیں بلکہ اکثر بار سے گھبراہٹ کے کئی کئی سلام جھاڑ دیئے۔ ایک آدھ بار انھوں نے دیکھا بھی مگر اتنا سرسری کہ فیصلہ نہ کر پاتے کہ انھوں نے ہمیں دیکھا یا صرف اُن کی نگاہوں نے کروٹ بدلی ہے؟ اس پر تپاک یک طرفہ ریفلک کا خوشگوار سلسلہ کوئی دس سال تک جاری رہا۔ مگر مولانا سے ملاقات کا کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔

اس زمانے میں ہم صدق جدید پابندی سے پڑھتے ان کی شگفتہ نثر اور تیکھے اسلوب کے شروع سے عاشق تھے۔ ان کی جو بھی تصنیف ہاتھ لگ جاتی چاٹ جاتے۔

مولانا کے خاندان کے تقریباً سبھی چھوٹے بڑوں سے ہمارے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ حمید الزماں، وحید الزماں اور عقیل ہاشمی تو خیر ہمارے "نوری ہوٹل" کے روزانہ کے احباب میں تھے مگر کبھی کبھار آفتاب بھائی (حکیم عبد القوی دریابادی) اور ہاشم قدوائی صاحب سے بھی یاد اللہ ہو جاتی۔ اس حلقے میں مولانا کے بارے میں اتنی باتیں ہوتیں کہ ان سے ملاقات کا اشتیاق بڑھتا ہی جاتا مگر معاملہ یہ ہوتا کہ جس محفل میں مولانا صدر ہوتے ہم اسی محفل کے آخر میں جوتیوں کے قریب پائے جاتے۔ بزرگی اور خوردی کا فرق اتنا زیادہ تھا کہ ملاقات ہوتی تو کیسے؟ پھر وہ اپنے زمانے کے جید عالم اور ہم اتنے ہی بڑے جاہل۔ مولانا وقت کے پابند ہم آزاد بغیر پہلے سے ملاقات کا وقت مقرر کیے اُن سے ملاقات ناممکن، پھر مرید کی مرشد تک باریابی ہو تو کیسے ہو۔؟

جب ہم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ گئے تو رسالہ ادیب جو جامعہ اردو کا ترجمان تھا، اس کا نائب مدیر ہونے کا ہمیں شرف حاصل ہوا۔ رسالہ کے اڈیٹر قریشی نے ادبی انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ چنانچہ مولانا سے انٹرویو کی خدمت ہمیں اور عثمان غنی کو سونپی گئی۔ چونکہ وہ بھی ادیب کے نائب مدیر تھے۔

دو ایسی شخصیتوں میں ملاقات کے سامان ہونے لگے۔ ایک وہ جو اپنی انتہا پر تھی۔ دوسری وہ جس کی ابتدا کا ابھی آغاز بھی نہ ہو سکا تھا۔ آفتاب بھائی سے ملے انھوں نے دوسرے دن بتایا کہ "اگلے جمعہ کو ٹھیک ۵ بجے شام کو، مولانا نے دس منٹ کا وقت انٹرویو کے لیے دیا ہے۔"

ہمارے خوشی کے اگلے جمعہ تک کا وقت کاٹے نہ کٹ رہا تھا اور ہمارے ڈر کے سوال بار بار ٹھیک کیے جا رہے تھے۔ غرض وقت کٹ گیا اور ہم دونوں وقت مقررہ پر مولانا کے علم کدے پر پہنچ گئے! ٹھیک ۵ بجے ہمیں کوٹھے پر بلایا گیا۔ فرش پر محفل جمی تھی۔ بیچ میں مولانا عبد الماجد دریابادی بیٹھے اور گول دائرے میں دو زانو مودب، انتہائی اہم اور محترم شخصیات جلوہ گر تھیں۔ حضرت مولانا علی میاں (سید ابو الحسن علی ندوی) حکیم خواجہ شمس الدین مرحوم مولانا یونس نگرامی مرحوم، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور جہاں تک حافظ

اس لئے دیا ہے کوئی یورپی مستشرق صاحب بھی تھے۔ مولانا نے بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمارے سوالات کے مختصر مگر فکر انگیز جواب لکھوائے۔ اس دوران کشمیری چائے اور پر تکلف ناشتے سے تواضع ہوئی۔ مولانا اس دوران کوئی ایسا پھڑکتا ہوا فقرہ یا جملہ چسپت کرتے، داغ یا ریاض کا ایسا برمحل شعر پڑھتے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی۔ ہماری معلومات میں یہ اضافہ تھا کہ مولانا نہ صرف نئے ادب سے پورے طور پر واقف ہیں بلکہ ہماری تحریریں بھی پڑھتے اور پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے ادب میں "مارشل لا" اور "مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہاؤس میں" کا ذکر اس انداز میں کیا کہ پھر خود ہمارا دل زمین پر پاؤں رکھنے کو نہ چاہا، طبیعت میں اُس قسم کا اعتماد لہریں مارنے لگا جسے لوگ غرور کہتے ہیں۔

یہ تھی مولانا عبد الماجد دریابادی سے ہماری پہلی ملاقات جس نے دل سے ان کی ڈانٹ ڈپٹ کا خوف نکال دیا مگر علم کی ہیبت کچھ بڑھا ہی دی۔

اس کے بعد ہماری جو کبھی کتاب چھپتی اسے پیش کرنے کے بہانے مولانا کی خدمت سے بہرہ یاب ہوتے۔ جب ہم نے اودھ پنچ پھر سے جاری کیا تو نہ صرف مولانا نے بڑے شوق سے ایک دلچسپ پیغام بھیجا بلکہ ہماری طلبی بھی ہوئی۔ "منشی سجاد حسین" اور اودھ پنچ مولانا کی کمزوری تھے ۔۔ اوپر سے ہمارا علیگ ہونا ان کے لیے نہایت دل خوش کن تھا۔ ہم گئے تو کچھ تو علی گڑھ کی ہوا تھی اور کچھ اودھ پنچ کی اڈیٹری کی۔ سوٹ پہنے بغل میں پورٹ فولیو دبائے منھ سے سگرٹ کا دھواں نکالتے پہنچ گئے اور پہنچے بھی کوئی دو منٹ تاخیر سے۔ یہ دو منٹ مولانا نے ٹہل کر گزارے اور بار بار پوچھتے کہ آئے نہیں؟ یہ بات تو ہمیں خیر بعد میں عقیل ہاشمی صاحب کے والد محترم سے معلوم ہوئی۔ ہوا یہ کہ مولانا نے حاضرین میں ہماری بڑی ہوا باندھی تھی:۔

"ماشاء اللہ بڑے سعادت مند ہیں۔ بڑے ہونہار ہیں۔
بڑے صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ کیوں نہیں! کیوں نہیں آخر
علیگ جو ٹھہرے ۔۔ اوپر سے اڈیٹر اودھ پنچ۔"

شامت کی۔ مارہم اس اشتیاق وتحسین سے لاعلم کنیڈ پر ایکن سے دھواں اڑاتے پہنچے۔ اس حلیہ اور انداز میں دیکھ کر مولانا کو شرمندگی تو ہوئی مگر چونکہ وہ ہم سے بے حد خوش تھے اس لیے ذرا سی ہچکچاہٹ یا توقف کے بعد دونوں ہاتھ بڑھا کے فرمایا:۔

"آپ کا جمال بڑے انتظار کے بعد طلوع ہوا!"

اس کے ساتھ کوئی شعر بھی پڑھا جس کا مطلب تھا کہ "جس کا انتظار ہوتا ہے۔ وہ انتظار تو کراتا ہی ہے۔ وہ ملاقات اور اس کا لطف ہی کیا جس میں کوئی انتظار نہ ہو۔"

اب فوری مسئلہ مولانا کے نزدیک ہماری عظمت کی بحالی کا تھا۔ محفل میں جو اہم ہستیاں تھیں ان میں بیشتر باہر کی تھیں جیسے قاری طیب صاحب مولانا عبد الرؤف جھنڈا نگری، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی وغیرہ ۔۔ انھوں نے فوراً اودھ پنچ پر ہم سے باتیں شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمارا میدان تھا۔ منشی سجاد حسین کی بے نقط تحریروں کا ذکر چھڑ گیا۔ مولانا اس بات سے بہت خوش ہوئے کہ قسطوں میں چھپنے والی ناول جھپلو دراصل منشی صاحب کی تصنیف تھی۔ ان کا خیال تھا کہ کتابی شکل میں اسے چھپنا چاہیے تھا۔ اگر یہ منشی صاحب کی تصنیف تھی تو پھر اسے کتابی شکل میں چھپوانے میں انھیں کیا تکلف تھا ۔۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا ۔۔ "میں کیا عرض کر سکتا ہوں! ناول جھپلو کتابی شکل میں میرے پاس موجود ہے۔"

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے اس جواب کا حاضرین پر کتنا رعب پڑا ہوگا۔ مولانا نے ایک فاتحانہ نگاہ سب پر ڈالی اس کے بعد پوچھا:۔

"اودھ پنچ کی فائلیں آپ کے پاس ہیں ۔۔؟"

"جی ہاں!"

"کتنی ۔۔؟"

"بیشتر!"

اب وہ اتنے مطمئن ہو گئے کہ انھوں نے اپنے پسندیدہ موضوع یعنی "اکبر الٰہ آبادی" پر بات شروع کر دی۔ انھوں نے پوچھا کہ "اکبر کی

نثر کے بارے میں آپ نے لکھا تھا کہ اس میں آپ کو دلچسپی ہے۔ کچھ جمع کی یا ابھی تلاش جاری ہے ۔۔؟"

عرض کیا ۔۔

"تلاش تو ایک ایسا عمل ہے جس میں ٹھہراؤ کتاب چھپنے یا کام مکمل ہونے کے بعد بھی ممکن نہیں مگر بڑی حد تک ہر قسم کے نمونے جمع کر لیے ہیں۔"

انھوں نے دریافت کیا :۔

"جیسے ۔۔؟"

عرض کیا :

"ایک تو اودھ پنچ میں شائع ہونے والے اکبر الٰہ آبادی کے مضامین دوسرے فتنہ اور عطرِ فتنہ کے مضامین۔ تیسرے اکبر الٰہ آبادی کے خطوط جن میں بیشتر وہ ہیں جو اکبر نے آپ کو لکھے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی سنجیدہ تحریروں کے نمونے اور ان کے تنقیدی مضامین ۔۔"

مولانا نے پوچھا :

"اکبر کی نثر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟"

عرض کیا :

"بے حد خراب ! اکبر دراصل نظم کے بادشاہ اور نثر کے فقیر تھے۔ اگر ثبوت نہ ہوتا کہ واقعی یہ تحریریں اکبر کی ہیں تو شاید یقین بھی نہ آتا اور نہ یقین ہی کسی کو دلایا جا سکتا کہ یہ اکبر کی تحریریں ہیں ۔۔"

مولانا نے فرمایا :

"پھر ان کی اشاعت سے فائدہ ۔۔؟"

عرض کیا :

فائدہ تو بہت ہوگا۔ اول تو یہ تحریریں اکبر کی ہیں ۔ یہ اہمیت اپنی جگہ ۔۔۔ اور اس سے زیادہ فائدہ یہ ہوگا کہ حضرت اکبر کے داخلی پیچ و خم سامنے آئیں گے ۔۔"

چونکہ اکبر کا معاملہ تھا اس لیے مولانا بے چین تھے لہٰذا فرمایا :

"آپ اس کا مسودہ دکھائیں تو کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔"

"ان شاء اللہ اگلی بار مسودہ لے کر حاضر ہوں گا ۔!"

"ان شاء اللہ ۔!"

گویا منظوری تھی مزید ایک اور ملاقات کی۔ چنانچہ اگلے ہفتے ہم مضامینِ اکبر کا مسودہ لے کر پہنچ گئے۔ مولانا نے اسے بہت غور اور دلچسپی سے دیکھا اور بولے :

"بہت جمع کر لیا ہے۔ ہر قسم کی تحریروں کے نمائندہ نمونے شامل ہیں۔ مگر اس پر مقدمہ بہت طویل ہو گیا ہے ۔!"

عرض کیا :

"جی ہاں سو فل اسکیپ کا ہے ۔"

فرمایا ۔ اس میں اکبر کی شاعری سے بحث فضول ہے ۔ ساری بحث نثر سے ہونا چاہیے اور ساری مثالیں نثر کی ہونی چاہیے۔ مشورہ بہت ہی مفید تھا۔ جس پر عمل کا مطلب سو فل اسکیپ از سرِ نو لکھنا۔ مگر اس کو بھی ہم نے بہت خوشی سے منظور کر لیا۔

مولانا کا معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد ملاقات کرتے اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے خاتون منزل سے قریب موتی بھائی کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے۔ سارے ملاقاتی ساتھ ہوتے کچھ ان کے ساتھ نماز پڑھنے چلے جاتے بقیہ وہیں سے رخصت ہو جاتے۔ ہم سے مولانا اس لیے بھی خوش تھے کہ ہم ساتھ جا کر نماز پڑھتے۔

قمر رئیس دہلی سے آئے ہوئے تھے۔ انھیں مولانا سے ملنا اور "پریم چند" پر اپنی کتاب پیش کرنا تھی۔ ہم نے فوراً آفتاب بھائی سے مل کر ملاقات کا وقت اگلے ہی دن مقرر کرا لیا۔ قمر بھائی بڑے خوش ہوئے۔ ہم دونوں مقررہ وقت پر مولانا کے حضور میں پہنچ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ قمر بھائی خاصے مرعوب بلکہ نروس سے ہیں مولانا نے شعر و ادب اور روس کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ خوش قسمتی سے مولانا ان سے بے حد خوش ہوئے یہ دونوں مولانا کی کمزوری اور دونوں پر قمر بھائی کی نظر خاصی گہری تھی۔ ملاقات بے حد معلومات افزا ثابت ہوئی۔ بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ شاید اس ملاقات میں احتشام صاحب بھی شریک تھے۔ بہت دلچسپی اور غور سے دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔

دوسرے دن ہم لوگ جا رہے تھے، سامنے سے مولانا تشریف لا رہے تھے۔ ہم دونوں سگریٹ پی رہے تھے مولانا کو دیکھ کر ہم دونوں نے احتراماً اپنی اپنی سگریٹ چپکے سے پھینک دی یہ بات مولانا نے دیکھ لی۔ ہماری اس سعادت مندی پر دل ہی دل میں وہ بے حد خوش ہوئے اور انھوں نے کئی بار مختلف حضرات سے ہماری اس سعادت مندی کی بے حد تعریف کی۔

مولانا کے مزاج میں شدت بے حد تھی اگر خوش تو بہت خوش اگر خفا تو بس خفا۔ جس کا فائدہ ہمیں اس لیے ہوا کہ وہ ہم سے اتنے خوش تھے کہ ہماری ہر بات میں انھیں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آ جاتی۔ وہ اس لیے بھی خوش تھے کہ اودھ پنچ کی ایک نہ ایک جلد منگواتے۔ جس کے لیے اُن کا رقعہ آتا جس میں لکھا ہوتا کہ فلاں دن جلد واپس کر دی جائے گی۔" چنانچہ ہم پڑھنے کے لیے اودھ پنچ کی جلدیں بھیجتے رہتے۔ واپسی وعدے کے مطابق بڑی پابندی سے ہوتی۔ اثر لکھنوی مرحوم بھی اسی طرح جلدیں منگاتے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ وہ ایک ماہ کے لیے منگاتے اور مولانا ہفتہ بھر یا اس سے بھی کم کے لیے۔

ایک دفعہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی فرمائش تھی کہ ہم "منشی سجاد حسین" پر ایک کتاب لکھیں۔ اس سلسلے میں منشی صاحب کے حالات انھوں نے بڑی تفصیل سے بتائے اور کچھ نوٹ بھی کرائے۔ ان دنوں "اسٹ گرہ" کا بڑا زور تھا۔ ایک ہل چل تھی کہ فلاں دن قیامت آ جائے گی۔ کسی نے قیامت کا وقت پوچھا۔ مولانا مسکرائے اور بولے۔ "آپ نے قیامت سے کہ قیامت پر اب تک قلم نہ اٹھایا۔"

عرض کیا۔ "ضرور اٹھے گا۔" فرمایا:

"بات تو تب ہے کہ عین قیامت کے دن یہ حشر برپا کرے۔"

اس پر سب بہت محظوظ ہوئے۔ ہم نے گھر آتے ہی ایک مضمون "آتی جاتی قیامت" لکھ ڈالا اور قومی آواز میں اسی دن شائع کرایا جس دن "اسٹ گرہ" پڑ رہی تھی۔ مولانا نے پسند فرمایا اور ہمیں ڈھائی سطر تعریف سے نوازا۔ جس میں پوچھا تھا۔ "آخر نئے پیسے کا حساب کیا ہے؟ سمجھائیے۔" نئے اور پرانے پیسے کے حساب میں، سب چکر میں تھے ہم نے فرمائش قبول کرتے ہوئے "نیا پیسہ" لکھ ڈالا۔

اودھ پنچ پر مولانا سے گفتگو کا ایک خوش فائدہ یہ بھی ہوا کہ ایک صاحب جو اس محفل میں موجود تھے۔ اور دل چسپی سے گفتگو سن رہے تھے۔ اُن کے پاس اودھ پنچ کی دو جلدیں تھیں جن کے چار سو روپے تک لگ چکے تھے وہ پانچ سو روپے چاہتے تھے اور پیسے کے معاملے میں بہت سخت آدمی تھے مگر مولانا کے اتنے عقیدت مند تھے کہ دوسرے دن صبح ہمارے پاس آئے اور دونوں جلدیں ہماری نذر کر دیں۔

مولانا کی نواسی کی شادی تھی ہمیں بھی انھوں نے یاد فرمایا جب ہم گئے تو ہم نے ایسا منظر احترام و عقیدت کا دیکھا جو شاید کبھی فراموش نہ کر سکیں۔ دو وزیر مولانا کے پاؤں داب رہے تھے۔ حیات اللہ انصاری عشرت علی صدیقی اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب سے مولانا باتوں میں مصروف تھے۔ اتنے میں مولانا رضا انصاری فرنگی محلی نے کچھ فرمایا مولانا نے جواب میں داغ کا ایک پھڑکتا ہوا شعر پڑھا چاروں طرف حلقہ باندھے اہل شہر بلکہ اہل ادب کھڑے تھے۔ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اس پر رضا صاحب نے امیر مینائی کا کوئی شعر پڑھا اور مولانا

مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

تک پہنچ گئے اور دارا و سکندر کی چھڑ گئی۔ مجھے اشعار یاد نہیں رہے مگر اتنا یاد ہے کہ رضا صاحب نے بڑے قیامت کے اشعار سنائے تھے۔

مولانا کے یہاں تقریبات اور ان کی محفل میں زندگی میں پہلی بار بہت سی برگزیدہ ہستیوں سے ہمارا تعارف ہوا یا ان کی زیارت کا ہمیں شرف حاصل ہوا۔

ہمارے ایک عزیز دوست شعیب صاحب ہیں جن کی شادی میں ہم دریاباد گئے۔ مولانا کے خاندان کی لڑکی تھی۔ مولانا تشریف لائے ہم سلام کرنے پہنچے۔ بہت محبت سے ملے۔ بلکہ ہم ہی سے باتیں کرتے رہے۔ ہمارے ساتھ سلام صاحب بھی تھے انھوں نے چپکے سے

فوٹو گرافر کو اشارہ کیا اس نے تصویر کھینچ لی۔ ہمارا ڈر کے مارے بُرا حال تھا کہ وہ بُرا نہ مان جائیں مگر وہ بُرا اس وقت بھی نہ مانے جب نکاح کے بعد ہم چھوہارے لوٹنے کے لیے چھوہاروں کی سنیپ پر بندر کی طرح ٹوٹ پڑے۔ یہ دوسری بات ہے کہ چھوہارے جیب میں رکھنے کے بعد ہمیں خیال آیا کہ "مولانا نے نہ دیکھ لیا ہو — ؟" مگر وہ مسکرا رہے تھے۔

سہ پہر کو مولانا نے اپنے علم کدہ پر ہمیں بلایا۔ مولانا عقیدت مندوں سے گھرے ہوئے تھے، بڑی شفقت فرمائی، اپنے برابر بٹھایا۔ دریاباد اور تاریخ دریاباد پر معلومات کے خزانے اُگلنے کے بعد فالودہ سے عزت افزائی کی۔

یوں تو مولانا کی خدمت میں حاضری کا بارہا شرف حاصل ہوا، آخری ملاقات اُن سے مسجد کریم شاہ کے سامنے ہوئی عید کی نماز پڑھ کر مولانا گاڑی پر بیٹھ چکے تھے۔ علیم بھائی نے چلا کر کان میں کہا — "جمال پاشا — احمد جمال پاشا" — مولانا خوش ہوئے، مصافحہ کے بعد پوچھا۔ "پروفیسر اناّمیری شمل کو آپ لوگوں نے بلایا تھا۔"

عرض کیا — "جی ہاں! تصوف، خصوصاً علامہ اقبال پر جلال الدین رومی کے اثرات پر انھوں نے بے حد پُر مغز تقریر کی تھی۔"

فرمایا:۔

"وارث کرمانی انھیں میرے یہاں نہیں لائے، اشتیاق تھا ملاقات کا — !"

عرض کیا۔ "ڈاکٹر کرمانی کے ساتھ شمل دیوہ شریف گئی ہیں۔ غالباً واپسی میں آپ کے یہاں حاضر ہوں گی۔"

اہلیہ کے انتقال اور مسلسل بیماریوں نے مولانا کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ معلوم ہوا مولانا بہت بیمار ہیں فوراً عشا کی نماز کے بعد "خاتون منزل" پہنچا۔ ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ آپ لوگ بھی دیکھ لیجیے — اپنے زمانے کا جلیل القدر، عالم جس نے دنیا سے علم و ادب پر نصف صدی سے زائد حکمرانی کی تھی اُس پر موت کی غشی طاری تھی۔ یہ سلسلہ کئی دن سے جاری تھا یہ ان کا آخری دیدار تھا۔ دل بھر آیا۔ دنیا کی بے ثباتی پر۔ اسی دن شب کی گاڑی سے سیوان واپس چلا آیا۔ دوسرے دن ریڈیو نے ان کے انتقال کی خبر سنائی اور بے ساختہ مجھے مولانا کا وہ مصرعہ بار بار پڑھنا یاد آ گیا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

*

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "نیا دور" کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجۂ ذیل تفصیلات شایع کیے جاتے ہیں

(۱) مقامِ اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری اشوک ڈر۔ ہندستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ اترپردیش، الٰہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ	شری بالکرشن چترویدی ہندستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش لکھنؤ
(۵) ایڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری خورشید احمد۔ ہندستانی۔ ایڈیٹر "نیا دور" محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ، لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے کل سرمایے کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔	نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں بالکرشن چترویدی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
(دستخط) بالکرشن چترویدی (پبلشر)

مہندی پرتاپگڈھی

صاحبِ ایماں اٹھا

(مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ماتم میں)

بجھ گئی اک شمعِ علم و آگہی — چھا گئی صحنِ ادب میں تیرگی
موت نے اک وار ایسا کر دیا — لُٹ گئی بزمِ سخن کی روشنی

اٹھ گیا اک تاجدارِ فکر و فن — ہو گئے سُونے در و بامِ سخن
کُنجِ تنہائی میں ہو گوشہ نشیں — جو خود اپنی ذات میں تھا انجمن

لُٹ گئی ہو محفلِ دیدہ وراں — کس طرف جائے ادب کا کارواں
وہ سخن سنج و سخنور ہی نہیں — جس پہ نازاں تھی مری اردو زباں

محفلِ تہذیب کا رُوحِ رواں — حیف وہ شیریں سخن وہ نکتہ داں
چومتی تھی جسکے خود منزل قدم — اب کہاں ہو وہ امیرِ کارواں

جس نے پایا تھا سراغِ زندگی — گُل ہوا اب وہ چراغِ زندگی
زیست کے اسرار اب کھولے گا کون — ہو گیا تاریک باغِ زندگی

دیدہ ور اٹھا، وہ نکتہ داں اٹھا — حیف پھر اک صاحبِ ایماں اٹھا
جو مفسّر تھا کلام اللہ کا — بزم سے وہ حاملِ قرآں اٹھا

مدتوں روئیں گے اس کو اہلِ فن — مدتوں سونی رہے گی انجمن
اب نہیں آنے کو ایسا با کمال — حیف مہندی لُٹ گیا شہرِ سخن

مولانا عبدالماجد کی شاعری — بقیہ صفحہ

کچھ تو ارمانِ دل نکل جاتا — کچھ تو تسکینِ چشمِ تر ہوتی
نقشِ پا کو لگاتے آنکھوں سے — یوں دوائے دل و جگر ہوتی

حسرتِ دید دل میں لب پہ درود — اب تو ہر شب یونہی بسر ہوتی
ہے حضوری نصیب میں شاید — ہند میں اب نہیں بسر ہوتی

مولانا محمد علی جوہر مرحوم اسیرِ زنگ تھے، کہ رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔ مولانا نے اسی قید میں ایک نعت لکھی

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں

مولانا عبدالماجد نے بھی "آقائے دو عالم" کی خدمت میں درود و دل کی سوغاتیں پیش کیں:

وعدے ہیں شفاعت کے تسکین کی ہیں باتیں — آقائے دو عالم کی دیکھو تو مداراتیں
غم خواریٔ امت سے اک آن نہیں غافل — ظاہر میں تو ہے پردہ پردے میں ملاقاتیں

محشر میں اماں پائی صدقے میں درودوں کے
دشواری میں کام آئیں بھی جوڑی سوغاتیں

دارین کے کیا جلوے فردوس کے کیا نقشے — سب کا یہی دولھا ہے سب اس کی ہیں باراتیں
ان کا نام مبارک ہے اور ورد، درود دل کا — سارا یہی توشہ ہے کل ہیں یہی سوغاتیں

دیدار کی حسرت ہے اور نام کی رٹ ہر دم
اس شغل میں دن گزرے اس دھن میں کٹیں راتیں

ماجد نا امید پر بھی رحمت کی نگہ ہو جائے — وابستہ نگاہوں سے لاکھوں ہیں کراماتیں

ایک ایک لفظ عشقِ رسول میں ڈوبا ہوا ہے۔ "سوغات" کم سہی، لیکن جو کچھ ہے، وہ عقیدت و محبت اور خلوص کے سچے چاہنے والا کا حقیر نذرانہ ہے، اس نذرانہ کو بھی شرفِ قبولیت نہ حاصل ہوا ہو گا تو کس کو ہو گا۔ زندگی ان سچے اور میٹھے بولوں کو نصیب نہ ہو گی تو اور کس کو ہو گی؟

ناظر کا سرمایۂ شاعری انتہائی کم ہونے کے باوجود، زبان و بیان، فکر و فن کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے اور صالح جذبات کا آئینہ دار ہے۔

٭

امیر حسن نورانی

ایک عظیم دانش ور اور

مولانا عبدالماجد — جامع الحیثیات انسان

مولانا عبدالماجد کی شخصیت اتنی تہہ در تہہ اور ایسی پہلو دار ہے کہ اس پر روشنی ڈالنا آسان نہیں ہے، ایک طرف وہ علمائے اسلام میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے تو دوسری طرف اردو ادیبوں کی صف اول میں اپنی امتیازی خصوصیات کے باعث عدیم المثال رہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب، بہترین طنز نگار اور بلند پایہ صحافی تھے۔ اس دور میں ایسی جامع ہستی کا بدل تو نظر نہیں آتا لیکن بظاہر مستقبل میں بھی ایسی شخصیت کے ہونے کی امید نظر نہیں آتی۔ مولانا عبدالماجد اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت تھے کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جب وہ شکوک و شبہات کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے اس وقت ان کو علامہ شبلی نعمانی جیسے عظیم المرتبت عالم مورخ اور ادیب نقاد کی رہنمائی میسر آگئی۔ اس کے علاوہ رئیس الاحرار فدائے ملت مولانا محمد علی جوہر کی قدر شناس نگاہوں نے مولانا عبدالماجد کو اپنا رفیق کار بنا لیا۔ ایک طرف حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اپنی بزرگانہ شفقتوں کا سہارا دیا۔ اس طرح ملحدانہ افکار و نظریات کی ظلمتوں میں کچھ عرصہ ہاتھ پاؤں چلانے کے بعد وہ علم و ہدایت، حکمت و معرفت کی روشنی تک پہنچ گئے۔

مولانا عبدالماجد کی زندگی کا یہ نہایت اہم واقعہ اور ان کے علم و فضل کا یہ انتہائی کمال ہے کہ وہ باقاعدہ مسٹر سے مولانا بن گئے جب کہ انھوں نے کسی دینی مدرسہ میں نہ تو تعلیم حاصل کی نہ کسی بڑے عالم سے احادیث فقہ اور تفسیر کا درس لیا۔ عربی زبان جتنی کچھ سیکھی وہ اسکول و کالج میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیکن جب انھوں نے اس راہ میں قدم رکھا تو برسوں کا سفر دنوں میں طے کر لیا۔ اسلامی علوم اور عربی زبان میں قابل رشک تبحر حاصل کیا، علماء نے ان کو خوش آمدید کہہ کر اپنی صف میں جگہ دی، اور ان کو ایک زبردست عالم کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اب وہ مفکرین اسلام میں اپنے اخلاص، تقویٰ، دیانت اور مجتہدانہ بصیرت کے باعث بلند مقام پر فائز نظر آنے لگے۔ انھیں دیکھ کر اور ان کے علمی کارناموں پر نظر ڈال کر خیر القرون کے قریب ترین زمانوں کے علماء کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کفر و الحاد کے اس دور میں مولانا کے بصیرت افروز مضامین اور حیات آفریں مقالات کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ ہر مسئلہ کو علم و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے اور تحقیق میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے، اور معاملات کو قرآن و سنت سے ہم آہنگ رکھنے میں پوری احتیاط برتتے۔ اسلامی تعلیمات اور نظریۂ حیات پر مخالفین کی یلغار کا مقابلہ جس طرح ان کے قلم نے کیا اس کی مثال کم ملے گی۔ خاص طور پر عیسائی علماء نے جس طرح اسلام کو ہدف ملامت بنایا اور ہر طرح بدنام کرنے کی کوشش کی جس سے مسلمان نوجوانوں کے ذہن و دماغ مفلوج ہو رہے تھے مولانا نے علمی و فکری انداز سے ان کا مقابلہ کیا اور اس میدان کے وہ تیز رفتار شہسوار ثابت ہوئے۔ ان کے اثر سے بہت سے دوسرے علماء اور تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں نے بھی مولانا کی تقلید کی اس طرح مخالفین اور معاندین اسلام کے مقابلہ میں ایک مستحکم محاذ وجود میں آگیا۔ یہ حقیقت ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں دینی بیداری پیدا کرنے والے متعدد محاذ مختلف ناموں اور تحریکوں کی صورت میں مصروف عمل ہیں اور اس میں مولانا عبدالماجد کی طویل قلمی جدوجہد کا بہت بڑا حصہ ہے جس کا اعتراف آنے والی نسلیں بھی کریں گی۔ پہلے ہفت روزہ سچ اور اس کے بعد صدق اور صدق جدید اخبار کے ذریعہ مولانا نے ایک طرف تو اردو انشا پردازی

کا معیار بلند کیا اور دوسری طرف اسلامیات داخلاقیات کی تعلیم کو انوکھے اور دل نشین پیرایۂ بیان میں پیش کر کے افہام و تفہیم کی نئی راہ دکھائی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"دنیا میں اچھائی اور برائی کا ہونا سب مانتے ہیں، پر جھگڑا اس میں آکر پڑتا ہے کہ اچھائی اور برائی کیا ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ اچھی وہ چیز ہے جسے باپ دادا اچھا کہتے آئے ہیں، کسی نے اچھائی اور برائی کی پہچان کے لیے عقل کو سہارا بنایا ہے، اور کسی کا کہنا یہ ہے کہ سرکاری قانون کو مانتے چلے جانا ہی اچھائی ہے۔"

اس کے بعد مولانا نے اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی اس دل پذیر انداز میں کی ہے:

"مسلمان کو جس راستہ پر چلنا ہے وہ ان سب سے الگ ہے۔ اس نے جب دل کی سچائی کے ساتھ ایک بار کلمہ پڑھ لیا تو خدا کے سوا سب کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔ اب نہ اسے پروا رہنی چاہیے کہ اس کے باپ دادا کیا کرتے چلے آئے ہیں نہ اس کی فکر ہونی چاہیے کہ گرد و پیش کے رسم و رواج کیا ہیں اور نہ یہ دردسر خریدنا چاہیے کہ حکمت و فلسفہ والے کیا کہتے ہیں، نہ اس جھگڑے میں پڑنا چاہیے کہ سرکاری قانون کا ضابطہ کیا ہے۔ وہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں آگیا آفتاب، روشنی اس کی رہنمائی کے لیے موجود ہے اندھیرے میں راستہ ڈھونڈنے کی اسے کیا ضرورت ہے۔ اس کے چلنے کے لیے صاف، ہموار، وسیع و بے خطر سڑک موجود ہے۔ اب وہ کیوں خواہ مخواہ ناہموار پگڈنڈیوں پر ٹھوکریں کھائے اور خار دار جھاڑیوں سے الجھتا پھرے، مسلمان صرف خدا کا غلام ہے، اور سب کی غلامی سے آزاد، اور اس کا کام صرف خدا کے بنائے ہوئے احکام کی پابندی ہے اور بس[1]۔"

ایک عالم اسلام ہونے کی حیثیت سے مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تفسیر قرآن ہے جو انھوں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھی ہے یہ تفسیر اردو میں تفسیر ماجدی کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ عہد حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر تعلیم یافتہ مسلمانوں اور اسلام سے واقفیت حاصل کرنے والے غیر مسلموں کے لیے خاص طور پر یہ اپنے طرز اور نوعیت کی پہلی تفسیر قرآن ہے جس کا مقابلہ مشہور مصری عالم علامہ قطب شہید کی عربی تفسیر کے علاوہ شاید ہی کوئی تفسیر کر سکتی ہے۔ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن اور مولانا آزاد کی ترجمان القرآن اہم تفسیریں ہیں اور اپنی اپنی جگہ بے مثل ہیں لیکن تفسیر ماجدی کا انداز ہی جدا ہے۔ انھوں نے قرآن کے ترجمے میں ہر ممکن احتیاط برتی ہے فرماتے ہیں کہ:

"ترجمہ میں اگر پابندی زبان ترجموں کے طریقوں، ترکیبوں، محاوروں اور روزمرہ کی رکھیے تو یہ تو اپنا ناہوا" ترجمہ کرنا نہ ہوا، زیادہ سے زیادہ اسے ترجمانی کہہ لیجیے۔ اگر کہیں التزام اصل لفظ کی جگہ لفظ رکھ دینے کا کر لیا، اور تکیہ تمام تر لغت کی کتابوں پر رکھا تو عبارت ایسی سپاٹ اور بے رنگ بے کیف بن جائے گی کہ خود اپنی ہی طبیعت بدمزہ ہو کر رہے گی[2]۔"

اس تفسیر کے سلسلے میں مولانا کی محنت و مشقت کا اندازہ وہ اہل علم ہی کر سکتے ہیں جنھوں نے اس فن میں مہارت حاصل کی ہے اور حقیقت ہے کہ مولانا کے اس عظیم کام کی اہل نظر نے دل کھول کر داد دی ہے۔ مولانا جب تک زندہ رہے مزید مسودے میں کتر بیونت کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی طرح انھوں نے علوم قرآن پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔

ایک بلند پایہ ادیب و انشا پرداز کی حیثیت سے تاریخ ادب اردو میں ان کا خاص مقام ہے۔ انگریزی میں تاریخ ادب کی سب سے پہلی کتاب ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے لکھی تھی اور اس کا اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری لکھنوی نے کیا تھا۔ یہ اردو زبان میں تاریخ کی پہلی جامع کتاب تھی۔ اس میں مولانا کے حالات اور کارناموں پر بحیثیت انشا پرداز و صحافی روشنی ڈالی گئی تھی اس کے بعد سے آج تک

---

[1] منقول از ہفتہ وار سچ ۱۳ فروری ۱۹۲۵ء مضمون بعنوان شاہراہ [2] مقدمہ تفسیر ماجدی جلد اول۔

اردو ادب کی جو تاریخ بھی لکھی گئی، اس میں مولانا کا خاص طور پر ذکر کیا جائے گا۔ وہ اردو کے مسلم الثبوت مصنف اور انشا پرداز مانے جاتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ صاحب طرز بھی ہیں ان کی تحریروں میں طنز کے لطیف نشتر بھی ہوتے ہیں جن کی چبھن صاحب معاملہ کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ حق گوئی اور بیباکی ان کا شعار رہا ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے کبھی مروت اور ذاتی تعلقات کا لحاظ نہیں کیا نہ اعزا و احباب کو چھوڑا نہ حکومت وقت کو بخشا۔ ہر بدعنوانی اور ظلم و زیادتی کے خلاف اپنے مخصوص انداز میں لکھنا ان کا شعار تھا۔ معمولی واقعات و حالات سے وہ ایسے سبق آموز نکات پیدا کرتے تھے کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا تھا، ان کی تحریروں میں دل کشی کے ساتھ ساتھ جذبۂ عمل بھی ابھرتا ہے۔ مولانا کو قدرت نے گہری نظر اور زبردست قوت استدلال عطا کی تھی۔ ان کی طنزیہ تحریروں سے بہترین اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں، بے فائدہ طنز و تعریض سے انھوں نے اپنے پاکیزہ قلم کو کبھی آلودہ نہیں کیا۔ صدق جدید کے چند اقتباسات سے مولانا کی طنز نگاری کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے:

(۱) "امریکہ آپ اپنی نظر میں:" ہر سال امریکہ میں ۵۰ ہزار خودکشی اور ۳ لاکھ اقدام خودکشی کے واقعات۔ اور یہی حاصل ہے جس تہذیب و تمدن کا، آپ اسی کو لینے کے لیے اپنے سر اور آنکھوں سے تیار رہتے ہیں۔"

(۲) "ترجیح بالاکن:" یو۔ پی وزارت میں اضافہ کل تعداد ۴۹" جب ہر ممبر کا منتہائے نظر وزارت یا نائب وزارت ہو تو وزارت کے بھوکوں کی سیری اور آسودگی اتنی تعداد سے بھی کیونکر ہو سکے گی اور ناممکن نہیں کہ آگے چل کر وزیروں کی تعداد خود ممبروں کے کچھ برابر ہی ہو جائے آہ گاندھی جی اور ان کا دیس!"

خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلہ میں گزشتہ چند برسوں میں حکومت ہند نے جس جوش و خروش کا ثبوت دیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اتفاق سے اسی زمانہ میں صدر جمہوریہ مسٹر گری نے روس کا دورہ کیا ازبکستان میں ان کا شاندار استقبال ہوا۔ مولانا عبدالماجد نے اس خبر پر جو سرخی دی اور جو طنزیہ جملے تحریر کیے وہ لاجواب اور سبق آموز ہیں:-

(۳) "فطرت کا گہرا طنز، صدر جمہوریہ ہند مسٹر گری کا خیر مقدم ازبکستان میں۔
کثرت اولاد پر وزیر اعظم ازبکستان کی طرف سے دلی مبارکباد۔ مسز سرسوتی گری اگر ازبکستانی ہوتیں تو انھیں بہترین ماں کا اعزاز ملتا اور یہ سب کچھ عین اس وقت جب ہندوستان میں ہفتہ خاندانی منصوبہ بندی منایا جا چکا تھا اور جہاں اولاد کی بندش اور حد بندی پر چھپنے والے بے شمار سرکاری پوسٹروں، ہینڈبلوں، کتابوں اور اعلانوں کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی:(صدق جدید اکتوبر ۱۹۷۰ء)

افسوس صدق کی فائلیں پیش نظر نہیں ہیں ورنہ طنز کے ایسے نادر نمونے پیش کیے جا سکتے تھے جن کا جواب ترقی یافتہ زبانوں کے ادب عالیہ میں مشکل سے ملے گا۔

اردو زبان و ادب میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ بہترین انشا پرداز تھے ان کے ابتدائی عہد کی تحریروں نے اس دور کے جانے علماء اور ادیبوں کو متاثر کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے بلند پایہ عالم اور ادیب بھی ان کے مضامین پڑھ کر متاثر ہوئے جس کا اندازہ اس عبارت سے ہوگا:

"آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں، جن کو عام حالت میں حق امتیاز و استثنا حاصل ہے اور ہماری مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نشان امید رکھتے ہیں۔ میں ان کی وقعت کرتا ہوں انھیں چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبدالماجد بی۔ اے بھی ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچائے گا اور علوم حدیثہ کے تراجم میں ان سے بہت مفید مدد ملے گی جو اب تک اردو زبان میں گویا مفقود محض ہیں۔"

مولانا آزاد کی یہ پیش گوئی کس حد تک پوری ہوئی اس کا اندازہ مولانا عبدالماجد کے عظیم ادبی کارناموں سے کیا جا سکتا ہے ساتھ ہی مولانا آزاد کی دور اندیشی اور نکتہ رسی کا کرشمہ ہی نظر آتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ تیس زمانہ کی یہ تحریر ہے اسی زمانہ میں چند الفاظ پر دونوں میں قلمی مباحثہ بھی ہو چکا تھا۔ اور یہ مباحثہ ادبی اور لسانی تھا۔ اس سلسلہ میں کسی قدر تلخی بھی پیدا ہوئی تھی لیکن دونوں نے اپنے علمی وقار کو قائم رکھا۔ مولانا عبدالماجد کو علامہ شبلی نعمانی سے خاص عقیدت تھی اور ان کے علمی اور اسلامی کارناموں سے متاثر ہو کر ان کے شاگرد نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے ارادت مندوں کے حلقہ میں شامل ہو گئے اور ہمیشہ شامل رہے۔ اسی لیے مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور ان دونوں ہی کو مولانا آزاد سے زیادہ تر اختلاف ہی رہا۔ تاہم علمی و ادبی خدمات کے سلسلہ میں ایک دوسرے کا پورا احترام کرتے تھے۔ موقع حاصل ہونے کے باوجود مولانا عبدالماجد نے ملکی سیاسیات میں کوئی خاص حصّہ نہیں لیا بجز تحریک خلافت کے۔ نہ انھوں نے کسی بڑی چھوٹی، سیاسی، نیم سیاسی یا ملی جماعت میں عملی حصہ لیا ورنہ ان کے لیے بھی ملکی و ملی رہنماؤں کی صف اول میں نمایاں نظر آنا غیر ممکن نہ تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے لیے جو راہ پسند کی اس پر زندگی بھر چلتے رہے۔ کبھی کسی وقتی انقلاب سے متاثر ہو کر اپنی راہ نہیں بدلی۔ انھوں نے اسی ملت کی خدمت کے ساتھ ساتھ ملک کی خدمت بھی کی۔ سیاسی رہنماؤں کو ان کی غلط روش پر بے محابا ٹوکا اور ان کو صحیح راہ کی سمت دکھائی۔

مولانا عبدالماجد کی کسی ایک حیثیت پر طویل مضمون بھی ناکافی ثابت ہوگا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ان کی شخصیت پہلو دار ہے۔ صرف ان کی ادبی خدمات کے لیے سچ، صدق اور صدق جدید کے مضامین کا انتخاب پیش کیا جائے تو کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہوگا اور اس کی حیثیت ایک ادبی شاہکار کی ہوگی۔ صحافت میں ان کا رتبہ بلند ہے۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر جیسے مخلص اور بے باک رہنما اور صحافی کی معیت میں ادارتی فرائض انجام دیے اور چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک اپنے ہفتہ وار اخبارات نکالتے رہے۔ اردو کی کلاسیکی شاعری اور ادب پر ان کے بہترین مضامین موجود ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے زہرِ عشق کے بدنام مصنف نواب مرزا شوق اور ان کی مثنوی پر حرکتہ الآرا مضمون لکھا جس کے متعلق آسانی سے کسی کو یقین بھی نہ آتا کہ مولانا زہرِ عشق پر مضمون لکھیں گے۔ لیکن اس مضمون میں بھی انھوں نے اخلاقی پہلوؤں کو اُجاگر کر کے اپنے حق پسند مشن سے منسلک کر دیا۔ اس مضمون کے آخری حصہ کا ایک اقتباس پڑھیے :

"مشرق کے بے حیا سخن گو، اردو کے بدنام شاعر رخصت، تو درد بھرا دل رکھتا ہے، تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ تو نے موت کو یاد رکھا تیری یاد کو انشاء اللہ موت نہ آئے گی، تو نے شاید کسی کی رحمت بے پایاں پر تکیہ کر کے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو بہت پھیلایا۔ لیکن اس سے بڑھ کر کسی کی عظمت بے پایاں سے خائف ہو کر موت اور انجام کی یاد دلا دلا کر بھی خوب رلایا۔ خدائے آمرزگار تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامنِ عفو و مغفرت کے سائے میں لے لے، اور تیرے کلام کے درد و عبرت، تیرے بیان کے سوز و گداز کا اجر اپنی قدرت و رحمت کی مناسبت سے تجھے بے حد و حساب عطا کرے۔[1]"

اسی طرح مولانا نے مرزا رسوا کے ناولوں پر بھی اپنے خاص انداز سے لکھا ہے۔ رسوا کا سب سے مشہور ناول 'امراؤ جان ادا' اردو میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا نے ان کے ناولوں کی خصوصیات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے :

"مرزا کے پیش رو اکثر اور معاصرین بیشتر تکلفات میں اُلجھ کر رہ گئے، رسوا تصنع سے پاک اور آورد سے بے نیاز، ابھی ہنسا رہے تھے ابھی رلانے لگے، مزاح، گداز، سوز و ساز،"

---

[1] مثنوی زہرِ عشق مرتبہ مجنوں گورکھپوری، مطبوعہ صدیق بک ڈپو لکھنؤ۔

شوخی، متانت سب ہی اپنے اپنے موقع سے موجود، لیکن آمد و بے ساختگی ہر حال میں رفیق رہی، شستگی اور رانی ہر گوشۂ بساط میں قلم کی شریک، جو منظر جہاں کہیں دکھایا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرصع ساز نے انگوٹھی پر نگ جڑ دیا۔ ہر نقل پر اصل کا گمان، ہر حرف پر جوہر کا نشان تصویر پر صورت کا دھوکا، الفاظ کے پردے میں حقیقت کا جلوہ۔ لیکن ناول بہر حال ناول ہی ہوتے ہیں اخلاق کے مسائل اور تصوف کے مقالات نہیں۔"

مذکورہ عبارت سے مولانا کی انشا پردازی کا کچھ اندازہ ہوگا لیکن مرزا رسوا اور ان کے ناولوں پر ان کا پورا مضمون اردو ادب میں خاصہ کی چیز ہے۔

مولانا نے ساری عمر مذہب اور اخلاق پر لکھنے میں صرف کر دی۔ انھوں نے انگریزی میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ اردو میں قرآن کی تفسیر لکھی۔ قرآنی علوم اور سیرت پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ انھوں نے سوانح نگاری میں اردو زبان کو نئی راہ دکھائی مولانا اشرف علی کی سوانح حیات "حکیم الامت" اور مولانا محمد علی جوہر کی سیرت "محمد علی ذاتی ڈائری" اردو زبان کی بہترین تصانیف شمار کی جاتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو فن سوانح نگاری میں کتنا کمال حاصل تھا، اس میں انھوں نے عام راہ سے ہٹ کر ایک نیا طرز اختیار کیا۔ ان کی ایک اہم خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ کہ علمی معاملات اور مسائل میں استفسار کرنے والوں کو وہ کبھی مایوس نہیں کرتے تھے۔ بے شمار تحقیقی کام کرنے والے ان سے اپنے موضوع کے متعلق سوالات کرتے تھے اور مولانا ان کو جواب سے محروم نہیں رکھتے تھے۔ بیشتر سوالات خط و کتابت کے ذریعہ کیے جاتے تھے، کیونکہ مولانا اتنے اوقات کے اس درجہ پابند تھے کہ اس زمانہ میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ہر کام مقررہ وقت پر کرنا ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اسی لیے اگر کوئی ان سے ملنے کے لیے جانا چاہتا تو پہلے سے وقت مقرر کرانا ضروری تھا۔ یہ اوقات کی پابندی ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے قلم سے بہترین علمی، ادبی، مذہبی اور اخلاقی جواہر پارے علمی دنیا کو نصیب ہوئے۔

مجھے مولانا سے ملنے کے مواقع کم حاصل ہوئے لیکن ان کی شفقت اور عنایات سے بہرہ ور ہوتا رہا۔ جب بھی کسی معاملہ میں کچھ دریافت کرنے کی زحمت دی بلا تاخیر جواب سے سرفراز فرمایا بعض دینی اخلاقی مسائل اور معاملات کے متعلق بلا تکلف ان سے تحریری استفسار کیا۔ جو بات مشتبہ ہوتی اس کے متعلق صاف لکھ دیا کہ میں کوئی رائے نہیں لکھ سکتا۔ یا لکھا کہ "ہو سکتا ہے کہ آپ کا خیال درست ہو مگر میں اس سلسلہ میں اظہار خیال سے معذور ہوں" وغیرہ۔

مولانا کو حکومت ہند اور صوبائی حکومت نے انعامات و اعزازات سے نوازا مگر انھوں نے ان سرکاری نوازشات کو اہمیت نہیں دی، نہ ان کا قلم حکومت اور ارکان حکومت کی غلطیوں کی پردہ پوشی کر سکا۔ نہ کوئی دباؤ ان پر اثر انداز ہوا۔

ضرورت ہے کہ اہل علم مولانا کی شایان شان یادگار قائم کریں اور ان کے علمی کاموں کی نشر و اشاعت پر خاص توجہ کی جائے، ان کی یادگار "صدق جدید" کی بقا و تحفظ کا انتظام ہو۔ اس سلسلہ میں علمائے کرام اور اردو ادیبوں اور ذکی رو پر یکساں ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

★

"مولانا عبدالماجد کی ذات گرامی سے اردو کو اتنا فائدہ پہنچا کہ کہا جا سکتا ہے، کوئی بڑی جماعت بھی اس زبان کا دامن گراں بہا جواہر پاروں سے اس پیمانہ پر شاید ہی بھر سکتی جس پیمانے پر مولانا عبدالماجد نے بھرا۔"

• ــــــ مولانا غلام رسول مہر

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی یاد میں

تکمیل رضوی

تو نے ماجدؔ حق پرستی میں گذاری زندگی ایک انساں کی طرح تو نے سنواری زندگی
تو نے چاہا تیری ایسی ہو ہماری زندگی صرف کر دی قوم کی خدمت میں ساری زندگی

صاحبانِ علم و فن میں آج تیری یاد ہے
تو نہیں تو آہ سُونا سُونا دریاباد ہے

تو ہے ماجدؔ مردِ میدانِ عمل والا حشم رہبرِ راہِ صحافت تیرا ہر نقشِ قدم
دہر میں روشن ہے تیرا آج بھی زورِ قلم آج دنیائے ادب میں تیرا قائم ہے بھرم

علم کے دریا بہائے واہ کیا کہنا تیرا
صدق[1] کے دریا بہائے واہ کیا کہنا تیرا

تیرے دم سے گلشنِ اردو میں تھی قائم بہار اے وفادارِ وطن اے حریت کے تاجدار
اے مفسر اے مبصر آب ہے تیری یادگار تیرا دریاباد مولد اور وہیں تیرا مزار

مانتے ہیں صاحبانِ فن تجھے اُستادِ فن
تذکرے ہوتے ہیں تیرے انجمن در انجمن

لب پہ تیرا ذکر ہے اور یاد ہے دل میں مکیں ایسے باہمت صحافی آج ملتے ہیں کہیں
کیوں نہ شمعِ صدق کے پروانہ ہوں اہلِ یقیں تو نے سمجھا خدمتِ قومی کو فرضِ اولیں

انقلاباتِ زمانہ میں رہا ثابت قدم
دشمنِ حق کے لیے شمشیر تھا تیرا قلم

مرحبا اے عزم و استقلال کے کوہِ گراں اے محبِ قوم و ملت نازشِ ہندوستاں
کیوں نہ ہو جانِ صحافت کا ہی تو روحِ رواں دل تڑپتا ہے بھلا تکمیل اب ڈھونڈھے کہاں

تو نظر سے چھپ گیا لیکن تری تصویر ہے
تو ہے زندہ دہر میں جب تک تری تحریر ہے

[1] اخبار صدق

حکیم عبدالقوی دریابادی

مولانا عبدالماجد دریابادی

تصنیفی کارنامے

مولانا عبدالماجد دریابادی (پیدائش ماہ مارچ ۱۸۹۲ء وفات ۶ جنوری ۱۹۷۷ء) کا شمار اردو کے مشاہیر ادب میں ہے ان کی چھوٹی بڑی مجلد تصانیف کی میزان چونسٹھ ہے بعض تصانیف بہت ضخیم اور بعض بہت مختصر ہیں۔ ان کی تصانیف کی فہرست مختصر تعارف کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے۔

مولانا نے مضمون نگاری کا سلسلہ اپنے اسکولی دور طالب علمی ہی سے شروع کر دیا تھا۔ تصنیفی زندگی کا آغاز ان کے دو چھوٹے رسالوں (۱) غذائے انسانی اور (۲) محمود غزنوی سے ہوا۔ دونوں سب سے پہلے مضمون کی شکل میں اس وقت کے کثیر الاشاعت اردو اخبار وکیل (امرتسر) میں نکلے تھے۔ اس وقت مولانا ایف۔ اے کے طالب علم تھے۔ اسی ادارہ نے ان دونوں مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر کے مصنف کے نام کے ساتھ "مولانا" کا بھی اضافہ کر دیا تھا۔

(۱) غذائے انسانی: میں گوشت خوروں پر جو اعتراضات بعض فرقوں اور طبقوں کی طرف سے کیے جاتے ہیں ان کے جوابات علمی و سائنٹیفک رنگ میں دیے گئے ہیں اور کہیں بھی مناظرہ کی تلخی آنے نہیں پائی ہے۔

(۲) محمود غزنوی: پر بعض مورخوں نے جو اعتراضات تعصب اور لوٹ مار کے لگائے تھے انکا محققانہ جواب معتبر تاریخی کتب کے حوالہ کے ساتھ اس میں دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کی فلسفیانہ تصانیف (ترجمہ و مستقل تالیف) کے دور کا آغاز ہوا۔ فلسفہ خصوصاً اس کی شاخ نفسیات کے خشک مضمون کو انھوں نے سنجیدہ اور عام فہم پیرایہ میں اردو خوانوں کے سامنے پہلی بار پیش کیا۔ اس زمانہ میں وہ مذہب کے منکر اور مغربی فلسفیوں کے اثر سے الحاد و تشکیک کا شکار، اور عقلیت (ریشنلزم) کے پرستار تھے۔

اس سلسلہ کی جو کتاب سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی وہ

(۳) فلسفۂ جذبات تھی۔ انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کیا اور اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

(۴) فلسفۂ اجتماع: اس کتاب میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو مذہبی حلقوں میں برہمی کا باعث ہوئیں اور مولانا پر کفر کے فتوے بھی لگے۔ اور جب مولانا کے خیالات میں انقلاب انگیز تبدیلی آئی اور مسٹر عبدالماجد کے بجائے مولانا عبدالماجد کے لقب سے ملقب ہوئے تو انھوں نے یہ کتاب اپنی فہرست تصانیف سے خارج کر دی اور دوبارہ اس کی اشاعت کے روادار نہ ہوئے۔ یہ کتاب بھی انجمن ترقی اردو نے شائع کی تھی۔ اس کا صرف ایک ہی ایڈیشن نکلا۔

(۵) سائیکالوجی آف لیڈرشپ (انگریزی): یہ کتاب مولانا کے بالکل ابتدائی زمانہ میں انگلستان کے ایک مشہور ناشر فشر اینڈ اَنوِن نے شائع کی۔ اس میں بڑی حد تک وہی چیزیں تھیں جو اردو کی تصنیف فلسفہ اجتماع میں تھیں۔ مولانا محمد علی اسوقت چھنڈواڑہ میں نظر بند تھے۔ مولانا نے یہ کتاب ان کے مطالعہ کے لیے بھیجی۔ مولانا محمد علی نے اس کی

عکسِ تحریر
مولانا
عبدالماجد
دریابادی

عبارت حسن انشا اور علمی رنگ کو بہت پسند کیا لیکن ساتھ ہی اس کے الحادی اجزا پر بڑی سخت تنقید کرتے ہوئے مصنف کو اسلام کی دعوت دی۔ مولانا کا یہ تنقیدی خط انگریزی میں تھا اس کا اردو ترجمہ خطوط مشاہیر میں شائع ہوا ہے۔

(۶) مکالمات برکلے: برکلے انگلستان کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے، عام فلسفیوں کے برعکس مذہبی خیال کا تھا۔ اس کے ڈائیلاگس کا ترجمہ مکالمات برکلے کے نام سے مولانا نے کیا، اور اسے دار المصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیا۔ اس کا بھی صرف ایک ہی ایڈیشن نکلا۔

مولانا نے اس دور میں فلسفیانہ مضامین بھی اردو کے رسائل الناظر (لکھنؤ)، معارف (اعظم گڑھ) اور ادیب (الہ آباد) میں لکھے۔ اس سلسلے کا ایک مضمون۔

(۷) فلسفہ اور اس کی تعلیم: کے نام سے اولاً الناظر میں چھپا، یہ فلسفہ کی مختصر تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت پُر از معلومات ہے۔ اسے کتابی شکل میں الناظر بک ایجنسی نے شائع کیا۔

(۸) رسالہ الناظر میں مولانا کے فلسفیانہ مضامین نکلے تھے ان کا ایک مجموعہ فلسفیانہ مضامین کے نام سے الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا۔ لیکن اس پر مولانا نے نظرثانی نہیں کی تھی۔

(۹، ۱۰) مبادیٔ فلسفہ حصہ اوّل و حصہ دوم یا فلسفہ کی پہلی کتاب: مولانا نے اس زمانہ میں جب وہ مسٹر سے مولانا اور ملحد کے بجائے پختہ مسلمان ہو چکے تھے، اپنے ان فلسفیانہ مضامین پر مکمل نظرثانی کر کے انھیں دو حصوں میں طرز ادا کو اور زیادہ سلیس و دل نشین بنا کر دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع کر دیا۔

(۱۱) ھم آپ: مولانا کی آخری فلسفیانہ تصنیف ہے اور اس کا تعلق پاپولر سائکالوجی سے ہے۔ اسے ہندستانی اکاڈمی الہ آباد نے اردو ٹائپ میں چھاپا تھا۔

(۱۲) منطق: ۱۹۱۷ء میں جب مولانا حیدر آباد کے دار الترجمہ میں کام کر رہے تھے۔ جدید منطق (LOGIC) پر ان کی ترجمہ کردہ کتاب دار الترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی تھی اور مدتوں عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل نصاب رہی۔

مولانا نے بعض مشہور مغربی مصنفوں کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ ان کے ترجمے صحیح و معیاری اردو میں ہیں کہیں بھی ترجمہ پن کی جھلک نہیں ملتی۔ عبارت انتہائی سلیس و شگفتہ ہے۔

(۱۳ اور ۱۴) تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول و حصہ دوم: مشہور یورپین مورخ لیکی کی مشہور انگریزی کتاب ہسٹری آف دی یوروپین مارلس کا ترجمہ دو حصوں میں ہے۔ مولانا کے ترجموں میں اسے سب سے زیادہ مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی اسے بھی انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔

(۱۵) تاریخ تمدن حصہ دوم: ٹامس کی انگریزی کتاب کا ترجمہ منشی احمد علی کاکوروی (مولف شباب لکھنؤ) کر رہے تھے۔ حصہ اول کا ترجمہ وہ مکمل کر چکے تھے لیکن دوسری جلد کا ترجمہ ابھی مکمل نہ ہوا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا اس ناتمام حصہ کو مولانا عبدالماجد نے مکمل کیا۔ اسے بھی انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔

(۱۶) تاریخ یورپ: یہ کتاب سررشتہ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی نے ترجمہ کرائی تھی۔ کتاب ضخیم تھی، اس کے بعض اجزا کا ترجمہ مولانا عبدالماجد نے اور بقیہ کا دوسرے حضرات نے کیا تھا۔

(۱۷) پیام امن: پہلی جنگ عالمگیر کے خاتمہ پر فرانس کے ایک امن پسند فلسفی سیو پال رچرڈ نے جنگ کی تباہ کاریوں سے دنیا کو خبردار کرتے ہوئے امن و صلح کے ساتھ رہنے کی پرزور اپیل اس کتاب کے ذریعہ کی تھی۔ مولانا دریابادی اس وقت گاندھی جی کی تحریک ترک موالات اور فلسفہ عدم تشدد کے بہت گرویدہ تھے۔ اس کتاب کا ترجمہ مع ایک مقدمہ کے کیا اور اس کے ساتھ ایک باب "اسلام اور امن" کے نام سے اپنے قلم سے شامل کیا۔ یہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے زیر اہتمام چھپی۔

اس زمانہ میں مولانا فلسفہ سے تائب ہو کر تصوف کے کوچہ میں داخل ہوئے تھے۔ تصوف کے موضوع پر دو کتابیں ان کے

قلم نے نکلیں۔ دونوں پہلی بار دارالمصنفین ہی سے شائع ہوئیں۔

(۱۸) تصوفِ اسلام۔ ایک لحاظ سے یہ مولانا کی مقبول ترین کتاب ہے۔ اب تک اس کے پانچ ایڈیشن نکلے ہیں۔ آخری ایڈیشن نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ اس میں صحیح اسلامی تصوف کی تاریخ بیان کی ہے اور تصوف کی معیاری کتب "کشف المحجوب" لوائح جامی، منطق الطیر، فتوح الغیب، عوارف المعارف وغیرہ کا مختصر تعارف بھی کرایا ہے۔

(۱۹) فیہ ما فیہ (فارسی): یہ صاحبِ مثنوی مولانا جلال الدین رومی کے نثری ملفوظات زبان فارسی میں ہیں۔ مولانا نے اس کے متعدد قلمی نسخوں کو پیش نظر رکھ کر مقابلہ و تصحیح کے بعد ایک مقدمہ کے ساتھ شائع کی۔ جس میں مولانا روم کی سوانح اور ان کی تعلیمات کا تذکرہ ہے۔

خالص ادبی رنگ کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۲۰) زود پشیمان (ڈرامہ)۔ مولانا نے یہ ڈرامہ "ناظر" کے فرضی نام سے اپنے روشن خیالی کے دور میں لکھا تھا۔ جسے الناظر بک ایجنسی نے شائع کیا تھا۔ اس میں مولانا کی چند غزلیں ان کے تخلص ناظر کے ساتھ ہیں۔ شروع میں اردو کے ادیبوں مولانا عبدالحلیم شرر، اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ کی رائیں بھی شامل ہیں۔ اس ڈرامہ کو مولانا نے بعد میں اپنی تصانیف کے زمرہ سے خارج کر دیا۔

(۲۱) مثنوی بحر المحبت۔ اردو کے مشہور شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی نایاب مثنوی کو ایڈٹ کر کے مختصر مقدمہ کے ساتھ مولانا نے شائع کیا تھا۔ مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی رہی ہے۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

(۲۲) مقالاتِ ماجد حصہ اول۔ مولانا کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے تاج آفس بمبئی نے شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن عشرت بک ڈپو لاہور نے شائع کیا۔

(۲۳، ۲۴) اور ان مقالات پر مکمل نظر ثانی کر کے مولانا نے انشاءِ ماجد حصہ اول کے نام سے اور بقیہ ادبی مضامین کو انشاءِ ماجد حصہ دوم کے نام سے مرتب کیا اور ان دونوں حصوں کو نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ ان دونوں مجموعوں میں مولانا کے بہت سے ادبی شاہکار ملتے ہیں۔ مثلاً (۱) اردو کا ایک بدنام شاعر (جس میں نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی زہرِ عشق اور دوسری مثنویوں کا ذکر ہے) (۲) مرزا رسوا کے قصے کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے (۳) پیامِ اکبر (۴) نیا آئینِ اکبری (۵) اردو کا واعظ شاعر (مولانا حالی) اور مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے پر اثر تعزیتی مضامین اور بعض معیاری تبصرے بھی ان میں شامل ہیں۔

مولانا نے اس کے بعد جو ادبی مضامین لکھے وہ بھی خاصی تعداد میں ہیں اور ان کا مجموعہ انشاء اللہ انشاءِ ماجد جلد سوم کے نام سے شائع ہوگا۔

(۲۵) نشریاتِ ماجد حصہ اول۔ مولانا نے لکھنؤ اور دہلی ریڈیو اسٹیشنوں سے جو تقریریں مختلف ادبی، مذہبی عنوانات پر کیں ان کا یہ انتہائی دلچسپ مجموعہ نسیم بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔ ان نشریات کی زبان مولانا کے دوسرے مضامین سے مختلف، مکالمہ اور بات چیت TALKS کے انداز کی ہلکی پھلکی لیکن ساتھ ہی ادبی خوبیوں سے لبریز ہے۔

(۲۶) مضامینِ عبدالماجد۔ اس میں مولانا کے وہ ادبی و مذہبی مضامین درج ہیں جو ان کے اپنے اخبار سچ اور صدق میں نکلے تھے۔ انھیں ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد نے ڈاکٹر غلام دستگیر رشید پروفیسر نظام کالج حیدرآباد سے مرتب کرا کر شائع کیا تھا۔ مولانا اس پر کسی قسم کی نظر ثانی نہیں کر سکے تھے۔

(۲۷) اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی سے مولانا کو خصوصی تعلق ہمیشہ رہا۔ انھوں نے ان کی اصلاح میں بڑا حصہ لیا تھا۔ اکبر پر مولانا نے بہت کچھ لکھا۔ اس موضوع پر ان کے چھوٹے بڑے مضامین کا مجموعہ ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

(۲۸) مکاتیبِ اکبر۔ اکبر الہ آبادی کی وفات کے بعد ان کے خطوط بنام مولانا عبدالماجد دریابادی کا مجموعہ ان کے توضیحی نوٹ

کے ساتھ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے شائع کیا تھا۔

(۲۹) خطوط مشاہیر حصہ اول ۔ اس مجموعہ میں مولانا کے نام علامہ شبلی نعمانی کے خطوط (شبلی نامہ کے عنوان کے تحت) اکبر الہ آبادی کے خطوط (اکبر نامہ کے زیر عنوان) مولانا محمد علی کے خطوط (جوہر نامہ کے عنوان سے) مولانا دریابادی کے علیحدہ علیحدہ دیباچوں اور مفصل نوٹوں کے ساتھ درج ہیں ۔ اس کا پہلا ایڈیشن تاج کمپنی نے چھاپا تھا۔ دوسرا نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے۔

(۳۰، ۳۱) مکتوبات سلیمانی حصہ اول و حصہ دوم ۔ مولانا سید سلیمان ندوی سے مولانا دریابادی کے بہت زیادہ تعلقات شروع سے مولانا ندوی کی وفات تک رہے ۔ ان کے خطوط جو مولانا کے نام تھے وہ دو حصوں میں مولانا کے حواشی کے ساتھ اور ہر حصہ میں ایک مفصل دیباچہ کے ساتھ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ کے زیر اہتمام شائع ہوئے ہیں ۔

سفر نامے

(۳۲) سفر حجاز ۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا زیارت حرمین سے مشرف ہوئے تھے ۔ اور اس کا سفر نامہ قسط وار اخبار سچ میں نکلا تھا ۔ بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے ۔ یہ سفر نامہ ادب و انشاء کے لحاظ سے بھی بہتر ہے اور جذبات عقیدت کے لحاظ سے بھی ۔ اب تک اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔

(۳۳) ڈھائی ہفتہ پاکستان میں یا مبارک سفر۔ مولانا نے ۱۹۵۵ء میں پہلی بار پاکستان (لاہور و کراچی) کا سفر کیا تھا اس کی روداد اولاً ان کے ہفتہ وار صدق جدید میں نکلی ۔ اسی کو صدق بک ایجنسی نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا ۔

سوانح عمریاں

(۳۴) حکیم الامت ۔ نقوش و تاثرات ۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے مولانا کو آخری عمر میں خاص ارادت ہو گئی تھی اور ان کی زندگی کے آخری اٹھارہ سال تک یہ تعلق قائم رہا۔ اس سلسلہ میں جو ملاقاتیں اور جو خط و کتابت ہوئی وہ سب اس میں مختلف ابواب کے تحت جمع ہے ۔ اس کا رنگ عام سوانح عمریوں سے بالکل جدا ہے اور یہ انشاء ماجدی کے خصوصی نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ پہلا ایڈیشن دار المصنفین اعظم گڑھ سے نکلا تھا اور دوسرا پاکستان سے ۔

(۳۵، ۳۶) محمد علی ذاتی ڈائری حصہ اول و دوم ۔ مولانا محمد علی کی وفات پر مولانا نے ایک سلسلۂ مضامین ان پر اخبار سچ میں شروع کیا تھا بعد میں اسے مکمل کر کے کتابی شکل میں، دو حصوں میں شائع کیا ۔ ادارۂ دار المصنفین اعظم گڑھ نے اسے شائع کیا۔

مولانا محمد علی سے مولانا دریابادی کو انتہائی محبت و عقیدت تھی ۔ اسے اصطلاحی عمریوں کے ذیل میں نہیں رکھا جا سکتا اس میں مولانا محمد علی سے متعلق صرف انھیں چیزوں کا ذکر ہے جو مولانا کے براہ راست مشاہدے میں آئیں اور ساتھ ہی دونوں میں جو خط و کتابت ہوئی وہ بھی شامل ہے ۔

یہ کتاب صرف محمد علی کے نام سے ناقص صورت میں (یعنی صرف اس حصہ پر مشتمل جو سچ لکھنؤ میں قسط وار نکلا تھا) ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد نے بھی مولانا کو دکھائے بغیر شائع کی تھی ۔

ترجمہ و تفسیر قرآن و متعلقات

(۳۷) تفسیر ماجدی ۔ انگریزی ۔ مولانا نے سالہا سال کی محنت کے بعد قرآن مجید کا یہ انگریزی ترجمہ تفسیری حواشی کے ساتھ مکمل کیا تھا جسے تاج کمپنی کراچی (لاہور) نے سات منزلوں میں الگ الگ اور پھر یکجا طور پر ایک جلد میں شائع کیا ۔ اس کا ترجمہ تو بائبل کی پرانی انگریزی میں لیکن حاشیے ماڈرن انگریزی میں ہیں اور اس میں ان تمام شبہات و اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو اسلام اور قرآن کے بارے میں غیر مسلموں اور نئے تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے ہوتے رہتے ہیں ۔

(۳۸) ترجمۂ قرآن انگریزی ۔ اصل تفسیر کی اشاعت

مولانا عبد الماجد دریابادی سنہ ۱۹۱۶ء میں

مولانا عبدالماجد دریا بادی ۹ اگست ۱۹۷۵ء کو رویندرالیہ لکھنؤ میں بیگم عابدہ احمد صاحبہ سے
"اردو ادب ایوارڈ" حاصل کر رہے ہیں۔

"اردو ادب ایوارڈ" تقریب (۹ اگست ۱۹۷۵ء) کے موقع پر مولانا عبدالماجد دریا بادی کے ساتھ
(دائیں جانب سے) محمد علیم قدوائی، عبدالسلام صدیقی اور شفاعت علی تصویر میں دکھائی دے رہے ہیں

"اردو ادب ایوارڈ" تقریب ۹ راگست ۱۹۷۵ء
کے موقع پر مرحوم جاں نثار اختر مولانا دریابادی سے
نیاز حاصل کر رہے ہیں۔ تصویر میں علی سردار جعفری،
عبدالسلام صدیقی اور اشتیاق احمد عباسی مرحوم
بھی نظر آ رہے ہیں

الماجد دریابادی مرحوم اپنے آبائی وطن
مشہور مزاح نگار احمد جمال پاشا سے
ہیں۔ تصویر میں مولانا مرحوم کے بھتیجے اور
عبدالقوی بھی بیٹھے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔
(جون ۱۹۷۲ء)
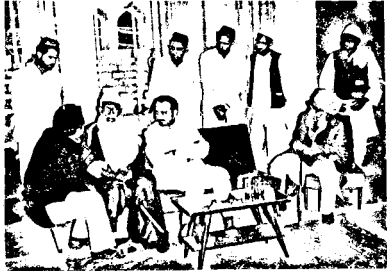
مولانا عبدالماجد دریابادی تاج المساجد بھوپال کی ایک تقریب ۲؍اپریل ۱۹۶۲ء کے موقع پر بھوپال تشریف لے گئے۔ یہ دونوں تصویریں اسی موقع کی ہیں۔

اوپر: مولانا عبدالماجد دریابادی کے دائیں جانب سعودی سفیر یوسف یٰسین صاحب، اور مہتمم تاج المساجد مولانا محمد عمران خاں صاحب۔

نیچے: مولانا عبدالماجد دریابادی کے دائیں جانب سعودی سفیر یوسف یٰسین صاحب اور بائیں جانب مہتمم تاج المساجد مولانا محمد عمران خاں صاحب

کے کئی سال بعد تاج کمپنی کی فرمائش پر مولانا نے قرآن پاک کا ایک اور ترجمہ ماڈرن انگریزی میں بھی کیا۔ اس کے ساتھ حاشیے بالکل نہیں ہیں۔

(۳۹) تفسیر ماجدی اردو ۔ انگریزی تفسیر مکمل کرنے کے بعد مولانا نے اردو میں اسی رنگ کی ایک محققانہ تفسیر بھی لکھی جس کا اصل مقصد جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے شبہات کا ازالہ اور اسلام کا موازنہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے کرنا ہے۔ تاج کمپنی کراچی نے اسے سات منزلوں میں علیحدہ علیحدہ بھی چھاپا اور ایک جلد میں بھی۔

(۴۰، ۴۱، ۴۲) اس کے کئی سال بعد مولانا نے اسی تفسیر پر مکمل نظر ثانی کرکے بہت کچھ ترمیم و اضافہ کیا۔ اس کی دو جلدیں اور تیسری جلد کا ایک پارہ صدق جدید بک ایجنسی کے زیر اہتمام مولانا کی زندگی میں چھپ گئے۔ پہلی جلد سورہ فاتحہ سے سورہ آل عمران کے ختم تک ہے۔ دوسری جلد پارہ دس کے ختم تک۔ اس کے بعد تیسری جلد کا صرف پارہ ۱۱ مولانا کی وفات سے چند ماہ قبل ہوا ہے۔ ابھی ۱۹ پاروں کی اشاعت باقی ہے اس کا مسودہ مولانا مکمل کر گئے ہیں۔

(۴۳) جغرافیہ قرآنی یا ارض القرآن ۔ قرآن میں جن مقامات کا نام یا اشارے آئے ہیں ان کے متعلق تمام ضروری معلومات بہ ترتیب حروف تہجی اس رسالہ میں درج ہیں۔

(۴۴) حیوانات قرآنی یا الحیوانات فی القرآن ۔ قرآن شریف میں جن حیوانات کا ذکر آیا ہے یہ ان کے اور متعلقات مثلاً گوشت، دودھ، کھال وغیرہ سے متعلق معلومات کا ذخیرہ ہے۔

(۴۵) شخصیات قرآنی یا اعلام القرآن ۔ قرآن مجید میں جو نام آئے ہیں یا جن ناموں کا اشارہ ملتا ہے ان کے متعلق ضروری معلومات حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ۔

(۴۶) قصص و مسائل ۔ مولانا کا ایک لکچر "جدید قصص الانبیاء کے دو باب" کے نام سے اسلامیہ کالج پشاور سے پہلے کتابی شکل میں نکلا تھا۔ پھر یہ مضمون ــــ مولانا کے ایک دوسرے مضمون قدیم کلام کے مسائل جدید، دہلی میں دیا لکچر رضا اکاڈمی رام پور میں دیا گیا تھا) کے ساتھ قصص و مسائل کے نام سے اولاً نفیس اکاڈمی حیدرآباد نے شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مولانا کی مختصر نظر ثانی کے بعد صدق جدید بک ایجنسی نے شائع کیا۔

(۴۷) بشریت انبیاء ۔ یہ کتاب تمام تر قرآنی آیات سے ماخوذ ہے اور اپنے موضوع پر بالکل منفرد ہے۔ شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی۔

(۴۸) خطبات ماجدی یا سیرت نبوی قرآنی ۔ مولانا کے ان لکچرز (خطبات) کا مجموعہ ہے جو انھوں نے سیرت نبوی قرآن مجید کے موضوع پر مدراس میں دیے تھے۔ یہ کتاب پہلے مدراس کی اس انجمن نے جس کے زیر اہتمام یہ لکچر ہوئے تھے شائع کی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن دیباچہ اور اختتامیہ کے اضافہ کے ساتھ صدق جدید بک ایجنسی نے شائع کیا۔

(۴۹) مشکلات القرآن ۔ ۱۹۷۰ء میں مولانا دوبارہ لکچر دینے مدراس گئے تھے وہاں مشکلات القرآن کے عنوان پر پانچ لکچر دیے تھے۔ ان کا مجموعہ کتابی شکل میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ مولانا کی وفات کے چند ماہ بعد شائع ہوا۔

حدیث و دعائیں

(۵۰) ترجمہ و شرح مناجات مقبول ۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی مرتب کردہ دعاؤں کی مشہور کتاب مناجات مقبول کی یہ شرح مولانا دریابادی کے قلم سے مولانا کی مقبول ترین کتب میں ہے اس کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۵۱) شرح چہل حدیث ولی اللہی ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مرتب کردہ چالیس حدیثوں کی مختصر شرح تقطیع جیبی شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ۔

دوسری کتابیں

(۵۲) مردوں کی مسیحائی ۔ مولانا کے وہ مضامین جو انھوں نے ہفتہ وار سچ لکھنؤ میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں

پر لکھے تھے ان کا مجموعہ ادارۂ اشاعت اردو نے مولانا کو دکھائے بغیر ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ یہ مجموعہ بہترین نثری نعت کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۵۲) صابر رسول۔ مولانا کا ایک سیرتی مضمون حیدرآباد کی ایک انجمن نے علٰحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا تھا۔

(۵۳-۵۵) یتیم کا راج اور یتیم کی جیت۔ مولانا کے دو مشہور سیرتی مضامین جو اول الذکر مجموعہ مردوں کی مسیحائی میں شامل ہیں، تحریک سیرت لاہور نے علٰحدہ علٰحدہ رسالوں کی شکل میں شائع کیے تھے۔

(۵۵، ۵۶) تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام۔ تمدن اسلام پر مولانا کے یہ دو لکچر انجمن اسلامی تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دو مختلف جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ ان دونوں کا مجموعہ ادارہ ادبیات دلی نے چند سال قبل تمدن اسلام کے نام سے آفسٹ پر شائع کیا ہے۔

(۵۷) تحفۂ خسروی۔ راعی و رعایا کے تعلقات سے متعلق فارسی کتب اخلاق سے ماخوذ یہ کتاب مولانا نے مرتب کرکے ۱۹۲۱ء میں اودھ بک ایجنسی لکھنؤ کے زیر اہتمام چھپوائی تھی۔

(۵۸) فرائض والدین۔ خادم تعلیم کے فرضی نام سے مولانا کی یہ کتاب ڈکشنری بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔

(۵۹) مشاہیر سائنس۔ میکملن کمپنی کی شائع کردہ انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ۔

(۶۰) خطبہ صدارت استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس اجلاس لکھنؤ سنہ ۱۹۲۶ء۔ مولانا نے تحریک

. . . .

خلافت میں حصہ لیا تھا۔ آخر زمانہ میں اودھ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں اس کے آل انڈیا اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے مولانا نے یہ خطبہ پڑھا تھا۔

(۶۱) ندوہ کا پیام ندویوں کے نام۔ مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے طلبۂ قدیم کے ایک سالانہ اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے اور دوسرا سالانہ اجلاس کے مستقل صدر کی حیثیت سے یہ دو خطبے پڑھے تھے وہ اخبار صدق میں شائع ہوئے تھے۔ جشن ندوہ سنہ ۱۹۷۶ء کے موقع پر ان دونوں خطبوں کو کتابی شکل میں ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ نے شائع کیا۔

(۶۲) خورانی جہیز۔ مولانا نے اپنی بڑی لڑکی کے نکاح پر جو موثر خطبہ پڑھا تھا اسے کتابی شکل میں مولانا محی الدین منیری نے بمبئی سے شائع کیا۔ اس خطبہ کے گجراتی اور انگریزی ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔

مولانا کی آخری دو تصانیف (۶۳) معاصرین اور (۶۴) آپ بیتی کے مسودوں کی کتابت ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ یہ دونوں کتابیں جلد ہی شائع ہو جائیں گی۔

موخر الذکر مولانا کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔

★

مولانا کے اسلوب تحریر اور ادبی خصوصیات کے متعلق میرا کچھ کہنا تو بے ادبی اور جسارت ہے مگر اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے طرز کے بانی اور خاتم ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعض مرتبہ ان کا ایک فقرہ ایک شذرہ کا اور ایک شذرہ پوری کتاب کا کام کر جاتا ہے اور کسی دو قیان کا ایک جملہ مخاطب یا مشار الیہ کے لیے ایسا بھی بھاری پڑ جاتا ہے کہ اس کا رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اٹھانا بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک زمانہ آئے گا کہ اس نسل کے لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبد الماجد دریابادی کو دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی تھیں۔

● — مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

پیکرِ فکر و فن

نصیر ناطقی

ماجدِ اعلیٰ نسب، علم و ادب کے تاجدار — تو نے چھوڑے اپنے پیچھے وہ مکمل شاہکار
جن سے دنیائے ادب میں آ گئی تازہ بہار — ہو گئی اردو زباں، تیری بدولت مالدار
تیرے فیضِ علم سے سیراب کتنے ہو گئے
ذرّے مہر و انجم و مہتاب کتنے ہو گئے

ایک عالم کہہ رہا ہے تجھ کو جانِ فلسفہ — کیوں نہ ہو جائے فزوں تر اس سے شانِ فلسفہ
ذات تیری تھی مکمل اک نشانِ فلسفہ — جس نے دیکھا اور سُنا، تجھ سے بیانِ فلسفہ
اس پہ تیری بات کا کچھ ایسا جادو چل گیا
وہ ترے مبحث کے پیکر میں یکایک ڈھل گیا

تو وہ تھا نقادِ فن جس کا نہیں کوئی جواب — نکتہ چیں ایسا کہ اپنے عہد کا اک آفتاب
تو نے جامد ذہن میں پیدا کیے ہیں انقلاب — تیرا اک اک لفظ تفہیم و تعمل کی اک کتاب
سامنے تیرے زباں کھولے کوئی کیسے ادیب
ہیں مقرر دم بخود، اور گنگ ہیں سارے خطیب

اللہ اللہ وہ تری تفسیرِ قرآنِ مبیں — چشمِ عالم ڈھونڈھ لے گر اس کا ثانی ہو کہیں
یک زباں ہو کر محقق کہتے ہیں "ہرگز نہیں" — کیوں نہ اہلِ علم کو ہو جائے پھر دل سے یقیں
ماجدی تفسیر ہی وہ گوہرِ نایاب ہے
جس کا ہر ہر لفظ اب تو قابلِ ایجاب ہے

وہ تری ستھری ہوئی سب کو سیاست یاد ہے — وہ تری بیباک دنیا کو صحافت یاد ہے
مُلکوں میں مُلک کے تیری بصیرت یاد ہے — وہ ترے پُر لطف جملوں کی بلاغت یاد ہے
بن گیا ارضِ صحافت کا فلک صدقِ جدید
ہے ترا مرہونِ منت آج تک صدقِ جدید

جتنے تھے، ہمعصر تیرے اُن میں تھا عالی مقام — ہر پڑھا لکھا، تجھے کہتا رہا اپنا امام
جتنے جی، غیروں نے بھی، تیرا کیا ہے احترام — ہم کو یہ کہنا پڑا، اس میں نہیں کوئی کلام
صاحبِ علم و عمل بھی، صاحبِ ادراک بھی
اور ہر سچ بات کہنے میں تھا تو بیباک بھی

عالم و نقاد و صوفی اور صحافی بے نظیر — بے بہا ہیں جس کی اردو میں تصانیفِ کثیر
پاک باطن، نیک طینت، متقی روشن ضمیر — اس کے تذکروں میں ہیں، وہ ازل سے ہم نصیحی
خوبیاں اُس ذات کی کیسے کرے کوئی بیاں
وہ تو ٹھہرا فخرِ ملت، نازشِ ہندوستاں

ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل

انشائے ماجدی کا حسن و آہنگ

حسن و آہنگ دونوں ایسے الفاظ ہیں کہ جو لغوی و معنوی ہر دو اعتبار سے دل کشی و لطافت، گداز و سوز کے حامل ہیں اور ادب لطیف کی تخلیق میں غیر معمولی طور پر کار فرما رہا کرتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد ہمارے ادب کی ایک قد آور شخصیت ہیں اور ان کی بلند بالائی کو ان کے معاصرین میں مشکل ہی سے کوئی پہنچ سکا ہے۔ ان کے ادبی اور تنقیدی تحقیقی اور تہدیدی انشائیے جو "سچی باتوں کی صورت میں ان کے 'سچ'، 'صدق' اور 'صدق جدید' کی ہفتہ وار اشاعتوں میں محفوظ ہیں ان کے حسن انشا اور آہنگ فکر کے شاہد امین ہیں۔ ان کے احساس کی شدت اور جذبات کی گہرائی ان کی تحریر میں تاثیر اور استواری پیدا کر دیتی ہے اور ان کی سچی باتیں بصیرت افروزی اور عبرت آموزی کا مرقع بن جاتی ہیں۔ مولانا نے ہفتہ وار 'سچ' جنوری ۱۹۲۵ء سے نکالنا شروع کیا تھا اور اس کے دوسرے ہی نمبر سے اپنے مخصوص انداز میں 'سچی باتیں' لکھنا شروع کر دی تھیں جن کا سلسلہ ۱۹۷۶ء تک جاری رہا اور اب بھی آموختہ کی صورت میں 'صدق جدید' میں منقول ہوتا رہتا ہے۔

مولانا کی تحریر میں ایک طرف مولانا محمد علی جوہر کی صحافت و صداقت، خودداری، وطن پرستی، بے باکی و شیوا بیانی کی جھلک نظر آتی ہے تو دوسری طرف اکبر الہ آبادی کی ظرافت و خوش طبعی، رنگینی و زندہ دلی، لذت و لطافت، یہ دونوں اصحاب فکر و نظر ان کے معاصر بھی رہے اور صدیق معتبر بھی۔ اور ہر قدم پر ادبی لین دین کا معاملہ ان حضرات سے چلتا رہا۔ علاوہ ازیں مولانا کی کلاسکی ادب سے دلچسپی ان کو اکثر و بیشتر ان شاہراہوں کی طرف رہنمونی کرتی رہی کہ جو مولانا محمد حسین آزاد اپنی یادگار چھوڑ گئے تھے اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے کام لے کر 'آب حیات' اور 'نیرنگ خیال' میں محفوظ کر گئے تھے۔ مولانا عبدالماجد کا فلسفیانہ مزاج مشاہدات سے دور رس نتائج اخذ کرنے میں بیحد کامیاب رہتا ہے اور ان کی وسیع القلبی کسی اچھی چیز کی تعریف کرنے میں کبھی کوئی دشواری محسوس نہیں کرتی۔ انھوں نے علوم مشرقی و مغربی کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنے انشا کا رنگ و آہنگ متعین کرنے میں بڑی دیدہ وری سے کام لیا تھا۔ مولانا کو شعر و سخن سے بے حد دلچسپی تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ چھپے شاعر اور کھلے انشا پرداز تھے۔ ابتدائے عہد میں مولانا نے غزلیں بھی کہی تھیں اور ڈرامہ بھی لکھا تھا۔ 'زود پشیماں' ان کی اس صنف ادب سے فطری لگاؤ کا عملی ثبوت ہے اور ان نظم، بکھند نیز معارف اعظم گڑھ کی ۱۹۱۷ء کی اشاعتیں ان کی غزلیں شائع کر چکی ہیں جو عمر رفتہ کو آواز دینے اور سرود گذشتہ کی یاد تازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مولانا کی غزلوں کے چند اشعار اس خیال سے کہ ان کے حسن انشا اور آہنگ فکر کی ابتدائی صورتوں کی نشاندہی کر سکیں، پیش کیے جاتے ہیں۔ مولانا اس زمانہ میں ناظر تخلص کرتے تھے:-

آہ منت کش اثر نہ ہوئی — شب غم کی کبھی سحر نہ ہوئی
غلط انداز کتنی ہے وہ نظر — آج تک میرے حال پر نہ ہوئی
اس قدر محویت معاذ اللہ — ان کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی

آشفتہ سری پر مری کیوں طنز ہوا تنا — تو خود تو ذرا ہر بھی زلف دوتا دیکھ

لازم ہو کبھی دل ہی ان کی بھی ستمگر ٹوٹے نہ کہیں ہمت ارباب وفا دیکھ

تغزل اور ڈرامہ نگاری کا یہی فطری رجحان مولانا کے انشائیوں میں حسن و آہنگ کا ذمہ دار ہے اور بات میں بات پیدا کرنے میں ان کا معین و مددگار ہوتا ہے۔ مولانا کے چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے، سبک اور نازک جملے، نیز پیچیدہ ترکیبوں اور مشکل الفاظ سے احتراز ان کے انشائیوں کی شگفتگی میں اضافہ کرتا ہے اور اکثر اوقات ان کی مرجز و مقفےٰ نثر 'نثری نظم' کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر باز دگی یا انقباض خاطر کا باعث نہ ہو تو ان کی نثری نظم کا ایک آدھ نمونہ پیش کیا جائے۔

۲۰ اگست ۱۹۲۶ء کے سچ میں آسمانی فیوض و برکات اور خالق سماوات کی عنایات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

زمین خشک، مردہ، بے جان پڑی ہوتی ہے
جب آسمان سے پانی برستا ہے اسی وقت
ہر طرف تازگی و شادابی پھیل جاتی ہے
سبزہ لہلہانے لگتا ہے
پھول کھلنے لگتے ہیں
اور ذرہ ذرہ میں گویا جان پڑ جاتی ہے۔
زمین پر تاریکی چھائی ہوتی ہے
ہر چیز اندھیرے کے حجاب میں لپٹی ہوتی ہے
جب آسمان پر آفتاب طلوع ہوتا ہے
اور اس کی کرنیں زمین پر پہنچتی ہیں
تو ہر شے روشن ہو جاتی ہے
ہر طرف نور پھیل جاتا ہے۔
کوئی چیز چھپی ہوئی یا دھندلی نہیں رہ جاتی
اور ذرہ ذرہ جگمگانے لگتا ہے۔
آفتاب جب چھپ جاتا ہے
تو زمین پھر بے نور ہو جاتی ہے،
اور سارا منظر بے روپ، بھیانک اور بے رونق ہو جاتا ہے
جب آسمان پر چاند اور تارے طلوع ہوتے ہیں
تو یہ بدمنظری پھر دور ہو جاتی ہے
اور آنکھوں کے سامنے
زینت، رونق اور خوشنمائی کا
ایک نیا سماں پھرنے لگتا ہے
درخت جب خشک ہو جاتے ہیں
سبزہ جب جل جاتا ہے
زمین جب پیاسی ہو کر تپنے لگتی ہے
دریاؤں کے لبوں پر جب
ریت کی پپڑیاں جم جاتی ہیں
تو آسمان ہی کی بارش اپنے فیض و کرم سے
ان سب کو سیراب، سب کو تر و تازہ،
اور سب کو شاداب کر دیتی ہے۔
اگر آسماں کی دستگیری
قدم قدم پر سہارا نہ دیتی رہتی
تو آج نہ زمین موجود ہوتی نہ زمین کی دلچسپیاں
اور خوشنمائیاں
نہ زینتیں اور رونقیں
نہ آرائشیں نہ آسائشیں۔

مولانا کا لفظ لفظ اور فقرہ فقرہ، جملہ جملہ اور سطر سطر معنی و بیان کی شگفتگی کی حامل ہے، اور ان کی دوررس نگاہیں روزمرہ کے مشاہدات اور مناظر قدرت کے مطالعہ سے دانش آموزی اور حکمت آفرینی کا لطیف کام کمال قادر اندازی سے لے رہی ہیں

مولانا کی ڈرامہ نگاری کی صلاحیتوں سے اگر لطف اندوز ہونا ہو تو اکبرنامہ میں تائبہ کی موت اور ایک سچا واقعہ پڑھ لیجئے۔ اس طرح اکبر الہ آبادی کی زندگی اور شاعری کو بھی بہت قریب سے دیکھا جا سکے گا اور مولانا عبدالماجد سے ان کی بے تکلفی اور یگانگت کو بھی۔ تائبہ کی موت میں اکبر الہ آبادی کی نوجوانی کی ایک محبوبہ کا ذکر نہایت ڈرامیٹک انداز میں کیا گیا ہے اور ایک سچا قصہ لیفٹیننٹ کلارک اور مسز فلہم کے معاملات عشق و محبت سے متعلق ہے۔

دونوں حادثات و واقعات کی تفصیل اس جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کی ہے کہ مولانا کی مرقع نگاری اور منظر کشی کی داد دینا پڑتی ہے اور مشرقی روایات و مغربی ذہن کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

اسی سلسلہ میں ۱۸۵۷ء کے تاریخی ڈرامہ کے ایک منظر کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں جو بنگالی میں کھیلا گیا تھا اور مولانا کی سچی باتوں (۲۲ دسمبر ۱۹۳۳ء) میں اس کا ذکر کیا گیا ہے:۔

اٹھارویں صدی کے وسط کا زمانہ ہے۔ علاقہ بنگالہ نواب سراج الدولہ کے زیر حکومت ہے۔ پایہ تخت مرشد آباد ہے... اتنے میں خبر آتی ہے کہ فرانس اور انگلستان میں جنگ چھڑ گئی۔ انگریزوں کا کارخانچہ ہندوستان میں کلایو نامی ہے۔ وہ جھٹ فرانسیسیوں کے شہر چندر نگر پر قبضہ کر بیٹھتا ہے۔ فرانسیسی قدرتاً حاکم وقت کے دربار میں فریادی بن کر حاضر ہوتے ہیں۔ سراج الدولہ کہتا ہے کہ میں تمہاری دادرسی کر دوں گا۔ اور غاصب وظالم انگریزوں سے تمہارا حق تم کو دلاؤں گا۔

کلایو ہندوستان کی سیاسیات کے سبق اپنے فرانسیسی حریف ڈوپلے سے سیکھ چکا تھا۔ جھٹ سراج الدولہ کے امراء میں سے ایک میر جعفر کو توڑ انھیں تخت و تاج کا دعویدار بنا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ اور یہ کارروائی اس خفیہ ہوتی ہے کہ سراج الدولہ کو عین معرکہ کے وقت تک اس کی خبر نہیں ہوتی۔

پلاسی کے مقام پر رن پڑتا ہے۔ کلایو غفلت میں حملہ کرتا ہے اور غنیم کو عین وقت تک دھوکے میں رکھنے کے لیے خود میر جعفر کے رسالے بھی فیر کرتا جاتا ہے۔ میر جعفر مع اپنی فوج کے الگ کھڑے ہوئے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اور جب سراج الدولہ کے پیر اکھڑ لیتے ہیں تو آ کر کھلم کھلا انگریزوں کے شریک ہو جاتے ہیں۔

مولانا کی شعر فہمی، شرح نگاری، حسن انشا اور تحسین سخن شناسی کی ایک جھلک اکبر الہ آبادی کے اس شعر کی تشریح میں ملاحظہ ہو جو اکبر میری نظر میں (صفحہ ۱۰۳) واقع ہے:۔

حادثہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

"چمکی" میں وہ بے پناہ بلاغت ہے کہ سننے والا لوٹ پوٹ جائے۔ یہ "چمک" بالخصوص بے "نئی روشنی" کی حسینوں کے ساتھ "بلند فانوسوں" میں "ملٹی واٹ" والے چراغوں میں "چمک دمک" بھلا کہاں؟ شرم و حیا سے آزادی، دنیا کی دلستانی کے لیے "ناز و انداز" قابلیت کے جوہر کی جلا، سب کچھ اس ننھے سے لفظ "چمکی" سے ظاہر و آشکار۔ اور... "شمع انجمن" اور "چراغ خانہ" کی مثال کس قدر روشن، کیسی ضیا بار، تشبیہ کی تشبیہ اور پھبتی کی پھبتی۔ شعر کیا ہے۔ بیسویں صدی کی "کالج گرل" کی قد آدم تصویر۔

مولانا کے احساسات کی شدت اور جذبات کی گہرائی، حزن و یاس کی مصوری اور شخصی رنج و غم کی ترجمانی کا نمونہ ۱۹۰۲ء میں لکھے ہوئے ان کے "وصیت نامہ" کے اوراق میں ملاحظہ ہو جو انھوں نے اسی سال کی عمر میں قلم بند کیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی عبدالمجید صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے حادثہ ارتحال سے اور ان کے آٹھ سال بعد اپنی بیوی کے انتقال سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب نے دسمبر ۱۹۱۶ء میں دفعتاً انتقال کیا۔ دل توڑنے کو یہی صدمہ کیا کم تھا کہ محبوب بیوی شروع جنوری ۱۹۲۶ء میں اپنے بچے باندھے میں بالکل دفعتاً سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں اس نے تو مجھ کو بالکل ہی بٹھا دیا۔ چنانچہ آج تک ہنسی اس کے بعد سے ہونٹوں پر نہیں آئی ہے اور اب امید اور انتظار اس کا رہنے لگا ہے کہ دیکھیے کب اس مرحومہ کا دیدار نصیب ہوتا ہے؟"

نثری نظموں کا تذکرہ اس سے پہلے کیا جا چکا ہے جس سے مولانا کی طبع رسا اور حسن انشا کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اب بھوائی لکھنؤ کے مشہور و معروف طبیب حکیم عبدالحمید صاحب کے انتقال پر مولانا عبدالماجد کے نثری مرثیہ کا کچھ اقتباس ملاحظہ ہو جو ۱۹۴۱ء کے "صدق" میں شائع ہوا تھا:

صبح تھی ۲۵ دسمبر کی اور وقت کوئی ۹ بجے کا
کہ خلقت کا ایک ہجوم
موٹروں سے اور گاڑیوں سے، تانگوں سے اور سائیکلوں سے اترکر

میدل رواں نظر آیا!
لکھنؤ کے ایک مشہور محلہ کی تنگ گلی میں
محلہ جھوائی ٹولہ، شہر اور صوبہ کا مشہور دارالشفار
دلی کے بعد طب یونانی کا دوسرا دارالحکومت
مریضوں اور زندگی سے مایوسوں کا قبلۂ امید
آج سے نہیں، پشت ہا پشت سے ....

مریضوں کے پھیرے گلی میں روز ہی لگتے رہتے تھے
اور وقت بھی یہی ہوتا تھا۔
آج کے مجمع کا رنگ سب دنوں سے الگ تھا
آج قدم اٹھ رہے تھے افسردگی سے
اور دل پگھل رہے تھے عبرت کی گرمیوں سے
آج نبض دکھانا نہ تھی، نسخہ لکھانا نہ تھا، حال کہنا نہ تھا
خود حکیم صاحب کا جنازہ پڑھنا تھا.....

انتقال سے چند روز قبل عیادت کا اتفاق چند منٹ کے لیے ہوا
چہرے پر نور اور زیادہ آ گیا تھا
گھلتے جاتے تھے اور دھلتے جاتے تھے .....

انشائے ماجدی کا حسن و آہنگ ان کی طبعی لطافت اور وسعت مطالعہ کا رہین منت ہے۔ ان کی زباں دانی اور شیوا بیانی ان کے انشائیوں کو دلکش اور دل نشین بنا دیتی ہے اور ان کے سادہ سلیس الفاظ پرکاری کا باعث ہو جاتے ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب اور حسن ترتیب، ان کے متوازن جملوں اور مترادف فقروں کو سحر و اعجاز کا مرتبہ دے دیتی ہے اور تخیل کی کار پردازی نیز ندرت فکر ان کی مرصع و مقفیٰ عبارت کو موثر و مطلا کر دکھاتی ہے۔ مولانا کے فقروں کے ٹھاٹھ کسی بربط نواز کے تال سر سے کم نہیں ہوتے اور ان کے لہجہ کا زور اور معنویت کی اشاریت سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔ ان کا طرز تخاطب اور جذبات کی لہریں نثر میں نظم کا کیف و سرور پیدا کر دیتی ہیں۔ اور ان کی رمزی و ایمائی نگارشیں ادب لطیف کی خصوصیات کی حامل ہو جاتی ہیں۔ رومانیت اور رعنائیت، رنگینی اور معنی آفرینی ان کے ہر جملہ میں اثر انداز ہوتی ہے اور ان کی عبارت کو تاثیر و طلسم کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ وہ صنائع لفظی سے بھی کبھی کبھی کام لیتے ہیں اور ضلع جگت میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی انشا پردازی کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے، ممکن ہے اس میں بعض حضرات کو تبلیغ و اغراق کا کچھ شائبہ نظر آئے، لیکن اس صورت حال کے باوجود پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مستند، منفرد اور صاحب طرز انشا پرداز تھے اور ان کی فلسفیانہ نگاہ اور منطقی استدلال، حکمت آموزی اور بصیرت افروزی ہمارے ادب میں ایک خاصہ کی چیز ہے۔ ان کی خداداد ذہانت اور فطری ذکاوت ان کی خضر راہ ہے اور مشرقی مغربی، قدیم و جدید علم و ادب سے ان کی واقفیت ان کی قادر البیانی کا سر بستہ و دلنواز راز ہے۔

★

"اردو میں شاذ و نادر ہی ایسے ادیب ہوں گے جن کے یہاں قرآن و حدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ و نفسیات سوانح و سیر، سفرنامہ اور ڈائری، سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل، شاعری اور تخلیقی نثر، افراد اور تحریکات کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ اظہار خیال میں تازگی، لطف زبان، نشتریت اور بلاغت بھی، غرض یہ ساری خوبیاں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں...... بہت سے دوسرے علمی کاموں سے قطع نظر مولانا دریابادی اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔"
پروفیسر احتشام حسین

ضیاء الدین اصلاحی

مولانا عبدالماجد کی عقیدت و نفرت کا اصول

عموماً لوگ اشخاص و افراد سے عقیدت و نفرت کے معاملے میں بڑی افراط و تفریط میں مبتلا ہوتے ہیں، اگر کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں اور اس کو فرشتہ سمجھنے لگتے ہیں، قائدین اور رہنماؤں کی محبت و عقیدت ان کو اندھا بہرا کر دیتی ہے اور وہ انھیں عملاً معصوم خیال کرنے لگتے ہیں اور ان کی مخالفت میں ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جب کسی سے خفا اور ناخوش ہوتے ہیں تو اس کو گالیاں دیتے ہیں اور اس پر لعنت برساتے ہیں اور ہر طرح سے اس کی تذلیل و تنقیص اور اہانت کے درپے رہتے ہیں۔

اعتدال، توازن، سلامت روی اور حقیقت پسندی مفقود ہوگئی ہے اور لوگ اشخاص کو ان کے صحیح درجہ و مرتبہ پر رکھنا بھول گئے ہیں، مخالف کے اندر کسی خیر و خوبی کا تصور عنقا اور موافق کے اندر خامیوں اور غلطیوں کا ہونا بالکل محال سمجھا جاتا ہے اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ قابل احترام و لائق عقیدت بزرگ سے اختلاف جرم و معصیت ہے اور کسی مخالف کی حق بات کی تائید گناہ عظیم ہے۔

اس اندھا دھند افراط و تفریط سے بہت کم لوگ خالی ہوتے ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی ایسے ہی خال خال لوگوں میں تھے جن کا دامن افراط و تفریط سے بڑی حد تک پاک تھا، وہ ان لوگوں کو عیوب و نقائص سے مبرا اور معصوم نہیں سمجھتے تھے جن سے ان کو غیر معمولی عقیدت تھی، ان کا احترام کرنے کے باوجود بھی وہ ان کی غلط رائے سے اختلاف کرتے تھے۔ اسی طرح جن لوگوں سے ان کو عقیدت و نیازمندی کا کوئی تعلق نہ ہوتا یا جن کے فکر و مسلک اور عقیدہ و خیال سے ان کو اتفاق نہ ہوتا ان کو نہ شیطان سمجھتے تھے اور نہ ان کی واقعی خوبیوں اور کمالات کا انکار کرتے تھے۔

یہ معروضی انداز شروع ہی سے ان کے اندر موجود تھا، ان کے علمی سفر کی ابتدا فلسفہ سے ہوئی تھی جس زمانہ میں ان پر الحاد و ارتداد کا جادو چل گیا تھا اس میں وہ کھلم کھلا اپنے کو عقلیت پسند کہتے تھے، گو یہ دور بہت عارضی تھا اور جلد ہی مولانا مذہب کی طرف مائل ہوگئے اور پھر اس میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ اپنی بعض فلسفیانہ کتابوں کو اپنی تصنیفات کی فہرست ہی سے خارج کر دیا تاہم یہ معروضی نقطہ نظر اور عقلیت کا اثر یک گونہ ہمیشہ ان میں باقی رہا، ان کے مزاج میں طبعاً آزادی تھی، ان کے ماحول اور تعلیم کا بھی اس میں دخل تھا، وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

"انگریزی کالجی تعلیم سے طبیعت میں جو ڈھٹائی پیدا ہو جاتی ہے وہ پوری طرح مشکل ہی سے جاتی ہے اور پھر بعض میں طبعاً وہ عدم اطاعت یا بے انقیادی ہوتی بھی معمول سے کچھ زائد ہے اپنا حال ایسا ہی تھا۔" (حکیم الامت۔ ص ۴۰)

اسی لیے ملازمت کی قید و بندش سے انھوں نے اپنے کو آزاد رکھا تاکہ دوسروں کی محکومی کی ذلت انگیز نہ کرنا پڑے، شروع میں والد کے انتقال کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ موقوف ہوا تو صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں بطور لٹریری اسسٹنٹ پونے دو سو روپیہ ماہوار پر ان کا تقرر کیا، اس وقت

کے لحاظ سے یہ تنخواہ نہ تھی، مولانا کو احتیاج بھی تھی اور صاحب زادہ صاحب کا برتاؤ ان کے ساتھ حاکمانہ کے بجائے شفقت و عنایت کا تھا، لیکن ملازمت کی پابندی مولانا کو گراں گزری اور انھوں نے دو ہی مہینے کے بعد عذر کرکے استعفا دے دیا۔ اس کے سال بھر بعد حیدرآباد کے محکمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ میں مترجم فلسفہ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، تنخواہ تین سو ماہوار سے شروع ہوئی لیکن طبیعت کی آزادی دبے قیدی پھر رنگ لائی اور دس گیارہ ماہ کے بعد چھٹی لے کر لکھنؤ آئے اور یہاں سے استعفا بھیج دیا۔

مولانا نے اندھی تقلید کا قلادہ اور ذہنی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈالنا کبھی گوارا نہ کیا اس لیے ان کو اپنی محبوب اور قابل احترام ہستیوں کی رائے سے اختلاف کرنے میں تامل نہ ہوا اور نہ کبھی انھوں نے اپنے اس طرز عمل کو ان کے احترام و عقیدت کے منافی یا ان کی شان میں سوءِ ادب خیال کیا۔ جابجا ان کی تحریروں میں اس کی صراحت موجود ہے مثلاً:

"اعتقاد کامل اور اعتماد کامل اور انقیاد کامل جس شے کا نام ہے وہ زندہ بزرگوں کے ساتھ کیا معنی کسی پہلے بزرگ کے ساتھ بھی نہیں پیدا ہوتا یعنی ایسا اعتقاد کہ ان کا ہر قول، ہر عمل بلا استثنا واجب الاتباع سمجھنے لگوں یہاں تک کہ مولانائے روم سے بھی نہیں جن کی مثنوی کا عاشق ہوں اور جس کو اپنا اصلی ہادی سمجھ رہا ہوں حضرات صحابہ تک میں بعض کی قابل حبس اور بعض کی قابل رحم لغزشیں آخر روایات صحیحہ سے ثابت ہیں یا نہیں؟ تو پھر دوسرے بزرگوں کے اتباع کامل کے معنی ہی کیا رہ جاتے ہیں[1]"

مولانا عبدالماجد کے نزدیک کسی بزرگ یا شیخ کی ہر ہر رائے سے مکمل اتفاق نہ کرنا جس طرح اس کی بزرگی و عظمت کے منافی یا اس کی عقیدت و احترام میں مانع نہ تھا، اسی طرح یہ قطعاً معیوب اور مذموم بھی نہیں تھا، وہ تحریک خلافت کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علمائے حق کی اکثریت کا فتویٰ حکومت سے ترک موالات اور تحریک خلافت کی تائید میں تھا، حضرت[2] کا مسلک اس سے مختلف تھا، مسلک اجتہاد میں اختلاف تو اسلام کی تاریخ میں شروع ہی سے داخل رہا ہے اور عامہ صحابہ کیا معنی خلفائے راشدین تک کا دور اس سے مستثنیٰ نہ رہا اور اگر اختلاف کی بنیاد محض حق و اخلاص ہے تو یہ ذرہ بھر بھی عیب نہیں بلکہ عین رحمت ہے[3]"

آگے مولانا عبدالماجد دریابادی کی چند محبوب و محترم شخصیتوں سے ان کی عقیدت کا حال اور اسی ضمن میں مولانا کی عقیدت و نفرت اور احترام و اختلاف کے معیار و اصول کی وضاحت کی جائے گی، نیز چند امور و مسائل میں ان کے اپنے محترم و محبوب بزرگوں سے اختلاف کا ذکر آئے گا تاکہ مولانا کے عدم افراط و تفریط اور جوش عقیدت میں بھی اعتدال و سلامت روی پر قائم رہنے کا ثبوت اچھی طرح مہیا ہو جائے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ گو مولانا عبدالماجد مولانا اشرف علی سے بیعت نہ تھے لیکن اصلاح و ارشاد کے لیے ان سے برابر تعلق رکھتے تھے اس بنا پر مولانا کو سب سے زیادہ ان ہی سے عقیدت تھی چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں:

"عقیدت دینی، مذہبی، روحانی رنگ کی جس زور و قوت، جوش و ولولہ سے حضرت حکیم الامت کے ساتھ ہوئی کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ تھی[4]"

"لیکن یہاں (مولانا تھانوی کے یہاں) کا مضمون ہی کچھ اور تھا۔ ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

حضرت کی شان ہی سب سے الگ، سب سے نرالی تھی۔"

(حکیم الامت۔ ص ٤٦)

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

---

[1] حکیم الامت، ص ٣٠٦-٣٠٧، [2] اس سے مولانا تھانوی مراد ہیں، [3] حکیم الامت، ص ٤٩، [4] حکیم الامت، ص ٤٤١۔

"یہ حضرت ایک ہی وقت میں صوفی محقق بھی تھے اور متکلم بے بدل بھی، رومی عصر بھی اور رازی وقت بھی، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث و تصوف کے علاوہ و کلام قدیم و جدید کے بھی خدا معلوم کتنے مسائل بیان مجلسوں میں، وعظوں میں برابر بیان ہوتے رہتے اور ہم جیسے کتنے بے مایہ اور کم مایہ ہیں سے خوشہ چینی کر کرکے اپنی بات بناتے، اپنی دوکان چمکاتے ؎"

(حکیم الامت، ص ۶۲)

" زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے ... بڑے بڑے عابد، زاہد، متقی، تہجد گزار نظر سے گزرے ... لیکن اصلاح و ارشاد کی مسند نشینی کا حقدار اپنے ۱۵، ۱۶ سال کے تجربہ میں جیسا حضرت تھانوی کو پایا اور کسی کو نہ پایا۔ ع

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

... جتنے کمالات طویل سابقہ کے بعد اس ذات میں نظر آئے ان کی نظیر سے اپنا خزانہ دماغ خالی ہے"

(حکیم الامت ص ۶۱۲)

غبار کارواں[1] میں رقمطراز ہیں :

" قسمت نے یاوری کی کہ مولانا اشرف علی کی خدمت میں رسائی ہو گئی جہاں رنگ سب سے نرالا تھا، یہاں سے جو کچھ پایا بس اپنے ظرف کا منتہا وہی تھا"

اقتباسات کہاں تک نقل کئے جائیں مولانا کی تصنیف "حکیم الامت" اسی ارادت، عقیدت، محبت اور تعلق کی دلچسپ داستان ہے اس کے سرنامہ کا یہ مصرعہ ع

اے تو افلاطون و جالینوس ما

مولانا کی غیر معمولی عقیدت و نیازمندی کا مکمل طور سے غماز ہے۔ اس فرط تعلق اور بے پناہ عقیدت کے بعد کون خیال کر سکتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی ان سے کسی مسئلہ میں اختلاف رائے بھی رکھتے رہے ہوں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک دو نہیں بے شمار مسائل میں ان کو اپنے اس مرکز عقیدت و عظمت والے بزرگ سے اختلاف تھا اور شدید اختلاف، اس کا سبب یہ تھا کہ مولانا کی عقیدت و نیازمندی کا ایک خاص اصول تھا اس لیے وہ اپنی محبوب سے محبوب شخصیت سے بھی ایسی اندھی عقیدت و محبت نہیں رکھتے تھے کہ اس کی ہر ہر بات کو بے چون و چرا مان لیں بلکہ ان کا حقیقت شناس اور اعتدال پسند ذہن بڑی جرأت و بیباکی سے اظہار اختلاف کر گزرتا تھا اور اس کو ذرا بھی عقیدت و ارادت کے منافی نہیں خیال کرتا تھا چنانچہ لکھتے ہیں:

"عقیدت گہری ہوئی مگر اندھی نہیں، نظر اپنی خطاداریوں پر بھی رہی اور مکتوب الیہ کی بشریت پر بھی۔ سیاسی اختلافات خصوصاً تحریک[2] خلافت سے مخالفت کا کانٹا دل میں کھٹکے گیا[3]"

"عقاید و مسائل کے جزئیات میں شرح صدر ہو یا نہ ہو اس کا کوئی اثر جذبہ محبت و تعلق عقیدت پر نہیں پڑ سکتا تھا[4]"

"غرض عقیدت و عظمت کی ہر منزل گو یا دل میں گھر کئے ہوئے تھی اس پر بھی طبیعت کی کجی کہئے یا فہم کی کمی یا شاعر کی زبان میں۔ ع

ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

سیاسیات تو پھر خیر دور کی چیز تھی، فقہیات تک میں انقیاد کامل اور سو فی صدی انقیاد کا درجہ کسی طرح حاصل نہ ہوا، سیاسیات میں تو غیر مقلدی خوب نمایاں تھی، فقہیات میں بھی کچھ ایسی شاذ نہ تھی[5]"

"آنکھ بند کرکے بے چون و چرا مان لینے والی عظمت مجھ نا سمجھ کی سمجھ میں بس یا تو نص قرآنی کی ہو سکتی ہے اور یا پھر مستند قول رسول کی، باقی اکابر امت میں سے تو بڑے سے بڑے محقق کے لیے بھی خطا و لغزش کا امکان لگا ہوا ہے خصوصاً ان

---

[1] یہ مقالہ مولانا نے رسالہ آجکل کی فرمائش پر اس کے لیے لکھا تھا اس میں اپنے خود نوشت حالات تحریر فرمائے تھے۔

[2] اوپر گزر چکا ہے کہ عام علمائے حق کے برخلاف مولانا تھانوی کو مجلس خلافت اور تحریک ترک موالات سے اختلاف تھا لیکن مولانا محمد علی کے اثر سے مولانا دریا بادی اس کے پرجوش حامی اور ایک زمانہ میں صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی تھے [3] حکیم الامت، ص ۴۔

[4] حکیم الامت، ص ۱۱۱ [5] حکیم الامت، ص ۱۳۰۔

علوم وفنون میں جو دینیات سے باہر ہیں[1]"

"کسی بزرگ کو بزرگ ومعظم ماننے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ اس کی ساری ہی باتیں دل میں اتر جائیں اور اس کا ایک ایک جزئیہ واجب التسلیم ہو جائے کم از کم اپنا عقیدہ تو یہی ہے اور اطاعت مطلق وغیر مشروط صرف رسول معصوم ہی کا حق خصوصی معلوم ہوتا ہے اور عقیدہ وخیال کو بھی چھوڑیے طبعی طور پر بھی اپنے کو انقیاد واطاعت کی یہ دولت کبھی ملی ہی نہیں کہ اُدھر سے جو کچھ اور جس مسئلہ میں بھی ارشاد ہو وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہرحال اسے بے چون وچرا ہی مان لیا جائے۔ وقتیے بیسوں مسئلے اور پھر ان کے جزئیات تو سیکڑوں ایسے تھے جس میں اس نادان کو اُس دانائے عصر (مولانا تھانوی) کے ساتھ موافقت نہ ہوئی اور عقیدت وعظمت میں پھر بھی کوئی فرق نہ آیا۔"
(حکیم الامت، ص ١٣٥)

"کیا میری نیاز مندی اور قلبی عقیدت ایسی ایسی ہلکی چیزوں سے بدل جانے والی ہے مسائل مختلف فیہ میں اختلاف ونزاع تو آج سے نہیں سلف سے چلا آیا ہے پھر جب مالک وشافعی سے بدعقیدگی کسی حنفی کیلیے جائز نہیں تو اس وقت ان مسائل کی بنا پر دور حاضر کے حکیم الامت سے کیونکر جائز ہو سکتی ہے؟ یہ تو خیر ایک سیاسی مسئلہ ہے میں تو متعدد فقہی مسائل میں بھی جناب والا کے ارشادات کو اپنی فہم سے بالاتر پاتا ہوں بایں ہمہ جو نیاز مندی قائم ہو چکی وہ غیر متزلزل ہے، غزالی کی فقہ کو اپنے لیے حجت نہیں سمجھتا لیکن سلوک وفن اصلاح نفس میں انہیں امام الائمہ سمجھتا ہوں اور وہ زندہ ہوتے تو ان کی کفش برداری اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ـــــ بلا شائبہ تصنع وتملق عرض ہے کہ ایسا ہی معاملہ جناب والا کے ساتھ ہے۔" (حکیم الامت، ص ٥٩)

"حضرت سے اعتقاد کامل رکھنے کے باوجود جیسا کہ بالکل ظاہر ہو چکا ہے میں مقلد وجامد نہ تھا اور فقہیات وکلامیات دونوں میں کبھی کبھی اپنی کم نظری سے اپنی ہی بات پر قائم رہتا تھا حضرت نے بھی اس ڈھٹائی کی خوب اجازت دے رکھی تھی۔" (حکیم الامت، ص ٢٦٩)

"شبہ نفس اتباع میں نہیں اتباع کامل میں بار بار پیدا ہوتا ہے اور دل کہتا ہے کہ یہ صورت تو شرک فی النبوۃ کی سی ہے آنکھ بند کر کے اتباع تو صرف نبی معصوم کا کیا جا سکتا ہے باقی اور کوئی صاحب کیسے ہی بزرگ ہوں، بہرحال رائے میں بھی غلطی کریں گے اور عمل میں بھی۔ اور یہ نہ ہو تو پھر ان میں اور معصوم میں فرق ہی کیا رہے گا ہم ہزارہا غلطیاں کریں گے اور روزمرہ، وہ بہت کم کریں گے اور کبھی کبھی، لیکن بہرحال جب حضرات صحابہ تک نہ عملی معصیتوں سے محفوظ رہے، نہ اجتہادی لغزشوں سے تو دوسرے حضرات کا مرتبہ تو ان سے بھی فروتر ہے، میرے دل کو تو سب سے زیادہ حضرت سید احمد شہید کا قول (جناب تھانوی ہی کی روایت سے سنا ہوا) لگتا ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کسی خاص مسئلہ میں ان سے گفتگو کرتے کرتے خلاف ادب سمجھ کر رُک گئے تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو شرک فی النبوۃ ہے مولانا رشید احمد گنگوہی نے جو معاملہ اپنے مرشد کے رسالہ "فیصلہ ہفت مسئلہ" سے متعلق کیا وہ بھی عین اسی کی تائید میں ہے۔" (حکیم الامت، ص ٣٠٦)

"اس عریضہ میں ایک شبہ جو خود حضرت کی ذات پر بحیثیت شیخ کے پیدا ہوا تھا اس کو بھی حضرت کی خدمت میں نقل کر دیا گیا تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس نامہ سیاہ کے حدود حضرت کے عام مریدین، معتقدین، مرشدین سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں، یہ حضرات ایسی چیزیں زبان پر لانا ہی (دوسروں کی نیابت وترجمانی میں بھی) سوء ادب میں داخل سمجھتے تھے یہ عاجز ایک غیر معصوم بزرگ پر خود ایسے شبہات کے ایراد میں کوئی مضائقہ نہیں پاتا چہ جائیکہ دوسروں کی ترجمانی میں۔" (حکیم الامت، ص ٣٥٢)

---

[1] حکیم الامت، ص ٤٢٩۔

ان اقتباسات سے مولانا دریا بادی کی عقیدت اور اختلاف رائے کے اصول وحدود کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے لیکن ان کی حیثیت مجرد دعووں کی ہے آگے ان کے ثبوت کے لیے بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کا سب سے اہم بالشان کارنامہ انگریزی و اُردو میں قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر ہے اس لیے سب سے پہلے کلام مجید کی تفسیر ہی سے متعلق ان کے اور مولانا تھانوی کے بعض اختلافات نقل کئے جاتے ہیں۔ مولانا تھانوی سے مولانا عبدالماجد کی بے پناہ عقیدت کا حال پہلے تحریر کیا جا چکا ہے، تفسیر ماجدی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کی تفسیر بیان القرآن پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے تھے اور اسی کو سب سے بہتر بھی خیال کرتے تھے جیسا کہ وہ اپنے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اب ادھر چند سال سے مسلسل مشغلہ اس بے علم و نااہل کا خدمت قرآنی کا ہے اپنا تجربہ یہ ہے کہ دوسرے حضرات کے یہاں اکثر اوراق پر اوراق الٹ جانے سے بھی وہ گہرے نکتے نہیں ملتے جو مفسر تھانوی کے یہاں چند سطروں کے اندر میسر آجاتے ہیں۔" (محسن کتابیں، ص ۲۱)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تفسیر کے تمام مباحث سے ان کو کلی اتفاق تھا حکیم الامت میں جا بجا ان کی تفسیری رایوں سے مولانا نے اپنی بے اطمینانی و عدم تشفی کا ذکر کیا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"قرآن مجید نے اصحاب کہف[له] کی نیند کی مدت ان لفظوں میں بیان کی ہے۔

ثلث مائة سنین وازدادوا تسعا (سورہ کہف) غار والے تین سو سال تک سوتے رہے اور مزید نو سال۔"

مولانا دریا بادی نے تین سو کے عدد اور نو کو الگ الگ لانے کے سلسلہ میں مولانا تھانوی کی توجہ اس نکتہ کی جانب مبذول کی کہ:

"بہ حساب شمسی وہ مدت پورے تین سو سال کی تھی اور بہ حساب قمری وہی مدت ۳۰۹ سال کی، تین سال کا فرق ہر صدی میں دونوں سنوں میں ہو جاتا ہے۔"

لیکن مولانا تھانوی نے اس نکتہ کو غیر محقق قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

"اس پر کوئی دلیل نہیں کہ وہ سال شمسی تھے اور بے دلیل قرآن میں جزماً دعویٰ کرنا بہت خطرناک امر ہے ہاں غایۃ مافی الباب یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ بنا ہو واللہ اعلم۔"

اس صراحت کے باوجود مولانا دریا بادی اپنی رائے پر قائم رہے، لکھتے ہیں:

"اس قول کے غیر محقق ہونے کے باب میں حضرت مولانا کے ارشاد سے ایک حد تک اختلاف ہے، اکابر سلف سے تو برابر یہ تفسیر نقل ہوتی چلی آرہی ہے اور ابن کثیر، معالم، بحرالمحیط، جلالین، روح المعانی وغیرہ سب میں اس کا ذکر موجود ہے بلکہ بعض نے تو اسے حضرت علیؓ کا قول بتایا ہے۔"

(حکیم الامت، ص ۳۱۴ و ۳۱۵)

قرآن مجید نے جہاں نصاریٰ کے بارہ میں یہ صراحت کی ہے کہ وہ حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ کہتے تھے وہیں یہود کے بارے میں بھی یہ کہا ہے کہ وہ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہتے تھے اس کے متعلق مولانا دریا بادی نے مولانا تھانوی کو لکھا کہ "آج کل کے یہود کہتے ہیں کہ ہم عزیر کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہی نہیں، یہ ہماری توحید پرستی پر اتہام ہے اس کا جواب مجھے ان ہی کی کتابوں سے ڈھونڈھ کر نکالنا ہے۔"

مولانا تھانوی اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"اگر کہیں نہ ملے تو سہل جواب یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت

له یہ حضرت عیسٰی کے بعد کے چند اہل حق تھے جو دین عیسوی پر قائم تھے اور خدا پرستی کے جرم میں جب ان کی قوم نے ان کو بہت تنگ کیا تو انھوں نے ایک غار میں پناہ لی، خدا نے اپنی قدرت و حکمت سے ان پر نیند طاری کر دی اور یہ مدتوں سوتے رہے، عربی میں کہف غار کو کہتے ہیں۔

کوئی جماعت ایسی رہی ہوگی جس کے خلاف کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں ۔"

مولانا اس جواب سے اپنی بے اطمینانی ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"حضرت کا یہ جواب تو مجھے اُس وقت بھی دل کو نہ لگا اور اب بھی اس کو ناکافی سمجھتا ہوں اپنی تفسیر میں میں نے یہ عرض کر دیا ہے کہ ابن اللہ کا مفہوم ولد اللہ سے الگ ہے اور محاورۂ قرآنی میں ابن و ولد مرادف نہیں' ولد سے مراد صلبی بیٹا ہی ہوتا ہے بر خلاف اس کے ابن عام ہے ہر چہیتے' لاڈلے کو ابن کہہ سکتے ہیں جیسے قرآن کی اس آیت میں نحن ابناء اللہ و احباؤہ یہاں ظاہر ہے کہ ابناء سے مراد صلبی بیٹے نہیں بلکہ صرف چہیتے اور لاڈلے مراد ہیں مسیحیوں کا شرک دوسرے قسم کا تھا وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا ولد اور ابن سمجھنے لگے تھے یہود کا شرک وہاں تک نہیں پہنچا وہ عزیر کے ہر لفظ کو وحی الٰہی کا آخری لفظ قرار دینے لگے اور توریت کی گمشدگی کے بعد جب حضرت عزیر کے نوشتے انہیں ہاتھ آگئے تو اب بعد کے کسی ہادی و رسول کی ہدایت سے اپنے کو مستغنی سمجھنے لگے اور یہی معنی ہیں ان کے عزیر کو ابن اللہ ماننے کے ۔"
(حکیم الامت' ص ۳۸۱' ۳۸۲)

قرآن مجید نے ایک جگہ یہود کے ایک بڑے ہی نافرمان گروہ کی سزا یہ بیان کی ہے کہ" ذلیل بندر ہو جاؤ" اس کے دو مفہوم لیے گئے ہیں پہلا یہ کہ" وہ لوگ واقعی بندر ہو گئے تھے اور ان کی صورتیں مسخ ہو کر بندروں کے جسم میں تبدیل ہو گئی تھیں" اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ" مسخ معنوی ہوا تھا یعنی ان کے جسم اور صورتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی البتہ ان کے اوصاف و عادات بندروں جیسے ہو گئے تھے ۔" جمہور مفسرین نے پہلے قول کو ترجیح دیا ہے اور مولانا تھانوی کا بھی یہی خیال ہے لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے تفسیری حواشی میں دونوں اقوال نقل کئے تھے اس پر مولانا تھانوی نے اعتراض کیا اور لکھا کہ دوسرے قول کو تمام اہل حق نے غلط کہا ہے کیونکہ بنا اس کی انکارِ خوارق ہے پس یا تو اس قول کو حذف کیا جائے اور یا اس کا غیر مقبول ہونا ظاہر کیا جائے" مولانا دریابادی کو ان کی رائے سے اتفاق نہیں ہوا' لکھتے ہیں:

"یہ قول تو حضرت مجاہدؒ کا ہے اور ان کا شمار آپ ہی حضرات سے سُنا ہے کہ ممتاز مفسرین تابعین میں ہے اور اس قول کو ابن جریر طبری سے لے کر حافظ ابن کثیر بلکہ قاضی شوکانی تک اکثر ثقات نے نقل کیا ہے ... حضرت کے اس جواب کو اب پڑھتا ہوں تو حیرت ہی ہوتی ہے یہ قول ایسا ہی غیر مقبول و غیر معتمد تھا تو ان سب حضرات کو آخر اس کے نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر نقل بھی بلا ترد و تغلیط ۔" (حکیم الامت' ص ۳۹۱)

مولانا عبدالماجد بیان القرآن کے بعض اغلاط کی نشاندہی کرکے مولانا تھانوی کو مطلع کرتے' جن سے وہ یا تو اتفاق کر لیتے یا مزید تنقیح و توضیح فرما کر مولانا دریابادی کو مطمئن کر دیتے اور بعض دفعہ توضیح کے بعد بھی دریابادی صاحب مطمئن نہ ہوتے اس طرح کی ایک مثال ملاحظہ ہو :

ایک آیت میں بنی اسرائیل کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ جعلکم ملوکا' مولانا تھانوی نے اس کے ترجمہ و تشریح میں لکھا ہے کہ " تم کو صاحب ملک بنا دیا چنانچہ فرعون کے ملک پر ابھی قابض ہو چکے ہو" اس کے متعلق دریابادی صاحب کی ایرادات ملاحظہ ہوں" یورپ کا اعتراض ہے کہ قرآن نے موسیٰؑ کی زبان سے بنی اسرائیل کو بادشاہ (ملوکا) کہلا دیا حالانکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ بادشاہت انہیں اس وقت نہیں بہت بعد کو ملی تھی ۔ میری فہم ناقص میں اس کی تفسیر اگر آزاد و خود مختار ہو جانے سے کی جائے تو یہ اعتراض از خود ساقط ہو جاتا ہے مصر پر اسرائیلیوں کا فی الفور قبضہ تاریخ سے بالکل ثابت نہیں ہوتا بلکہ فرعونیوں کی غرقابی کے بعد انھوں نے اپنا سفر مشرق کی جانب بدستور جاری رکھا اور بجائے مصر کی طرف واپس ہونے کے وادی سینا ہی کی طرف بڑھتے گئے' طبری و کشاف میں ملک کے کئی معنی علاوہ اصطلاحی بادشاہی کے دیتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی فارغ البالی و آسودہ حالی کی بنا پر ان کو ملوکا کہا گیا ہے

اور یہ نعمت بیشک مصر سے نکلتے ہی ان کو حاصل ہو گئی تھی۔"

(ص ۲۱۶)

مولانا تھانوی نے اس پر اعتراض اور اپنے مفہوم و منشا کی توضیح کرتے ہوئے لکھا:

"یہ سب معانی مجازی ہی ہیں اور میں نے جو تفسیر اختیار کی ہے وہ حقیقت ہے اور بدون تعذر کے حقیقت کو نہیں چھوڑا جاتا اور یہاں کوئی تعذر نہیں، کیونکہ آیت میں یا تفسیر میں یہ کہیں نہیں کہ غرق فرعون کے بعد متصل ہی اس پر قابض ہو گئے تھے اس لیے تعارض تاریخی کا اشکال واقع نہیں ہوتا۔ اگر لفظ "ابھی" سے شبہ ہو تو "ابھی" زمانہ قریب کے لیے آتا ہے اور قرب و بعد کا مدار عرف پر ہے، شام پر جہاد کا حکم ہونے سے پہلے قبضہ ہو جانا باعتبار فتح شام کے قریب کہا جا سکتا ہے اور مصر پر قبضہ خود قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے:

فاراد ان یستفزھم من الارض فاغرقناہ ومن معہ جمیعا وقلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض۔

(بنی اسرائیل)

پس اس (فرعون) نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے مگر ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو،

دوسری جگہ ہے:

فاخرجناھم من جنات وعیون وکنوز ومقام کریم کذلک واورثناھا بنی اسرائیل۔ (شعراء)

سو ہم انھیں ان کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال لائے، یہی ہم مجرموں کے ساتھ کرتے ہیں اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان سب چیزوں کا وارث کر دیا۔

پس ترتیب واقعات کی بلا غبار یوں ہو سکتی ہے کہ غرق فرعون کے بعد فوراً مصر کو واپس نہیں ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے عطائے توریت وغیرہ کے بعد مصر پر قابض ہوئے پھر اللہ کو منظور ہوا کہ ان کا آبائی وطن ملک شام ان کو دیں اس وقت وہاں عمالقہ کی حکومت تھی الخ یہ آیتیں جن میں جعلکم ملوکا آیا ہے اس موقع کی ہیں جب وہ مامور بجہاد العمالقہ ہوئے اور اس سے پہلے مصر پر قابض ہو گئے پس میرا یہ کہنا تفسیر میں صحیح ہوا کہ ملک فرعون پر ابھی قابض ہو چکے ہو یعنی جس وقت اس جہاد کا حکم ہو رہا ہے اس سے قبل زمانہ قرب میں الخ پس اب کوئی اشکال نہیں رہا، یہ سب صحت تاریخ کی تسلیم کے بعد ہے ورنہ قصہ اور بھی سہل ہے واللہ اعلم۔"

مگر اس توضیح سے مولانا بالکل مطمئن نہ ہوئے فرماتے ہیں:

"اس ترتیب واقعات کا ساتھ تو تاریخ کسی حد تک بھی نہیں دے رہی ہے جہاد شام کا حکم تو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلتے ہی اور آزاد و خود مختار ہوتے ہی وادی سینا میں مل گیا تھا اور مصر پر قبضہ تو کئی صدیوں بعد جا کر حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوا ہے... [اورثناھا] میں ھا کی تفسیر یہ بھی تو ممکن ہے کہ جنات وعیون وکنوز مطلق صورت میں مراد لیے جائیں نہ کہ خاص فرعونیوں ہی کے جنات وعیون وکنوز، چنانچہ شام میں یہ سب چیزیں مل کر رہیں، پہلی تفسیر پر تاریخی حیثیت سے سخت اشکال وارد ہوتا ہے، بنی اسرائیل کی بادشاہت اور حکومت ملک فرعون پر صدیوں بعد تک تاریخ سے بدرجہ ضعیف بھی ثابت نہیں۔[1]"

مولانا تھانوی سے ان کے تفسیری اختلافات کے ضمن میں قدیم آئمہ تفسیر سے بھی بعض اختلافات کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

مولانا نے اپنے ترجمہ و تفسیر میں جن قرآنی تراجم و تفاسیر سے مدد لی ہے ان کی طویل فہرست اردو تفسیر کی جلد اول کے دیباچہ میں درج ہے، ان تفسیروں کی اہمیت و عظمت کے پوری طرح معترف ہونے کے باوجود وہ ان کے تمام مندرجات سے متفق نہیں تھے کیونکہ ان کا اس سلسلہ میں اصول یہ تھا۔

"استاد کی ضرورت جب چھوٹے سے چھوٹے علم اور سہل سے سہل فن میں پڑتی ہے تو قرآن کا علم تو سارے علوم کا بادشاہ اور سب سے بڑھ کر مہتم بالشان ہے کیسے ممکن ہے کہ قرآنیات کا کوئی طالب علم استاد سے

---

[1] حکیم الامت، ص ۴۱۷ تا ۴۲۰۔

اور اگلے ماہرین فن کے نتائج تحقیق سے بے نیاز رہ کر اس کی منزلیں طے کرے اور اگر کسی کو بدقسمتی سے... کوئی زندہ استاد اور کامل الفن میسر نہ آئے ... تو اس خلا کو اکابر مفسرین اور محققین شارحین کی کتابیں ایک بڑی حد تک پُر کر سکتی ہیں۔

ان حضرات کی تلاش و تفحص، تحقیق کی داد دل سے دیجیے، ان کی سپاس گزاری کے لیے قلب کی گہرائیوں کو وقف کر دیجیے ان کے کارنامے اگر رہنمائی کو نہ موجود ہوتے تو آج کس کی ہمت ہوتی کہ اس بارِ مہم و عظیم کو چھیڑ بھی سکتا۔ سڑک انہیں متقدمین کی سعی و مشقت سے بنی بنائی ہوئی مل گئی جس پر قدم رکھنا ہر متاخر کے لیے آسان ہو گیا ہے۔ لیکن اس انتہائی احترام و اعتراف کے بعد بھی یہ عقیدہ ذہن میں تازہ رکھیے کہ نبی معصوم کے بعد کوئی بھی معصوم امت میں نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے، اس لیے فکر و فہم اجتہاد کے لحاظ سے بڑے سے بڑا محقق بھی غیر معصوم ہی ہے، اس لیے پیروی کسی کے بھی قول کی ہر حال میں کیے جانا اور صریح دلیل مخالف کے باوجود بھی کرتے رہنا طریق حق و صواب نہیں ـــــ اللہ کے کلام کی شرح و تفسیر اگلوں اور پچھلوں کے کسی دور میں بھی آخری اور انقطاعی نہیں ہو سکتی، کون اس علیم کل کے کلام کے سارے گوشوں اور پہلوؤں کو اپنے ذہن کی گرفت میں لا سکتا ہے، کس کا علم علیم مطلق کی کتاب کے سارے اطراف کا احاطہ کر سکتا ہے، نئے نئے گوشے فکر و نظر کے ہمیشہ اُبھرتے آئیں گے اور نئے نئے میدان علم و تحقیق کو دعوت ہر دور میں دیتے رہیں گے نئے نئے سوال برابر پیدا ہوں گے اور نئے نئے جواب کتاب الہدیٰ کے صفحوں میں تلاش سے برابر ملتے رہیں گے۔"

(افتتاحیہ ج اول طبع ثانی ص ۱)

مفسرین بڑے بڑے اہل علم و فضل سہی اللہ کے علم سے سارے عالم کے عالموں، فاضلوں اور مفسروں کے علم کو ملا کر بھی کیا نسبت۔

(افتتاحیہ ج ۲، ص ۶)

اس تمہید کے بعد مولانا کے اکابر مفسرین سے اختلافات کی دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

قرآن مجید نے ایک جگہ چیلنج کیا ہے کہ اگر تم کو قرآن کے بارہ میں کوئی شک ہو تو پھر اس جیسی کوئی ایک ہی سورہ لا دو، عام مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن مجید چونکہ بہت فصیح و بلیغ اور ادب و انشا کے اعتبار سے بے نظیر کلام ہے اسی اعتبار سے اس نے یہ تحدی بھی کی ہے مولانا کے نزدیک یہ مفہوم غلط نہیں ہے لیکن وہ اس میں تحدید کو صحیح نہیں سمجھتے لکھتے ہیں:

"قرآن مجید اپنی زبان کی فصاحت اور حسن انشا کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر ہے جیسا کہ بڑے بڑے ماہرین ادب تسلیم کر چکے ہیں لیکن یہاں جو تحدی کی جا رہی ہے اس کا مخاطب یایھا الناس کے ماتحت سارے انسان ہیں، صرف قریش یا اہل عرب نہیں اس لیے قرآن مجید کی بے نظیری کو یہاں صرف انشا و فصاحت تک محدود رکھنا اس کے عام و عالمگیر چیلنج کو محدود کر دینا ہے، قرآن نے اپنی حقیقت خود بیان کر دی ہے وہ ھدی للمتقین کتاب ہدیٰ ہے یعنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام نامہ یا مکمل، ہمہ گیر دہر جہتی دستور العمل، اس کے علاوہ اس کی اور جتنی حیثیتیں ہیں تبعی و ضمنی ہیں وہ یہاں پیش اپنے اسی سب سے بڑے وصف کو کر رہا ہے اور پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہدایتیں اور بصیرتیں میری ایک ایک سورہ کے اندر موجود ہیں اب اگر تم اپنی متحدہ کوشش اور جد و جہد سے بھی اس کے مقابلہ کی کوئی چیز پیش کر سکتے ہو تو لا دکھاؤ۔"

(تفسیر ماجدی، ج ۱، ص ۴۹)

قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیرا کرو" اسی ضمن میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

آیت نے مترجمین و شارحین کو حیرت میں ڈال دیا ہے، کسی نے ترجمہ لیس البر کا "نیکی یہی نہیں ہے" کیا ہے اور کسی نے "نیکی کامل یہ نہیں ہے" گویا مشرق رخی یا مغرب رخی کا نیکی یا عمل خیر ہونا سب ترجموں میں مشترک ہے حالانکہ قرآن مجید سرے سے اس کی نفی کر رہا ہے مفسرین رحمہم اللہ بیچارے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ دنیا ئے شرک میں شرک جلی کی ایک قسم سمت پرستی بھی ہے کلام مبین ضرب اسی عقیدہ پر لگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ سمت پرستی میں کیا رکھا

ہے جو تم کسی متعین سمت کو مقدس فرض کئے ہوئے ہو بلکہ طاعت کے اصناف و اقسام تو یہ ہیں کہ:

"کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب الٰہی پر اور پیغمبروں پر اور مال خرچ کرتا ہے اس کی محبت کے باوجود اپنے قرابت داروں اور یتیموں پر اور مسکینوں پر اور مسافروں پر اور سائلوں پر اور قیدیوں اور غلاموں کی گردنیں چھڑانے پر اور نماز کی پابندی کرتے اور زکوٰۃ کی ادائی کرنے پر اور عہدوں کے پورا کرنے پر جبکہ معاہدہ کر چکے ہوں اور تنگی اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے۔"

"یعنی طاعت کی صورتیں نکلیں یا تو اعتقادی و ایمانی یا پھر عملی (جسمانی و مالی) نہ کہ محض مشرق رخی یا مغرب رخی تقدس کسی سمت میں کچھ بھی نہیں، طاعت تو ایک مخصوص مکان یا مرکز یا قبلہ کی طرف منھ کر کے عبادت کرنا ہے خواہ وہ نمازی کے جس سمت میں بھی پڑ رہا ہو، اس ایک علم یعنی شرک سمت پرستی نے حکم قرآنی کی معنویت کیسی واضح اور جلی کر دی۔"

یہ تو مستند اور مقبول تفسیروں سے مولانا کے اختلاف کا ذکر تھا، ان کے نزدیک احترام و عقیدت کی طرح اختلاف و نفرت کے بھی حدود و اصول تھے اس لیے جن تفسیروں کو مطرود قرار دیا جاتا ہے مولانا ان کو بھی یکسر نظر انداز کر دینے یا ان کی تمام باتوں سے اختلاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ ان کی اعتدال و حقیقت پسندی اس نوع کی تفسیروں کی مفید بحثوں کو قبول کرنے اور اچھی چیزوں کو سراہنے میں کسی بخل یا تنگ نظری سے کام نہیں لیتی۔ مثلاً علامہ زمخشری کو متاخرین اہل تفسیر نے ان کے اعتزال کی وجہ سے قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے حالانکہ وہ معتزلی ہونے کے باوجود متقدمین میں مقبول تھے، مولانا بھی ان کے مداح تھے خصوصاً ان کے نکات ادبی، نحوی و لغوی کے بہت معترف تھے۔

مولانا کے دور کے لوگوں میں مولانا احمد علی لاہوری نے اپنے انداز میں دین و مذہب کی بڑی خدمت کی ہے لیکن عام علماء نے کچھ نامناسب باتوں کی وجہ سے ان کی ساری دینی و قرآنی خدمات پر پانی پھیر دیا ہے، خود مولانا تھانوی بھی ان کے ترجمہ و تفسیر کے نکتہ چین تھے اور اس کے مطالعہ سے پرہیز کا مشورہ دیتے تھے لیکن مولانا عبد الماجد کے نزدیک بعض خرابیوں کی وجہ سے اس کی خوبیوں کو نظر انداز کر دینا تحقیق و انصاف کے خلاف ہے، ان کے قلم نے جہاں اس کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے وہیں اس کی خوبیوں کا بھی دیانتداری کے ساتھ اعتراف کیا ہے، لکھتے ہیں:

"غالباً اگست ۱۹۲۰ء تھا کہ ایک عزیز کے پاس مولوی احمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۃ القرآن پڑھنے میں آیا اور طبیعت نے اس سے بھی بہت گہرا اور اچھا اثر قبول کیا، مغربی راہ سے آئے ہوئے بیسیوں شبہات و اعتراضات اس ترجمہ و تفسیر سے دور ہو گئے اور یہ رائے اب تک قائم ہے اس بیس سال کے عرصہ میں خامیاں اور غلطیاں بہت سی (بلکہ بعض جگہ تو ایسی عبارتیں جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں) اس ترجمہ و تفسیر کی علم میں آچکی ہیں، لیکن انگریزی خوانوں اور مغرب زدوں کے حق میں اس کے مفید ہونے میں اب بھی ذرا کلام نہیں، ہدایت کا واسطہ جب اللہ کی حکمت صریح غیر مسلموں کے کلام کو بنا دیتی ہے تو یہ تو بہرحال اللہ کے کلام کا ترجمہ و حاشیہ ہے، مترجم کی بعض اعتقادی غلطیوں کی بنا پر ان کی ساری کوشش سے بدظن ہو جانا قرین انصاف و مقتضائے تحقیق نہیں۔[۱]"

اصل مقصد مولانا تھانوی سے مولانا دریابادی کے اختلاف کو ذکر کرنا ہے کیونکہ مولانا کی عقیدت حد سے بڑھی ہوئی ان ہی سے تھی دوسرے مفسرین کا ذکر ضمناً آ گیا تھا اب پھر مولانا تھانوی سے اختلاف کا ذکر ہوگا لیکن تفسیر کے بجائے فقہی و اجتہادی مسائل میں۔

اسلام نے دو بیویاں رکھنے والوں کو ان کے درمیان عدل و مساوات کا حکم دیا ہے، مولانا عبد الماجد دریابادی کے خیال میں شرط عدل کو سمجھنے میں بعض فقہا کو تسامح ہوا ہے ان کے نزدیک عدل کے معنی اس سیاق میں یکسانیت یا مساوات مطلق کے نہیں بلکہ ہر ایک

[۱] دیباچۂ تفسیر ماجدی ج ۱، ص ۵ [۲] محسن کتابیں، ص ۲۰۔

کے ساتھ اس کے مناسب حال برتاؤ کرنے کے ہیں ایک بیوی سن رسیدہ ہے، دوسری بالکل نو عمر ایک بیوی کشمیر کی ہے جو ہندوستان کی گرمی نہیں برداشت کر سکتی، دوسری بیوی افریقہ کی ہے جس سے ہندوستان کی سردی نہیں برداشت ہوتی ایک ٹھیٹھ دیہاتن ہے، دوسری خالص شہری، اس قسم کی تمام صورتوں میں ظاہر اور بالکل ظاہر ہے کہ ایک بیوی کی ضرورتیں اور دلچسپیاں دوسری سے بالکل الگ ہوں گی اور دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جانا مثال عدل کی نہیں ظلم کی پیش کرے گا، ایسی حالت میں عدل یہی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اس کے حال و مذاق کی رعایت سے برتاؤ کیا جائے اور نفقہ بھی ایک حد تک اسی کلیہ کے تحت میں آجاتا ہے، بحرالرائق شرح کنز اور ردالمختار شرح درالمختار میں بھی تصریح ہے کہ نفقہ کے بارہ میں دونوں بیویوں کی حالت پر نظر کی جائے گی اور مطلق مساوات ضروری نہ ہوگی ۔ مولانا تھانوی اس رائے سے متفق نہ تھے لیکن انھوں نے اس مسئلہ پر فقیہانہ موشگافیاں کی تھیں ان سے مولانا دریابادی مطمئن نہیں ہوئے ۔

مولانا تھانوی نے حسن العزیز (جلد دوم) ص ۲۳۹ میں لکھا ہے:

" ایک شخص اصحاب فقہ سے تھے، انھوں نے اپنا امام اصحاب حدیث میں کسی کے بیاں دیا، انھوں نے قید لگائی کہ تم کو رفع یدین وغیرہ کرنا ہوگا، انھوں نے منظور کر لیا، ایک بزرگ نے فرمایا کہ اس شخص کے بارے میں مجھے اندیشہ ہے کہ موت کے وقت اس کا ایمان نہ سلب ہو جائے، محض مردار دنیا کے لیے ایسی چیز کو بلا تحقیق ترک کر دیا جس کو دین سمجھتا تھا "

مولانا دریابادی نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا:

" سوال یہ ہے کہ رفع یدین اس شخص کے نزدیک معصیت تو نہ تھا بس غیر افضل تھا تو اگر ایک مقصد مباح کے لیے اس نے ایک سنت کے بجائے دوسری سنت پر عمل شروع کر دیا تو اس میں سلب ایمان کے اندیشہ کی کون سی بات پیدا ہو گئی "

مولانا تھانوی نے اس کی مزید توضیح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" یہ قصہ ردالمختار شرح درالمختار میں مذکور ہے اور یہ بزرگ ابو بکر جوزجانی ہیں جن کے قول کو خلاف تحقیق کہنے میں مبادرت نہیں ہو سکتی اور وہ تحقیق انما الاعمال بالنیات سے ظاہر ہے کیونکہ بنا اس ترک سنت کی دوسری سنت کا من حیث السنت اختیار کرنا نہ تھا بلکہ محض جیفۂ دنیا کا دین پر ترجیح دینا تھا جس کی حقیقت استخفاف دین اور استقطام دنیا ہے اس کا دہی اثر ظاہر ہے جو ان بزرگ نے فرمایا ورنہ سوال کے سب مقدمات ناز مقصد ریا میں بدرجہ اولیٰ جاری ہیں، کیا ریا بھی مباح ہو جائے گی "

لیکن اس کے بعد بھی مولانا دریابادی کو کامل انشراح نہ ہوا۔

فقہ کی طرح کلامی مسائل میں بھی مولانا عبدالماجد دریابادی کو مولانا اشرف علی تھانوی کے بعض آرا و خیالات سے اتفاق نہ تھا مثلاً توریت و انجیل وغیرہ کا نفس منزل من اللہ ہونا تو ظاہر ہے لیکن مولانا دریابادی مسلمانوں کے اس عام عقیدہ کو درست نہیں سمجھتے تھے کہ یہ سب کتابیں بھی قرآن مجید ہی کی طرح کلام الٰہی ہیں یا اسی کی طرح ان کا لفظ بہ لفظ منزل من اللہ ہونا مسلم ہے اس طرح ان کے خیال میں گویا توریت و انجیل کا نزول صرف اجمالی حیثیت سے ہوا یعنی بہ لحاظ معانی و مطالب، بجز توریت کے ان احکام کے جن کے بصورت الواح نازل ہونے کی صراحت قرآن مجید میں آچکی ہے ۔

مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ اس باب میں کوئی نص وارد نہیں پس اثبات و نفی میں سے کسی کا بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ممکن ہے کہ الفاظ نازل ہوئے ہوں اور ممکن ہے کہ معانی نازل ہوئے ہوں اور الفاظ موسیٰ و عیسیٰ کے ہوں اگر وہ محفوظ نہ رہے ہوں تو اس باب میں ان کا درجہ حدیث کا سا ہوگا، علاوہ ازیں الواح کے تورات نہ ہونے کی کوئی تصریح نہیں بلکہ بظاہر الواح میں تورات ہی تھی اس بنا پر تورات کی تو لفظی تنزیل ایک درجہ میں ثابت ہو جائے گی "

مولانا دریابادی اس توجیہ سے متفق نہ ہو سکے اور اپنے خیالات

---

[1] حکیم الامت، ص ۱۳۱ و ۱۳۴ ۔

مدلل طور پر بار بار مولانا کی خدمت میں تحریر فرما کر بھیجے اور عقیدۂ عام پر شبہات وارد کرتے رہے۔

ایک دفعہ مولانا کے ہفتہ وار اخبار "سچ" میں حیدر آباد کے ایک صاحب علم صوفی اور خانقاہ جیلانیہ کے شیخ مولوی محمد شاہ قادری کا ایک طویل مضمون کئی قسطوں میں شائع ہوا اس میں ظہور مسیح دجال اور خروج یاجوج و ماجوج سے متعلق حدیثوں کی ایک نئے انداز پر تفسیر کی گئی تھی، اس کا ماحصل یہ تھا کہ پیشگوئی ہمیشہ تمثیل و مجاز کے پردہ میں ہوتی ہے چنانچہ حدیث نبوی میں دجال اور یاجوج و ماجوج سے مراد اقوام فرنگ ہیں۔

عام علما کو اس تعبیر پر شدید اعتراض تھا مولانا اشرف علی نے بھی اس کا پُرزور رد لکھا جس سے مولانا دریابادی کو اتفاق نہ تھا، انھوں نے مولانا کے تردیدی مضمون کو "سچ" میں اپنے اس اختلافی نوٹ کے ساتھ شائع کیا:

"جس طرح حقیقی دجال کا اطلاق آخر زمانہ کے کسی ایک متعین شخص پر ہوگا اسی طرح مجازی وصفاتی دجال خدا معلوم کس کثرت سے پیدا ہو چکیں گے افراد بھی اور اقوام بھی ... سچ یا مدیر سچ کو دجال کے ظہور ذاتی اور ظہور صفاتی میں کوئی تناقض نہیں نظر آتا بلکہ اس کی فہم ناقص میں یہ دونوں عقیدے ایک دوسرے کے ضد اور ایک دوسرے کے مکمل و متمم ہیں اور سچے رسول کی پیش گوئیوں کی پوری عظمت بھی درحقیقت یوں ہی ظاہر ہوتی ہے کہ مجازی اور حقیقی، لفظی اور معنوی، ذاتی اور صفاتی ہر رنگ سے پوری ہو کر رہیں۔ اگر آج ان صفات میں موجودہ فرنگی تمدن کو شیطانی تمدن سے یا موجودہ فرنگی حکومتوں کو فرعونی حکومتوں سے تعبیر کیا گیا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ابلیس کے کسی شخصی وجود یا حضرت موسیٰ کے زمانہ کے فرعون کی تاریخی شخصیت سے انکار ہے ٹھیک اسی طرح موجودہ تمدن یا فرنگی قوموں کو دجال قرار دینا اس کا مستلزم نہیں کہ آئندہ کسی شخصی دجال کے ظہور سے انکار ہے آج صفاتی حیثیت سے بے شمار دجال اور بے شمار مہدی موجود ہیں، آئندہ کیا عجب ہے کہ کسی شخصیت کے اندر دجال کامل اور کسی ایک شخصیت کے اندر مہدی کامل کا ظہور ہو جائے غرض سچ تو اپنے نزدیک علمائے اہل سنت کے عام و مسلم عقیدہ اور مولوی محمد شاہ صاحب کے عقیدہ کے درمیان مطلقاً کوئی تناقض اور تعارض نہیں پاتا، فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں فریق ایک ایک پہلو پر زیادہ زور دے رہے ہیں[1]۔"

بھلا مولانا تھانوی اس سے کیا متفق ہوتے ان سے دریابادی صاحب کی عرصہ تک مراسلت رہی لیکن مولانا دریابادی اپنے موقف پر قائم رہے۔

اسی ضمن میں کلمہ گو فرقوں اور افراد کی تکفیر کا مسئلہ بھی ہے، یہ جس قدر اہم اور نازک ہے اسی قدر لوگ اس میں غیر محتاط ہوتے ہیں، علمائے دیوبند کا ایک گروہ بھی اس باب میں ذرا متشدد رہے جہاں کسی نے اس کے خیال و مسلک سے انحراف کیا اور اس کے اکابر کے معمول و معتاد کے خلاف کوئی بات کی یا کہی اس کی تکفیر بے دھڑک کر دی گئی مگر مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے اعتدال و توازن کی بنا پر اس مسئلہ میں بہت محتاط تھے، تکفیر کے معاملہ میں ان کا اصول و طریقہ سب سے مختلف تھا اور وہ اپنی جرأتمندی اور صاف گوئی کی وجہ سے سب کے علی الرغم اپنے نقطۂ نظر کا برملا اظہار بھی کرتے رہتے تھے، اس باب میں وہ اپنی عقیدت و عظمت والے بزرگ مولانا تھانوی کی بھی کوئی رعایت نہ کرتے تھے بلکہ اس پر باقاعدہ زبانی و تحریری ان سے بحثیں کرتے اور کسی طرح اپنی رائے میں ترمیم کے لیے آمادہ نہ ہوتے تھے۔ وہ خود لکھتے تھے:

"کلمہ گو فرقوں کی تکفیر کے باب میں (ان کی ساری گمراہیوں اور زیادتیوں کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی) مجھے شرح صدر کبھی نہیں ہوا اور اب تک بھی نہیں ہے چنانچہ اس بارہ میں اس عاصی کا مسلک اپنے اکابر سے بڑی حد تک اب بھی الگ ہے۔"

(حکیم الامت، ص ۲۵۹)

"... حضرت حاجی امداد اللہ کا جو مکتوب سرسید احمد خاں کے نام تھا ... میری فہم ناقص میں اسی کو معیار رکھنا چاہیے اور اسی

---

[1] حکیم الامت، ص ۱۱۰ ـ

کے مطابق برتاؤ تمام گمراہ فرقوں سے رکھا جائے یعنی نہ مداہنت اور نہ ایسی مخالفت کہ ان میں اور آریوں، عیسائیوں میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے۔" (حکیم الامت، ص ۲۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"بے احتیاط مصنفین بارہا اپنے قلم کی رو میں بالکل بے خیالی سے ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں جو بجائے خود نہایت گستاخانہ بلکہ ملحدانہ ہوتے ہیں لیکن ان بیچاروں کی کبھی بھی یہ نیت نہیں ہوتی بلکہ اکثر تو اس کے برعکس عین خدمت اسلام و نصرت دین ہی کی ہوتی ہے ویسے اشخاص کے ساتھ میری فہم ناقص میں معاملہ ہمیشہ نرمی و آشتی کا رکھنا چاہیے یعنی صرف یہ تنبیہ کافی ہو جانا چاہیے کہ ایسے الفاظ سے خوف کفر کا ہے نہ یہ کہ انھیں واقعتہً کافر بنا کر دشمنانِ دین و معاندین اسلام کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔" (حکیم الامت، ص ۲۰۴)

اسی موضوع سے متعلق مولانا تھانوی کی ایک تحریر کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"حضرت کی بہت زیادہ تحریروں سے اظہار اطمینان ہو جایا ہی کرتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس ارشاد سے پوری تشفی اب تک بھی نہیں ہوئی ہے ——— اور نہ جج کو ہر مجرم کے علی الاطلاق بری کر دینے کی تمثیل سمجھ میں آئی جج کو مشورہ تو صرف یہ دیا گیا تھا کہ مجرم کو سزا محض صورت جرم پر نہ دیدی جایا کرے بلکہ پہلے حقیقت جرم کی بھی خوب تحقیق کر لی جائے کہ بہت سے جرم صورۃً ہوتے ہیں اور ان کے مرتکب کی تو بعید نیت بھی قانون شکنی و نافرمانی کی نہیں ہوتی۔" (حکیم الامت، ص ۴۸۵)

اہل سنت والجماعت کے علاوہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کا کیا ذکر وہ تو ان علماء کے نزدیک بلاشک و ریب کافر ہیں ہی، جبکہ مولانا دریابادی ان سب کو کبھی مسلمان کہتے اور سمجھتے رہے، حیرت تو اس پر ہے کہ خود اہل سنت کے بعض اکابر اور جماعتوں کو بھی یہ حضرات کافر اور بے دین کہنے میں کوئی تامل نہیں فرماتے چنانچہ ۱۹۳۶ء میں مولانا تھانوی کے کچھ غالی معتقدین و مریدین نے مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی بعض تحریروں کو توڑ مروڑ کر ان کے خلاف تکفیر کی مہم چلائی جس میں مولانا حسین احمد مدنی کے سوا اکثر نامور علمائے دیوبند بھی شریک تھے اور فتوائے تکفیر پر خود مولانا تھانوی نے بھی بلا تحقیق و تفتیش دستخط کر دیا تھا۔ مولانا عبدالماجد کے لیے یہ واقعہ نہایت تکلیف دہ اور حیرت ناک تھا وہ گو مولانا تھانوی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے لیکن ان دونوں بزرگوں سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا اور ان کو اپنا محسن اور عملاً استاد سمجھتے تھے اپنی متعدد تحریروں میں لکھا ہے کہ ان کو قلم چلانا اور رکھنا لکھانا مولانا شبلی ہی کے فیض سے آیا۔ اسلام اور داعی اسلام سے ان کی نفرت کا ازالہ شبلی ہی کی سیرۃ النبی سے ہوا، دینی حمیت و غیرت میں کسی بزرگ سے ان کو کمتر نہ سمجھتے تھے اور ایک زمانہ میں ان کو پیر و مرشد اور مجدد بھی مانتے تھے اسی طرح مولانا فراہیؒ کی قرآن فہمی اور علمی بلند پایگی کے بڑے معترف تھے اور ان کو دینداری، خشیت الٰہی اور زہد و اتقا میں بے نظیر سمجھتے تھے، جب مولانا عبدالماجد کو ایک عام کلمہ گو کی تکفیر میں بھی تردد ہوتا تھا تو بھلا ان بزرگوں کو کیسے کافر باور کر سکتے تھے، مولانا تھانوی سے گوناگوں عقیدت کے باوجود ان سے اس معاملہ میں سخت اختلاف اور بڑی رد و کد کی، بالآخر ان کی کوششوں کی بدولت مولانا تھانوی نے کفر کے فتوے سے رجوع کر لیا، مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں:

"دنیا بھی ایک عجیب و غریب جگہ ہے، عجیب سے عجیب واقعات جن کا سمجھ میں آنا مشکل ہوتا ہے، مولانا حمید الدینؒ خود ایک متقشف عالم تھے کوئی خیال بھی کر سکتا تھا کہ نوبت ان کی تکفیر کی آئے گی ... میرے یہ دونوں بزرگ (شبلی و فراہی) بڑے محسن اور عملاً استاد تھے ان کی جائز حمایت و نصرت میں (جو اس وقت عین حق و انصاف کی حمایت تھی) جو کچھ بھی عاجزانہ کوششیں بن پڑیں، کی گئیں اور شکر ہے کہ حضرت کے ہاں حضرت ہی کی انصاف پسندی اور اعتدال دوستی کی بنا پر بڑی حد تک کامیاب و مقبول ہی ہوگئیں۔"

(حکیم الامت، ۴۸۰ تا ۴۸۱)

دونوں کے اختلاف کی مثالیں بے شمار ہیں ان کو کہاں تک نقل کیا جائے مولانا دریابادی مولانا تھانوی سے علمی، فقہی، کلامی اور سیاسی

مسائل میں ہی اختلاف نہ رکھتے تھے بلکہ ان کی ذاتی کمزوریوں اور زندگی کی عام خامیوں کی جانب بھی بے تکلف ان کو متوجہ کر دیتے تھے مگر اس کے باوجود ان کی محبت، تعلق اور عقیدت میں فرق نہ آتا در اصل وہ اختلاف رائے اور اظہار حق کو عقیدت و تعلق کے لیے مانع خیال ہی نہیں کرتے تھے۔

مولانا حسین احمد مدنی

مولانا دریابادی کے نزدیک دوسری اہم اور قابل احترام و عقیدت شخصیت مولانا حسین احمد مدنی کی تھی گو ان کی عقیدت مولانا تھانوی سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ تاہم ان کا اصل اور باضابطہ بیعت کا تعلق مولانا مدنی ہی سے تھا، مولانا حسین احمد مدنی ملک و قوم کے بے لوث خادم اور نہایت دیندار بزرگ تھے ان کی پاکیزہ زندگی، مقدس سیرت اور خدمت و خلوص کا کچھ حال مولانا عبدالماجد دریابادی ہی کے قلم سے سننے کے لائق ہے، لکھتے ہیں:

"یہاں (دیوبند) کی حاضری کا یہ بالکل پہلا موقع تھا اسٹیشن پہ دیکھا تو مولانا خود استقبال کے لیے موجود، مولانا کی بزرگی کے قائل خوش عقیدہ حضرات جس بنا پر بھی ہوں اپنی نظر میں تو ان کی بڑی کرامت ان کا ایثار، انکسار، تواضع، بے نفسی ہی ہے علم و فضل، فقر و درویشی کی بحثوں کو چھوڑیے لیکن جہاں تک ع

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا خاکساری اپنی کام آئی بہت

کا تعلق ہے مولانا... اس دیکھنے والے کی نظر میں اپنی نظیر بس آپ ہی ہیں اور محمد علی جوہر نے یہ شعر کہا تو اپنے شیخ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے حق میں ہے لیکن صادق مولانا دیوبندی پر بھی لفظ بہ لفظ آ رہا ہے ع

ان کا کرم ہی ان کی کرامت ہے ورنہ یاں
کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی

دوسروں کو شاید کام لینے میں وہ لطف نہ آتا جو ان مولانا کو دوسروں کا کام کر دینے میں آتا ہے، گھر پر آ کر ٹھہرئیے تو آپ کے لیے کھانا اپنے ہاتھ سے جا کر لائیں، آپ کے لیے بستر بچھا دیں، سفر میں ساتھ ہو جائے تو دوڑ کر آپ کے لیے ٹکٹ لے آئیں، قبل اس کے کہ آپ ٹکٹ گھر کے قریب بھی پہنچ سکیں، تانگے کا کرایہ آپ کی طرف سے ادا کر دیں اور آپ کا ہاتھ اپنی جیب میں پیسہ ٹٹولتا ہی رہ جائے، ریل پر آپ کو بستر کھول کر بچھائیں، آپ لوٹے میں پانی لے آئیں، آپ کا سامان اپنے ہاتھ سے اٹھانے لگیں، تین دن کے قیام دیوبند میں وہ باتیں مشاہدہ بن کر رہیں اور شنیدہ دیدہ میں تبدیل ہو کر، تکلفات اور خاطریں اور مہمانداریاں کھانے پر کھانا اور چائے پر چائے۔" (حکیم الامت، ص ۱۲)

"تانگہ خانقاہ امدادیہ کے دروازہ پر رکا اور کرایہ مولانا حسین احمد صاحب نے دیا، سہارنپور اسٹیشن پر کھانا بھی تو ان ہی نے مسلم ہوٹل میں لے جا کر کھلایا تھا اور دیوبند اسٹیشن پر ٹکٹ بھی تو وہی جھپٹ کر لے آئے تھے اور ہم دونوں (مولانا دریابادی و مولانا عبدالباری ندوی) سن میں ان سے کہیں چھوٹے منہ دیکھتے ہی رہ گئے تھے، جس سفر میں وہ ساتھ ہوں چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی خدمت گزاری میں کون ان سے پیش پا سکتا ہے۔"

(حکیم الامت، ص ۱۴)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"مخدوم خود خادم بنا ہوا تھا اور جس کا منصب آمر ہونے کا تھا وہ فخر و مسرت اپنی ماموریت میں محسوس کر رہا تھا، دیوبند جائیے تو مولانا اسٹیشن پر پیشوائی کو موجود، چلنے لگئے تو اسٹیشن تک مشایعت پر آمادہ، کھانا کھانے بیٹھیے تو وہ لوٹا لیے ہاتھ دھلانے کو کھڑے ہوئے، پانی مانگئے تو گلاس لیے خود حاضر، تانگہ کا کرایہ وہ اپنے پاس سے دیدیں، ریل کا ٹکٹ وہ دوڑ کر لے آئیں، ہوٹل میں کھانا کھائیے تو بل وہ خود ادا کر دیں، سفر میں ساتھ ہو تو بستر وہ کھول کر بچھائیں غرض یہ کہ مالی اور بدنی چھوٹی بڑی خدمت کی جتنی صورتیں ہو سکتی تھیں سب میں مرید تو مراد کے درجہ پر پہنچ گیا اور جو صاحب امر و ارشاد تھا وہ چاکری اور حکم برداری میں لگا ہوا" (حکیم الامت، ص ۲۶)

"لیکن جہاں تک تواضع، ضبط نفس، ایثار و انکسار اور جذبۂ خدمت کا تعلق ہے مولانا حسین احمد صاحب کی ذات اپنی جگہ بے نظیر ہے ہاں خود ان کے استاد شیخ الہند کی نظیر ہو تو ہو یا پھر ان ہی کے بڑے

بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی مہاجر مدنی تھے۔"
(حکیم الامت، ص ۹۱)

لیکن مولانا کی عدیم المثال شخصیت، ان کی بے نظیر خوبیوں اور ان سے بیعت و ارشاد کے تعلق کے باوجود مولانا عبدالماجد ان کے ہر قول و عمل کو اپنے لیے قابل قبول اور لائق حجت نہیں خیال کرتے تھے، سیاست میں دونوں کی راہیں الگ الگ تھیں اور رفقہ و کلام میں بھی اختلافات کم نہ تھے۔ فرماتے ہیں:

"مولانا سے دیوبندی کے سیاسی خیالات جو کچھ بھی ہوں اور اجتہادی غلطیاں تو صحابہ کرام تک سے ہوئیں اور بار بار ہوئیں بلکہ مذہب اہل سنت کا دارومدار ہی کہنا چاہیے کہ غیر نبی کے غیر معصوم ہونے کے عقیدہ پر ہے۔" (حکیم الامت، ص ۹۰ - ۹۱)

لوگوں کو زیادہ عقیدت اپنے شیخ و مرشد سے ہوتی ہے لیکن مولانا کا حال اس سے مختلف تھا فرماتے ہیں:

"اپنے کو جن بزرگ سے بیعت کا تعلق ضابطہ سے تھا ان سے عقیدت اگرچہ اپنی جگہ پر قائم تھی اور باوجود بار بار سخت دھکے پہنچنے کے بھی بڑی حد تک قائم تھی، ذہن ہر مرتبہ ان کے لیے کوئی نہ کوئی تاویل کر سکتا تھا تاہم حضرت تھانوی کی بھی عظمت و عقیدت دل میں کچھ کم نہ تھی بلکہ بعض حیثیتوں سے تو کچھ بڑھی ہی تھی اور بعض خاص موقعوں پر تو اور زیادہ بڑھ جاتی تھی۔" (حکیم الامت، ص ۱۹۱)

مولانا حسین احمد سے ان کے ہر نوعیت کے اختلافات تھے، ابھی گزر چکا ہے کہ کلمہ گو افراد اور فرقوں کے معاملہ میں مولانا عبدالماجد جس قدر محتاط تھے دوسرے علما اور علمائے دیوبند کا ایک گروہ اتنا محتاط نہ تھا، مولانا مدنی بھی اپنے اکابر کی طرح بعض اسلامی فرقوں کی تکفیر کے شد و مد سے قائل تھے مولانا عبدالماجد کو اس بارہ میں ان سے شدید اختلاف تھا، یہاں طوالت کے خوف سے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے جو خود اہل سنت ہی کے ایک گروہ کی تکفیر کے متعلق ہے۔

جماعت اسلامی مسلمانوں کی ایک منظم اور فعال جماعت ہے اس کے اصل بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد یہ جماعت بھی دو حصوں میں منقسم ہو گئی، مولانا مودودی پاکستان منتقل ہو گئے، ہندستان کی جماعت اسلامی کی قیادت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کے حصہ میں آئی اور وہ عرصہ تک اس کے امیر رہے۔ علمائے دیوبند کے ایک بڑے طبقہ کو اس جماعت سے سخت اختلاف تھا، انھوں نے اس کے رَد میں متعدد کتابیں اور رسالے لکھے، مولانا حسین احمد بھی رَدِ مودودیت میں بہت متشدد تھے ایک دفعہ (مارچ ۱۹۵۴ء میں) اعظم گڈھ کے قصبہ سرائے میر کے ایک دیوبندی الفکر مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں انھوں نے اور ان کے عقیدت مند کچھ علما نے جماعت اسلامی کے دستور کی حسب ذیل عبارت پر سخت اعتراضات کیے:

"رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔"

مولانا مدنی اور ان کے معتقدین علما کا خیال تھا کہ اس کی زد سے انبیائے سابقین کا انکار، صحابہ کرام کی تنقیص، بزرگان دین کی تذلیل اور سلف صالحین کی توہین لازم آتی ہے اس لیے جس جماعت کا یہ عقیدہ ہو وہ جماعت بے دینوں کی جماعت ہے اور اسلام و ایمان سے اس کو کوئی واسطہ اور تعلق نہیں ہے اس جماعت سے ہر قسم کا اشتراک و تعاون ناجائز ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی خود جماعت اسلامی کے نکتہ چیں تھے، صدق میں مولانا مودودی کے خیالات پر برابر نقد و تعقب بھی کیا جاتا تھا اور جماعت اسلامی کے بعض اہل قلم سے مولانا کے قلمی معرکے بھی ہوتے رہتے تھے تاہم اس کے دستور کی مذکورہ بالا عبارت میں جس عقیدہ و خیال کا اظہار کیا گیا ہے اس میں ان کے نزدیک کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی، ان کی تحریروں کے جو اقتباسات اوپر نقل کیے گئے ہیں ان سے بھی جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کی مکمل تائید ہوتی ہے، اب جو ان کے شیخ نے اس شد و مد سے جماعت کی مخالفت کی تو مولانا نے پھر اپنے موقف کا اعادہ کیا اور اپنے شیخ طریقت اور مرشد کی رائے کی مطلقاً کوئی پروا نہ کی چنانچہ اس عبارت کے متعلق ایک استفسار کے جواب میں فرمایا:

"آپ نے بنیادی عقیدہ کی جو عبارت نقل کی، وہ تو عین حق و صواب ہے اور ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا ہی چاہیے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کے ساتھ بعض توضیحی فقرے بڑھا دیئے جائیں، رسول خدا کو معیار حق بنانے کے معنی یہ ہیں کہ سارے انبیا کی تصدیق اس میں آگئی بقول عارف رومی ؎

نام احمد نام جملہ انبیاست
چونکہ صد آمد نود ہم پیش ماست

معترض کو شاید "تنقید" اور "توہین و تنقیص" کے درمیان فرق نہیں معلوم، محدثین نے کس غضب کی تنقید رواۃ پر کی ہے کیا وہ توہین و تنقیص کے مرتکب ہوئے ہیں بالفرض کسی بزرگ کی کی توہین ہو بھی جائے تو یہ دائرہ اسلام سے خارج کیسے کر دے گی، اس درجہ کی چیز تو صرف اہانت رسول ہے۔

علیٰ ہٰذا معترض کو "پیروی" اور "ذہنی غلامی" کے درمیان بھی فرق نہیں معلوم، پیروی تو اپنے استاد کی، باپ کی، ہر صالح و بزرگ کی کی جا سکتی ہے "ذہنی غلامی" یعنی بے چون و چرا اتقیاد کلی حق صرف رسول معصوم کا ہے۔" (جماعت اسلامی کے بنیادی عقیدہ کے متعلق اکابر علما کی رائیں اور فتوے، ص ۵)۔

شیخ کی عظمت، عقیدت اور احترام مسلّم سہی، لیکن ان کا معصوم ہونا مسلّم نہیں اور ایک غیر معصوم سے فکر و فہم اور اجتہاد و تعبیر میں لغزش اور سہو بالکل ممکن ہے، اسی اصول کی بنا پر مولانا کو اپنے شیخ اور مرشد مولانا مدنی سے اختلاف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا۔

مولانا عبدالماجد مولانا شبلی، مولانا محمد علی اور اکبر الہ آبادی وغیرہ کی عقیدت و محبت میں بھی سرشار تھے اور اپنی تحریروں میں ان حضرات سے بھی اپنی عقیدت اور جوش نیاز کا اظہار کیا ہے لیکن ان کی بشری کمزوریوں اور خطاؤں پر بھی ان کی نظر پڑتی رہتی تھی اس لیے ان سے اظہار نیاز مندی کرنے کے باوجود ان سے اختلاف کرنے یا ان کی غلطیوں سے واقف ہونے کے بعد ان کی تردید کرنے میں پس و پیش نہیں کیا ہے، طوالت کے خوف سے مثالیں قلم انداز کی جاتی ہیں۔

مولانا کا ایک بڑا کمال یہ تھا جو ان کی سلامت روی اور اعتدال کا بھی ثبوت ہے کہ جو اشخاص و افراد ان کی عقیدت و نیاز اور محبت و تعلق کا مرکز تھے ان میں خود باہم کوئی یگانگت اور ہم آہنگی نہ تھی بلکہ ان کے خیالات و افکار باہم دگر نہایت مختلف تھے لیکن مولانا کے تعلقات ان متضاد عناصر اور مختلف الخیال اشخاص سے استوار اور قائم رہتے اور وہ سب کی محبت کا دم برابر بھرتے رہتے۔

مولانا اشرف علی اور مولانا حسین احمد مدنی میں اختلاف تھا ایک زمانہ میں دونوں کے سیاسی اختلافات اتنا بڑھ گئے تھے کہ مولانا تھانوی نے دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی سے استعفاد دیا مگر ان کے اختلافات کا کوئی اثر مولانا عبدالماجد پر نہ پڑا ایک سے بیعت کا تعلق اور دوسرے سے عقیدت کا رشتہ پہلے ہی کی طرح رہا۔ مولانا شبلی کے متعلق مولانا تھانوی کے تشدد کا ذکر پہلے گزر چکا ہے ان کی تکفیر سے رجوع کر لینے کے بعد بھی وہ ان کی جانب سے صاف نہیں ہوئے تھے، مولانا حسین احمد کو مولانا شبلی کے افکار و خیالات سے کیا مناسبت تھی؟ لیکن مولانا عبدالماجد مولانا شبلی کی صہبائے علم و ادب سے ہمیشہ مخمور اور سرشار رہے اور ان سے نسبت و تعلق پر فخر کا اظہار کرتے رہے، دیوبند سے تعلق اور تھانہ بھون کی حاضری کے بعد بھی وہ مولانا شبلی کے ادب و انشا کی حلاوت و لطافت پر سر دھنتے رہے، ان کے فضل و کمال، وسعت علم و نظر، تصنیف و تالیف میں یکتائی و وحدت، ذاتی شرافت، عالی ظرفی، حب قوم، دینی و ملی غیرت و حمیت اور اسلام کی حمایت و مدافعت میں سینہ سپر رہنے کا ذکر تھانہ بھون سے عقیدت اور دیوبند سے وابستگی کے بعد بھی کرتے رہے۔ مولانا تھانوی اور مولانا محمد علی ایک دوسرے سے مکدر، آزردہ اور متنفر ہی رہے اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا تھانوی کے حلقہ میں مولانا محمد علی ایک بدعقیدہ، نیچری اور ہندو پرست خیال کئے جاتے تھے اور مولانا محمد علی کے نزدیک مولانا تھانوی ایک ملا محض اور گورنمنٹ کے حمایتی تھے مگر اس کے باوجود وہ دونوں پر جان چھڑکتے رہے اور کسی سے بھی ان کی عقیدت و نیاز مندی میں کوئی فرق نہ آسکا بلکہ وہ اس

فکر میں رہتے تھے کہ ان کی باہمی غلط فہمی رفع ہوجائے، کدورت ختم ہوجائے اور نفرت محبت میں اور بدگمانی حسن ظن میں تبدیل ہوجائے کیونکہ وہ دونوں کو برحق سمجھتے تھے اور ان کے باہمی اختلاف کو اخلاص پر مبنی سمجھتے تھے اس لیے ہر ایک کی محبت کا دم بھرتے تھے، مولانا عبدالماجد کے خیال میں دو معاصر مخلصین میں شدید اختلاف ہمیشہ ہوتا رہا ہے اس کا سبب جو کچھ بھی ہو مگر ان کے اخلاص اور نیک نیتی پر کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ وہ لکھتے ہیں :

"کیا دو معاصر مخلصین و مومنین کے درمیان اتنا شدید و مدید اختلاف اور تنازع ممکن بھی ہے، ممکن ہی نہیں کثیر الوقوع بھی . . . امیرالمومنین علی مرتضیٰ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ کے اور دوسرے اکابر صحابہ کے مابین اختلافات کی حکایت کس کے کانوں میں نہیں پہنچی ہے، دوسرے اختلافات اس سے کم درجہ کے مشاہیر میں بھی، پھر بھی مسلم مقبولین اور اہلِ اخلاص کے درمیان کیا نادر الوقوع رہے ہیں شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی قطب الاقطاب اور محدث جلیل ابن جوزی میں سے آپ کس کا شمار اہلِ باطل میں کریں گے، نظام الاولیا شیخ نظام الدین دہلوی اور قاضی شہر شیخ ضیاء الدین سنامی کے درمیان آپ کس کے برسرحق ہونے کا حکم لگائیں گے، غرض عہد صحابہ سے لے کر متاخرین تک کون سا دور اکابر ہی کی باہم تفسیق بلکہ تکفیر و مجادلہ سے خالی رہا ہے؟ —— نفس کے لیے اور شیطان کی راہ میں نہیں بلکہ حق کے لیے اور اللہ کی راہ میں، اس عالم ناسوت میں محدود فہم و بصیرت رکھنے والے بندوں میں حالات تکوینی کے محکوم و مسخر بندوں میں جدال و خصومت کب اور کس دور میں نہیں رہی ہے؟ اور یہ بھی اسی راہ کی امتحان ہی کی ایک لطیف و صبر آزما سی صورت ہے . . . اور ذرا اور آگے بڑھئے تو دو معصوموں تک کے درمیان دینی حرارت سے وقتی آویزش اور ہنگامی عتاب فی اللہ کی حکایت تو خود قرآن مجید نے سنائی ہے[1] . . . اور پھر "ہم ان کے سینوں سے کینہ کپٹ نکال دیں گے تختوں پر آمنے سامنے بھائی بن کر رہیں گے"[2] کی بشارت اہلِ جنت کو اگر انہی موقعوں کے لیے نہیں تو اور کس محل کے لیے ہے۔

غرض مولانا کی عقیدت و محبت ایسی اندھی نہ تھی کہ جس کی عظمت کے قائل ہوں اس سے سہو و لغزش کے صدور کو ناممکن سمجھتے ہوں یا اس کی غلط رائے و خیال سے واقفیت کے بعد بھی اس سے اختلاف کی جرأت نہ کرسکتے ہوں ان کے قلم نے دوستوں اور مخالفوں کی بےشمار کتابوں پر تبصرے لکھے، مگر دوستوں کی کتابوں کی خامیاں دکھانے میں نہ کبھی مداہنت سے کام لیا اور نہ مخالفوں کی کتابوں کی خوبیوں سے اغماض برتا۔ وہ بھید بھاؤ اور تفریق کو ناپسند کرتے تھے تنگ نظری اور تعصب سے ان کو نفرت تھی اس لیے سب کے معاملہ میں انصاف اور راستی کو مقدم رکھتے تھے، خود حنفی تھے مگر غیر حنفیوں کے لیے بھی ان کے دل میں جگہ تھی، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے ایک حد تک اختلاف تھا لیکن ان کی خوبیوں سے چشم پوشی نہیں کرتے تھے، سنی تھے مگر شیعوں سے نفرت نہ تھی۔ ان کے کمالات اور خوبیوں کی قدر کرتے تھے اور ان کی مدح و توصیف بھی اسی طرح کرتے تھے جس طرح ایک سنی کی کرتے تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد مذہباً شیعہ تھے مگر مولانا ان کی فیاضی، علم پروری، غربا نوازی، ذاتی شرافت، قومی و ملی خدمات اور انصاف پسندی کے بڑے مداح تھے، دوسرے شیعہ حضرات کے بارے میں بھی نہایت منصف مزاج واقع ہوئے تھے، متعدد شیعہ رؤسا اور علما پر صدق میں تعزیتی نوٹ لکھ کر ان کی خوبیوں کا فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ ان کی حق شناسی اور انصاف پسندی نے ان کو غیر مسلموں کا بھی مداح اور گرویدہ بنا دیا تھا اور وہ بڑی فراخ دلی سے ان کی شرافت اور خوبیوں کا بھی اعتراف کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ "شرافت کسی قوم و مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں"۔

مولانا کا اصول و دستور یہ تھا کہ جس چیز کو صحیح اور بہتر سمجھتے تھے بے جھجک، نہایت جرأت و بیباکی اور بڑی بےخوفی سے اس

---

[1] حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی طرف اشارہ ہے کہ طور سے جب حضرت موسیٰؑ واپس آئے اور اپنی قوم کو بچھڑے کی پرستش کرتے دیکھا تو اپنے بھائی ہارونؑ پر سخت برہم ہوگئے تھے [2] قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

کا اظہار کرتے تھے کسی کی عظمت، اس کے عہدہ و منصب کی بڑائی، خاندانی وجاہت، علمی و ادبی شہرت اور غیر معمولی اثر و رسوخ بھی ان کو راہ صداقت اور جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں کرسکتا تھا' ان کی حق گوئی اور صدق گفتاری کسی مصلحت یا حکمت عملی کا شکار ہونا جانتی ہی نہ تھی۔ اردو کے معاملہ میں آنجہانی ڈاکٹر سمپورنانند کے رویہ کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اس پر برابر تنقید بھی کرتے تھے مگر ان کو کبھی یہ خوف دامنگیر نہ ہوا کہ سمپورنانند جی ان کی ریاست اتر پردیش کے چیف منسٹر ہیں' ڈاکٹر ذاکر حسین سے دیرینہ تعلقات تھے وہ بہار کے گورنر ہوئے اور مولانا پٹنہ تشریف لے گئے تو ان کے مہمان ہوئے اور گورنر ہاؤس میں قیام کیا' ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہوئے تو ان کے طرز عمل سے مولانا کو شکایت ہوئی جس پر انھوں نے سختی سے گرفت کی اور کبھی ان کو یہ خیال نہ آیا کہ جس شخص کو وہ اعتراضات کا نشانہ بنا رہے ہیں وہ ملک کے سب سے اعلیٰ و معزز عہدہ پر فائز ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بھی مولانا کے دوستانہ تعلقات تھے ان کی اور آل احمد سرور کی ادبی عظمت و شہرت سے کون ناواقف ہے لیکن جب رشید صاحب نے سرور صاحب کی سفارش پر ایک قابل اعتراض کتاب کو ایم۔ اے اردو کے نصاب میں داخل کیا اور مولانا کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے پہلے رشید صاحب کو لکھا وہ خاموش رہے تو صدق میں لکھنا شروع کیا اس پر بھی وہ چپ رہے تو انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھا انھوں نے وائس چانسلر تک معاملہ کو پہنچایا تب کہیں کتاب نصاب سے خارج کی گئی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک جو کچھ غلط ہوتا تھا وہ اس کی برملا تردید کرتے تھے' غلط خیال و رائے کو غلط کہنے سے وہ کبھی باز نہ آتے تھے چاہے کسی کو خوشی ہو' یا ناخوشی' حق و باطل اور سچ اور جھوٹ کے معاملہ میں وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور نہ رائے عامہ سے مرعوب اور خائف ہوتے تھے ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں' بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

★

(سانیٹ)

مولانا عبدالماجد

ناظم جعفری

نئی راہوں پہ نئے عزم سے چلنے والے
آخرش منزلِ مقصود کو پا لیتے ہیں
نبض حالات کی رفتار بدلنے والے
شخصیت اپنی بہر حال بنا لیتے ہیں

ایسے انساں کا بھی تاریخ ادب میں ہے وجود
جس نے کی فکر و نظر سے نئی دنیا تعمیر
جتنے اوراق بھی دیکھے گئے سب میں موجود
منطق و فلسفہ تاریخ۔ سوانح تفسیر

اپنے انداز میں تھیں منفرد اس کی باتیں
اس کی تحریر سے تھا حسن تکلم منسوب
دل میں ہر شخص کے گھر کرتی تھیں سچی باتیں"
پُراثر اس کی زباں پُرکشش اس کا اسلوب

یوں تو ہونے کو بہت ہوں گے مصنف پیدا
صاحب طرز نہ ہوگا کوئی ماجد جیسا

ڈاکٹر حنیف نقوی

مولانا عبدالماجد اور علامہ سلیمان ندوی

مکتوبات سلیمانی کی روشنی میں

ماضی قریب کی ان جامع الحیثیات شخصیتوں میں جنھوں نے اپنی علمی فتوحات اور کارہائے نمایاں کے ذریعے ہندستان اور ہندستانی مسلمانوں کو دنیا کی نگاہوں میں سربلند کیا علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے نام ناقابل فراموش ہیں۔ مذہبیات، ادبیات، سیرت و سوانح، فلسفہ و منطق اور سیاست و صحافت میں سے کوئی میدان ایسا نہیں جس میں ان بزرگوں نے اپنی ذہانت و فطانت اور انفرادیت و یکتائی کے نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ ابتدا میں دونوں کا انداز فکر ایک دوسرے سے بڑی حد تک متوازی اور متضاد تھا۔ سید صاحب ندوہ کے فارغ التحصیل، خدا کے قائل، رسولؐ کے شیدائی، قرآن و سنت کے پابند اور احیائے دین کے علم بردار، غرض سرتاسر اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے۔ دوسری طرف مسٹر عبدالماجد یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ، جلوۂ دانش فرنگ سے مبہوت و حیران، خدا سے بے تعلق، رسول سے ناآشنا، مذہب سے بیزار، الحاد و دہریت کی طرف راغب، آزاد خیالی اور تجدد کے داعی۔ نظریات اور مسلک کے اس اختلافات کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے ذکاوت طبع، ندرت فکر، وسعت علم، اصابت نظر اور زور قلم سے پوری طرح باخبر اور ان اوصاف کے تہِ دل سے قدرشناس تھے۔ قدردانی کا یہی اشتراک دونوں کو ایک دوسرے سے قریب لایا اور اس قربت نے رفتہ رفتہ اتحاد فکر و نظر کو قریب سے قریب تر کر کے دوئی اور مغائرت کے تمام پردے درمیان سے اٹھا دیئے۔

سید صاحب ضلع پٹنہ (بہار) کے ایک گاؤں دیسنہ میں ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیسنہ پھلواری شریف اور دربھنگہ میں ہوئی اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں تکمیل کی غرض سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۰۷ء میں سند فراغت حاصل کی۔ ندوہ کی طالب علمی کے دور میں علم الحدیث کے سلسلے میں علم الرجال کا مطالعہ تاریخ اسلامی سے شغف کا محرک ثابت ہوا۔ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے فیض تلمذ اور حسن تربیت نے عربی ادب اور فلسفہ و منطق سے مناسبت طبعی کو فروغ بخشا اور علامہ شبلی کے فیضان صحبت و شاگردی کی بدولت علم الکلام سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ علامہ موصوف کی شفقت و عنایت ہی کے نتیجہ میں مصر و شام سے شائع ہونے والے علمی و ادبی جرائد کے مطالعے کا موقع ملا اور اس کے نتیجے میں جدید عربی زبان و ادب پر عبور حاصل ہوا۔ تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد دارالعلوم کے ترجمان "الندوہ" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر ایک سال کے اندر ہی علم الکلام اور جدید عربی کے استاد بنا دیئے گئے۔ ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم کی مجلس تعلیمی نے جدید عربی کے ایک لغت کی ترتیب و تالیف کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں جسے انھوں نے دو سال میں مکمل کر لیا۔ اس کے کچھ دن بعد بعض وجوہات کے تحت ندوہ سے بحیثیت استاد ان کا تعلق منقطع ہو گیا۔

ندوہ سے ترک ملازمت کے بعد مئی ۱۹۱۳ء میں سید صاحب کلکتہ پہنچ کر مولانا آزاد کے اخبار "الہلال" کے ادارۂ تحریر سے

وابستہ ہوگئے۔ لیکن اختلافاتِ طبع کی بنا پر یہ تعلق زیادہ دنوں تک نہ نبھ سکا، چنانچہ اسی سال کے اواخر میں انھوں نے دکن کالج پونا میں السنۂ شرقیہ کی پروفیسرشپ قبول کرلی جس کے لیے ان کے نام کی سفارش ان کے مربی و مشفق استاد علامہ شبلیؔ نے کی تھی۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں علامہ موصوف نے اس حالت میں کہ بسترِ مرگ پر وقتِ موعود کے منتظر تھے۔ آپ کو بذریعہ ٹیلی گرام پونا سے اعظم گڈھ طلب کیا اور ملازمت سے مستعفی ہوکر پوری یکسوئی کے ساتھ "سیرۃ النبی" کے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہدایت کی۔ اس وصیت کی تعمیل میں سید صاحب نے مارچ ۱۹۱۵ء میں پونا کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور اعظم گڈھ میں مستقل بود و باش اختیار کرلی۔ اعظم گڈھ آنے سے قبل ہی آپ نے علامہ شبلی کی تجویز کے مطابق "دارالمصنفین" کی تاسیس کا خاکہ مرتب کرنا شروع کردیا تھا۔ ۱۹۱۵ء کے اواخر میں اس کی بنیاد پڑی اور ۱۳ جولائی ۱۹۱۶ء کو اس کے ترجمان کی حیثیت سے "معارف" کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ دارالمصنفین سے سید صاحب کا یہ تعلق اکتیس سال تین ماہ کے قریب قائم رہا۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے اولین فرصت میں "سیرۃ النبی" کی پہلی دو جلدیں جن کے مسودات تیار تھے، ضروری ترتیب و تدوین کے بعد علی الترتیب ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں شائع کیں۔ بعد ازاں پورے انہماک کے ساتھ باقی جلدوں کی تسوید و تکمیل کا کام کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں تیسری جلد، ۱۹۳۲ء میں چوتھی، ۱۹۳۵ء میں پانچویں اور ۱۹۳۹ء میں چھٹی جلد شائع ہوئی۔ ساتویں جلد بھی زیرِ تصنیف تھی لیکن اس کے صرف دو ابواب لکھے جاسکے اور بعض مصروفیات و موانع کی وجہ سے یہ آخر عمر تک مکمل نہ ہوسکی۔ "سیرۃ النبی" کے علاوہ اعظم گڈھ کے زمانۂ قیام میں آپ نے ۱۹۴۳ء میں "حیاتِ شبلی" کے نام سے علامہ شبلی کی ایک مبسوط سوانح عمری تصنیف کی۔ اور ان کے متفرق مقالات گیارہ جلدوں میں مرتب کرکے شائع کیے۔

۲۵ جون ۱۹۴۶ء کو فرماں روائے بھوپال نواب سر محمد حمید اللہ خاں کے مسلسل اصرار پر سید صاحب بھوپال پہنچے اور غالباً یکم جولائی ۱۹۴۶ء سے قاضیٔ ریاست اور ڈائرکٹر تعلیماتِ شرقی کے عہدے پر ان کا تقرر ہوگیا۔ اپنی مختصر مدتِ ملازمت کے دوران انھوں نے ریاست کے عربی مدارس کی اصلاح کے لیے سعیِ بلیغ کی اور نصابِ تعلیم کی تشکیلِ جدید کرکے اسے زیادہ سے زیادہ مفید و کارآمد بنایا۔ ریاست کے انڈین یونین میں انضمام کے بعد حالات کے رخ کو دیکھتے ہوئے مئی ۱۹۵۰ء کے اواخر میں آپ نے ملازمت سے استعفا دیدیا اور یکم جون کو سخت دل برداشتگی کے عالم میں بھوپال سے روانہ ہوکر اعظم گڑھ، کانپور اور دہلی میں مختصر قیام کے بعد ۱۱ جون کو بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچ گئے۔ ۱۴ جون کو لاہور سے کراچی پہنچے جہاں ان کی اولاد اور اعزّہ میں سے کئی لوگ بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ اگرچہ ابتدا میں پاکستان میں مستقل قیام کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن واپسی کے لیے اجازت نامے کے حصول میں دشواریوں کے تلخ تجربے اور مخلصین و اعزّا کے غیر معمولی اصرار نے واپسی کی راہیں مسدود کردیں چنانچہ عمر کے آخری چند سال آپ نے کراچی میں گزارے اور وہیں ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو انتقال فرمایا۔

سید صاحب اجلّۂ علمائے عصر میں شمار کیے جاتے تھے۔ علومِ دینیہ کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو ادبیات میں بھی ایک متخصص کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ جہاں بھی رہے وہاں ان کی بھرپور قدر ہوئی اور ان کے خرمنِ فیض سے استفادہ کے تمام امکانات کا پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ ہندوستان میں وہ دارالمصنفین کے علاوہ ہندوستانی اکیڈمی (الٰہ آباد) مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، محکمہ تعلیم یو۔پی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور آل انڈیا ہسٹری کانگریس جیسے علمی اداروں کی مختلف مجلسوں سے ان کے رکن یا کسی خاص اجلاس کے صدر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں آپ نے جنوبی ہند کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام مدراس میں سیرتِ نبوی کے موضوع پر آٹھ لیکچر دیے۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں ہندوستانی اکیڈمی نے آپ کو "عرب و ہند کے تعلقات" پر سلسلۂ تقاریر کے لیے دعوت دی اور ۱۹۳۱ء میں محکمۂ تعلیم بمبئی نے کسی

اسلامی موضوع پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ ۱۹۴۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے انھیں گرانقدر علمی و ادبی خدمات کے صلے میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ پاکستان کی تین سو تین سالہ مختصر مدت قیام میں وہ پنجاب یونیورسٹی کمیشن، عربی دارالعلوم کی مجلس تاسیس، دستور ساز اسمبلی کی بنیادی حقوق کمیٹی اور کراچی یونیورسٹی کی سنیٹ کے رکن اور جمعیۃ العلماء اسلام پاکستان، ہسٹاریکل کانفرنس اور پنجاب کے مدارس عربیہ کے ایک سالانہ اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔ برصغیر ہندو پاک کے علاوہ ایک مفکر اور ماہر تعلیمات کی حیثیت سے افغانستان نے بھی سید صاحب کی خدمات سے استفادہ کیا۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شاہ افغانستان کی دعوت پر آپ علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ کابل تشریف لے گئے اور کابل یونیورسٹی کی تنظیم نو اور راس کے نصاب تعلیم کی تشکیل جدید کے سلسلے میں مقامی ماہرین کی اعانت کی۔

مذہبیات و ادبیات کے علاوہ سیاسی و سماجی میدانوں میں بھی مسلمانان ہند نے سید صاحب کی قیادت و رہنمائی سے فیض حاصل کیا۔ اس سمت میں آپ کے عملی اقدام اور قلمی جہاد کی ابتدا اس مضمون سے ہوئی ہے جو اگست ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے انہدام اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے احتجاج اور ان کی بے دریغ خون ریزی کے واقعات کے زیر اثر "مشہد اکبر" کے عنوان سے "الہلال" کے کسی قریبی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد آپ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ ملک کی سیاسیات میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں وفد خلافت کے ایک رکن کی حیثیت سے یورپ کے دورے پر تشریف لے گئے اور تقریباً سات مہینے تک مختلف مقامات پر تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے مقاصد اور مطالبات کی پرزور وکالت کی۔ لندن سے واپسی پر پورے جوش و خروش کے ساتھ ترک موالات کی تحریک میں شریک ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت کمیٹی کے ایک وفد کے قائد کی حیثیت سے حجاز مقدس کا دورہ کیا۔ ۱۹۲۶ء میں سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی دعوت پر موتمر عالم اسلامی کے جلسہ تاسیس میں شرکت کی۔ ۱۹۲۸ء میں شاردا ایکٹ کے خلاف مسلسل مضامین اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کا موقف واضح کیا۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں دہلی میں منعقدہ فلسطین کانفرنس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس کا خطبۂ صدارت اس قدر مدلل اور بصیرت افروز تھا کہ عرب ملک کے بعض اخبارات نے اسے لفظ بہ لفظ شائع کیا۔ ۱۹۴۲ء میں سید صاحب باقاعدہ طور پر مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اس کے بعد سیاسی سرگرمیوں میں کمی آگئی اور آپ نے اپنی بقیہ زندگی دینی اور علمی کاموں کے لیے وقف کر دی۔

سید صاحب کی تصنیفات و تالیفات کے ضمن میں سیرۃ النبیؐ، حیات شبلی اور مقالات شبلی کا ذکر مجملاً گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل تصانیف آپ کے آثار علمیہ کے ذیل میں بطور خاص قابل ذکر ہیں:۔

(۱) ارض القرآن:۔ دو جلدوں میں پہلی جلد ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں اور دوسری جلد ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔

(۲) سیرت عائشہ:۔ ام المومنین حضرت عائشہ کی مبسوط اور مستند سوانح عمری جو ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔

(۳) خطبات مدراس:۔ ۱۹۲۵ء میں جنوبی ہند کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی دعوت پر دیئے گئے آٹھ لیکچروں کا مجموعہ۔

(۴) عرب و ہند کے تعلقات:۔ مارچ ۱۹۲۹ء ہندوستانی اکیڈمی کے زیر اہتمام دیئے گئے توسیعی خطبات کا مجموعہ

(۵) عربوں کی جہاز رانی:۔ مارچ ۱۹۳۱ء کے بمبئی کے چار لیکچروں کا مجموعہ۔

(۶) خیام:۔ ۱۹۳۳ء اس کتاب میں خیام کے متعلق یورپی مصنفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی مدلل طور پر تردید کی گئی ہے۔ فردوسی کے جشن ہزار سالہ کے موقع پر افغانستان کی جانب سے ایران کو جو کتابیں بطور تحفہ بھیجی گئی تھیں، ان میں یہ کتاب بھی شامل تھی۔

(۷) سفرنامۂ افغانستان:۔ ۱۹۳۴ء

(۸) نقوش سلیمانی:۔ اردو زبان سے متعلق مختلف تحریروں اور تقریروں کا مجموعہ جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

مولانا عبدالماجد وسط مارچ ۱۸۹۲ء میں دریا باد ضلع بارہ بنکی کے شیوخ قدوائی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں نکیم پور کھیری میں جہاں آپ کے والد محترم مولوی عبدالقادر صاحب بحیثیت ڈپٹی کلکٹر مامور تھے رسم بسم اللہ ادا ہوئی۔ گھر پر قرآن شریف اور فارسی کی متداول کتابوں کی تعلیم سے فراغت کے بعد گیارہ بارہ سال کی عمر میں انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے گورنمنٹ ہائی اسکول سیتاپور میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں انٹرنس پاس کیا۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں مزید تعلیم کی غرض سے لکھنؤ پہنچ کر کیننگ کالج میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۱۰ء میں ایف۔اے۔ اور ۱۹۱۲ء میں بی۔اے کے امتحانات پاس کیے۔ اسی سال فلسفہ میں ایم۔اے۔ او کالج علی گڈھ کی طرف رجوع کیا لیکن نومبر کے اواخر میں سفر حج کے دوران والد کے انتقال اور دوسری پریشانیوں کی وجہ سے سال اوّل کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۱۳ء میں سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخلہ لیا لیکن اتفاقی و حادثاتی مالی مشکلات کی وجہ سے یہ سلسلہ بھی مکمل نہ ہو سکا۔ مجبوراً تعلیم ادھوری چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے۔ دو ڈھائی برس کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے حسب خواہش لٹریری اسسٹنٹ کے طور پر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ لیکن وہاں "خوش و مطمئن" نہ رہ سکے اور چند ہفتوں کے اندر خرابی صحت کا بہانہ بنا کر مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے سررشتہ تالیف و ترجمہ میں فلسفے کے مترجم کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ یہ تعلق یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے آخر جولائی ۱۹۱۸ء تک قائم رہا۔ گیارہ ماہ کی ملازمت کے بعد آپ ایک ماہ کی چھٹی لے کر لکھنؤ چلے آئے اور یہاں سے استعفا بھیج کر آزادانہ تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گئے۔ فروری ۱۹۲۱ء میں آپ نے احباب و ملاقاتیوں کی کثرت اور تحریک خلافت و تحریک ترک موالات کی گرم بازاری کو اپنے علمی مشاغل کے لیے ناموافق اور سد راہ خیال کرتے ہوئے لکھنؤ کے بجائے دریا باد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی چھپن برس یہیں بسر ہوئے۔ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو لکھنؤ میں جہاں آپ بسلسلۂ علاج مقیم تھے۔ کچھ کم پچاسی سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی۔

مولانا کے تصنیفی و تالیفی مشاغل کا آغاز اسکول کی طالب علمی کے دوران ہی ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں وہ کبھی کبھی اودھ اخبار لکھنؤ، وکیل (امرت سر) اور پیسہ اخبار (لاہور) میں مضامین لکھتے رہتے تھے۔ انٹرمیجیٹ کی تعلیم کے دوران ان کے دو طویل مضامین "محمود غزنوی" اور "غذائے انسانی" علی الترتیب ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں "وکیل" میں چھپے اور اس کے بعد اسی اخبار کی طرف سے کتابی صورت میں شائع کیے گئے۔ کیننگ کالج کی طالب علمی ہی کے دور میں انھوں نے شہر کے ادبی جلسوں میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ انھیں جلسوں کی بدولت انھیں علامہ شبلی سے قریب آنے اور ان کے نامور تلامذہ علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا عبدالسلام (مصنف شعر الہند) اور مولانا مسعود علی سے تعلقات استوار کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ علامہ شبلی اس زمانے میں "سیرۃ النبی" کے لیے مواد کی فراہمی میں مصروف تھے۔ انھوں نے آپ کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے پچاس روپیہ ماہوار پر انگریزی کتابوں کی تلخیص اور ضروری عبارات کے اردو ترجمے کی خدمت جز وقتی بنیاد پر آپ کے سپرد کر دی۔

بی۔اے میں فلسفہ، انگریزی ادب اور عربی آپ کے اختیاری مضامین تھے۔ لیکن رجحان طبیعت فلسفہ کی طرف زیادہ تھا۔ اس منزل تک آتے آتے فکری افق کی وسعت کے ساتھ قلم کا رخ بھی سنجیدہ علمی مضامین کی طرف ہو گیا تھا۔ جو موقر ادبی جرائد میں جگہ پانے لگے تھے۔ انھیں مضامین میں سے ایک مضمون علامہ شبلی کی مشہور تصنیف "الکلام" سے متعلق تھا جو "ایک طالب علم" کے غیر متعین نام سے ماہنامہ "الناظر" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں "الکلام" پر بڑے جارحانہ انداز اور "ملحدانہ رنگ" میں تنقید کی گئی تھی۔ مضمون نگاری کے اس ذوق کو مزید ابھارنے اور نکھارنے میں علامہ شبلی کے فیضان صحبت اور انگریزی سے ترجمے کی مشق نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۱۴ء میں نفسیات کے موضوع پر آپ کی پہلی مبسوط تصنیف "فلسفۂ جذبات" انجمن

ترقی اردو کی جانب سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کے معاً بعد "سائیکالوجی آف لیڈر شپ" کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب لکھی جو ۱۹۱۵ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اسی سال، فلسفۂ اجتماع کے نام سے اس کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوا۔ ۱۹۱۵ء ہی میں "ناظر" کے فرضی نام سے ایک معاشرتی ڈراما، زود پشیماں تصنیف کیا جو پہلے کسی رسالے میں اور اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوا۔ اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو کے لیے، تاریخ اخلاق یورپ کے نام سے دو جلدوں میں لیکی کی "ہسٹری آف یورپین مارلس" کا ترجمہ کیا اور نامس بکل کی تصنیف ہسٹری آف سولزیشن اِن یورپ کی تین جلدوں کے ترجمے کی جسے منشی احمد علی کاکوروی ابتدائی مراحل میں چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے تکمیل کی۔ ستمبر ۱۹۱۷ء سے جولائی ۱۹۱۸ء تک حیدرآباد میں قیام کے زمانے میں ایک ضخیم اور جامع کتاب منطق کے موضوع پر تیار کی۔ جو سررشتہ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی اور برسوں جامعہ عثمانیہ کے نصاب میں داخل رہی۔ اس سلسلے کا دوسرا کام تاریخ یورپ کا ترجمہ تھا۔ یہ بھی سررشتہ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شائع ہوا۔ حیدرآباد جانے سے قبل مشہور فلسفی برکلے کے "ڈائیلاگس" کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ سررشتۂ تالیف و ترجمہ سے قطع تعلق کے بعد اس کی آخری قسط اشاعت کے لیے دارالمصنفین کے حوالے کی۔ یہ کتاب ۱۹۱۹ء میں "مکالمات برکلے" کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔

اگرچہ مولانا کی پرورش و پرداخت خالص دینی ماحول میں ہوئی تھی۔ لیکن انگریزی تعلیم اور فلسفہ سے خصوصی دلچسپی کے زیرِ اثر ان کی فکری و عملی زندگی کا آغاز آزاد خیالی اور عقلیت پسندی کی جانب پیش رفت سے ہوا۔ "الکلام" کی تنقید ابتدائی دور کے چند دوسرے مضامین اور نفسیات کے موضوع پر پہلی دو تصانیف اسی رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ حیدرآباد سے واپسی کے کچھ دن بعد تک یہ کیفیت برقرار رہی اس کے بعد مختلف غیر اسلامی مذاہب کے روحانی فلسفوں کے مطالعے سے انداز فکر میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی۔ بنارس کے مشہور فلسفی عالم ڈاکٹر بھگوان داس، مسز اینی بسنٹ اور مہاتما گاندھی کی تحریروں اور تقریروں سے کچھ روشنی ملی اور مثنوی مولانا روم نے آنکھوں کے سامنے بہت سے پردے ہٹا دیئے۔ رفتہ رفتہ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ سلیمان ندوی کی اصلاحی کوششیں جو موعظۂ حسنہ اور حکیمانہ مشوروں کی صورت میں ایک عرصے سے جاری تھیں، بار آور ہوئیں اور ۱۹۲۰ء میں مولانا بقول خود از سرِ نو دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ظلمت سے ہدایت اور ارتداد سے اسلام کی طرف رجوع کے اس ابتدائی دور میں محض "تصوف کا چسکا رہا"۔ اولیا اللہ کے مزارات پر حاضری، عرس اور سماع کی محفلوں میں شرکت اور چلّہ کشی کے شغل نے معمولات کی حیثیت اختیار کر لی۔ دو تین سال کے بعد فقہ و حدیث کے مطالعے کا شوق دامن گیر ہوا تو شرعی مسائل میں سید صاحب کو اپنا رہنما بنایا۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا اشرف علی تھانوی سے نیاز حاصل ہوا اور پہلی ہی ملاقات میں جذبِ باطنی نے ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا۔ حتیٰ کہ چند دنوں میں باقاعدہ بیعت کر کے ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

۱۹۱۷ء تک سیاست کو مولانا کی زندگی میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت حاصل رہی۔ مولانا سلیمان ندوی کے بقول علم کو پالٹکس کا پیوند دینا ان کے نزدیک جائز نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بسنٹ کی نظر بندی نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ فرطِ جوش میں ہوم رول لیگ کے رکن بن گئے اور سیاست میں سرگرم حصہ لینے لگے۔ مولانا محمد علی کے زیرِ قیادت تحریکِ خلافت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ عرصہ تک اس کی علاقائی کمیٹی کے صدر اور مرکزی مجلس کے ممبر رہے۔ اور مارچ ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کی لکھنؤ کانفرنس کے موقع پر اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ تحریکِ عدم تعاون کے زیرِ اثر ولایتی کپڑوں کو خیرباد کہہ کر گاندھی جی کے اقدام کی عملی تائید کی اور آخر عمر تک کھدر کے کپڑے پہنتے رہے۔ لیکن قرآن کے ترجمے و تفسیر کی طرف انہماک کے زمانے میں عملی سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی اور

پھر کبھی اس کوچے میں قدم نہ رکھا۔

سیاست اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مولانا اس میدان کے شہسواروں میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ "معارف" کے ادارہ تحریر سے اس کی ابتدا ہی سے ان کا تعلق رہا، اور "شذرات" کے تحت دوسرے موضوعات کے ساتھ انھیں وقتاً فوقتاً سیاسی مسائل پر اظہار خیال کے مواقع بھی ملتے رہے۔ علامہ سلیمان ندوی کے دورۂ یورپ کے زمانے میں اس کی ادارت کے فرائض تمام تر انھوں نے ہی انجام دیئے۔ ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ سے ہفتہ وار "حقیقت" جاری ہوا تو اس میں ادبی و سیاسی موضوعات پر بکثرت مضامین لکھے۔ ۱۹۲۵ء میں اپنا ہفت روزہ اخبار "سچ" جاری کیا۔ جو ۱۹۳۲ء تک برابر چھپتا رہا۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں "صدق" کے نام سے اسکی تجدید ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں چند ماہ کے عبوری وقفے کے بعد یکم دسمبر سے "صدق جدید" کا اجرا ہوا۔ جو مولانا کے انتقال کے بعد بھی برابر نکل رہا ہے۔ "سچ" "صدق" اور صدق جدید" میں "سچی باتیں" اردو کے صحافتی ادب کے لیے ان کی ایک گرانقدر دین کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۹۲۰ء کے بعد کے آثار علمیہ میں قرآن کے انگریزی و اردو تراجم اور تفاسیر اور مولانا محمد علی جوہر، مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت اکبر الہ آبادی سے متعلق نگارشات مولانا کے اہم کارناموں میں شمار کی جاتی ہیں۔ انگریزی میں قرآن کے ترجمے اور تفسیر کا کام انھوں نے ۱۹۳۲ء میں شروع کیا جو تقریباً چھ سات سال میں مکمل ہوگیا اور ۱۹۴۱ء میں تاج کمپنی لاہور کی جانب سے اس کے پارۂ اول کی اشاعت ہوئی۔ اس کے بعد اردو میں ترجمے اور تفسیر کی ابتدا کی۔ اور اسے بھی چند سال میں تفسیر ماجدی کے نام سے سات جلدوں میں مکمل کرلیا۔ اس کی اولین اشاعت بھی تاج کمپنی لاہور ہی کی جانب سے عمل میں آئی پہلے ایڈیشن کی مقبولیت کے پیش نظر گذشتہ چند برسوں میں مولانا نے "کامل نظر ثانی اور معقول و معتد بہ اضافہ کے ساتھ" اس کا دوسرا ایڈیشن مرتب کیا، جس کی کچھ جلدیں صدق جدید بک ایجنسی کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں اور کچھ ابھی شائع ہونا باقی ہیں۔ بعد ازاں ۱۹۷۹ء میں تاج کمپنی لاہور کی فرمائش پر از سرِ نو انگریزی میں ترجمہ قرآن (بلا تفسیر) کی تکمیل کی۔ اول الذکر ترجمے کے برخلاف جو بائبل کی قدیم زبان میں تھا، یہ ترجمہ رائج الوقت زبان میں کیا گیا ہے۔ قرآن سے متعلق یا قرآن سے ماخوذ دوسری تصانیف میں ارض القرآن، الحیوانات فی القرآن، اعلام القرآن، قصص و مسائل بشریت انبیا اور خطبات ماجدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ "ارض القرآن" ان مقامات سے متعلق جغرافیائی معلومات پر مشتمل ہے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ "الحیوانات فی القرآن" اور "اعلام القرآن" میں علی الترتیب قرآن میں مذکور جانوروں، اور افراد و اشخاص کے بارے میں ضروری معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔ "قصص و مسائل" میں قصص کے تحت انبیا سے منسوب قصوں کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے اور مسائل کے ذیل میں قدیم علم کلام کے مسائل جدید روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ "بشریت انبیاء" میں آیات قرآنی کے حوالے سے انبیاء کی بشریت پر استدلال کیا گیا ہے۔ آخر الذکر تصنیف "خطبات ماجدی" چھ توسیعی لیکچروں کا مجموعہ ہے جن میں قرآن کی روشنی میں رسول اکرمؐ کی سیرت مبارکہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

مشاہیر سے مخصوص تصانیف میں محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق، حکیم الامت، نقوش و تاثرات اور اکبرنامہ کے نام آتے ہیں۔ "محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق"، رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی سیرت و شخصیت کا ایک پرکشش اور تابناک مرقع ہے جسے مصنف نے ذاتی مشاہدات و تاثرات کے آب و رنگ سے تیار کیا ہے۔ رئیس الاحرار سے مولانا کے تعلقات کی ابتدا ۱۹۱۲ء میں ہوئی اور ۱۹۳۱ء میں ان کی وفات تک ان میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ یہ تاثرات و مشاہدات جو پہلے ہفتہ وار "سچ" میں بالاقساط چھپتے رہے تھے اور بعد میں دار المصنفین سے کتابی صورت میں دو جلدوں میں شائع ہوئے، باہمی رفاقت کے انہی بیس سالہ دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا کے متوازن انداز تحریر پرکشش

اسلوب ادب بے مثال زورِ قلم کا یہ شاہکار تھا اردو ادب کی تاریخ میں ان کا
نام ابدالآباد تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے "حکیم الامت۔ نقوش و
تاثرات" مولانا اشرف علی تھانوی کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری
پندرہ سولہ برس میں فاضل مصنف کی گہری وابستگی اور عقیدت و نیاز
مندی کا ایک نقش جمیل اور ان کے منفرد اسلوب کا لاجواب نمونہ ہے۔
" محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق " کی طرح مولانا نے اپنے
" تجربے اور سانحے " کے نقوش بھی ہفت روزہ "صدق" میں
قسط وار قلم بند کرنا شروع کیے تھے۔ بعد میں دار المصنفین اعظم گڑھ
نے انھیں ۱۹۶۵ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ " اکبر نامہ "
میں لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی سے متعلق متفرق مضامین
جو مختلف اوقات میں لکھے گئے، یکجا کر دیے گئے ہیں۔ ان مضامین
میں ان کی شخصیت اور کلام کے کتنے ہی پہلوؤں کا بڑی خوبی کے
ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۴ء میں "ادارہ فروغ اردو لکھنؤ"
کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔

قرآن و متعلقات قرآن اور شخصیات کے ان دو مخصوص میدانوں
کے علاوہ تصنیف و تالیف کے دوسرے متعدد علمی و ادبی موضوعات
بھی مولانا کے قلمرو میں داخل رہے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں
کہ "مثنوی بحر المحبت" کی تدوین اور "خطوط ماجدی" و "مکتوبات سلیمانی"
کی ترتیب و تحشیہ سے بکثرت مختلف النوع مضامین کی تصنیف
تحریر تک ان کے خلاق ذہن اور تازہ کار قلم کی ندرت و انفرادیت
ہر جگہ نمایاں ہے۔ بلیغ اور معنی خیز اشاروں میں گفتگو، اطناب و
تفصیل کی بجائے ایجاز و اختصار کا التزام اور لطافت و نفاست
کے پانی میں بجھے ہوئے طنز کے نشتر ان کے اسلوب کی وہ خصوصیات
ہیں جو انھیں دوسرے تمام نثر نگاروں سے ممتاز کرتی ہیں۔

مولانا اردو کے ان خوش نصیب اہل قلم میں ہیں جن کی زندگی
میں ان کے علمی امتیازات کی کما حقہ، قدر کی گئی اور مختلف اعزازات
کے ذریعے ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں جب کہ
ان کی عمر صرف ۲۳ سال تھی، انھیں علامہ سید حسن بلگرامی عماد الملک
نواب علی حسن خان، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ڈاکٹر سر
ضیاء الدین اور علامہ اقبال کے ساتھ دار المصنفین کی بنیادی
کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا۔ بعد میں وہ ایک مدت تک اس کی مجلس
انتظامیہ کے صدر بھی رہے۔ اس کے علاوہ اپنے طویل دور حیات
میں ندوۃ العلماء، جامعہ عثمانیہ، مسلم یونیورسٹی، انجمن ترقی
اردو، ہندوستانی اکیڈمی اور اتر پردیش اردو اکاڈمی سے
کسی نہ کسی حیثیت سے برابر وابستہ رہے۔ مئی ۱۹۲۳ء میں
اعلیٰ حضرت نظام دکن نے بذریعہ تار حیدرآباد طلب کر کے شرف باریابی
بخشا اور ایک سو پچیس روپیہ ماہوار کی تاحیات علمی پنشن منظور
فرمائی جو انضمام ریاست کے زمانے میں وقتی طور پر معطل رہنے کے
بعد آخر عمر تک جاری رہی۔ اگست ۱۹۶۷ء میں صدر جمہوریہ ہند
نے عربی کے عالم کی سند اعزاز اور تین ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن
عطا کر کے حکومت ہند کی قدر شناسی کا حق ادا کیا۔ حکومت
یو۔ پی نے بھی سو روپیہ ماہوار کی مستقل پنشن کے ذریعہ اور اتر پردیش
اردو اکاڈمی نے وقتاً فوقتاً مختلف رقوم کی صورت میں مولانا
کی زندگی کے آخری ایام میں ان کی مالی امداد کر کے انھیں یکسوئی
کے ساتھ اپنے کاموں کی تکمیل کے مواقع فراہم کیے۔ ۱۹۷۶ء میں
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے جشن طلائی کے موقع پر انھیں
ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی جو ایک تعلیمی ادارے کی
جانب سے کسی شخص کی علمی خدمات کے اعتراف کا سب سے بڑا
ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی
کی شخصیات کے ان مختصر خاکوں کی روشنی میں بخوبی اندازہ
کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کی زندگی میں فاصلوں پر قربتیں، اور
مغائرتوں کی بہ نسبت مماثلتیں غالب ہیں۔ اسی یک رنگی و ہم آہنگی
کا سرچشمہ بجا طور پر علامہ شبلی کی ذات اور ان کی علمی تحریکات سے
دونوں کی یکساں وابستگی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ سید صاحب
تو ان کے باقاعدہ شاگرد تھے ہی، مولانا نے بھی یہ اعتراف کر کے
کہ "پڑھنا لکھنا جو کچھ آیا، اس میں بڑا دخل مولانا شبلی کا ہے۔ ان
سے بہت کچھ سیکھا۔ گویا ادبی استاد وہی تھے" خود کو اس زمرے سے

باہر نہیں رکھا ہے۔ سیاسیات میں دونوں مولانا محمد علی جوہر اور مہاتما گاندھی کے عزائم، تحریکات اور قربانیوں سے متاثر ہوئے۔ اور دونوں کے لیے تصوف کی جانب رجحان کا غلبہ اور مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت کا سلسلہ خود کو پوری طرح دین و علم کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا محرک ثابت ہوا۔ سید صاحب سے مولانا کے تعلقات کی ابتدا ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ اس زمانہ میں سید صاحب استاد کی حیثیت سے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے وابستہ تھے اور مولانا کیننگ کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ لکھنؤ میں دو ڈھائی سال تک ایک دوسرے کے ہمدم و ہم نشین رہنے کے بعد جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا حصول تعلیم کی غرض سے علی گڑھ روانہ ہو گئے اور مئی ۱۹۱۳ء میں سید صاحب نے ندوہ سے ترک تعلق کے بعد کلکتہ میں "الہلال" کے ادارۂ تحریر میں شمولیت حاصل کر لی۔ گویا ۱۹۱۲ء کے بعد مختلف نشستوں، جلسوں اور کانفرنسوں میں ایک ساتھ شرکت کے علاوہ دونوں کو کبھی ایک مرکز پر جمع ہونے اور ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن خطوط کے ذریعے علمی مسائل پر تبادلۂ خیال اور نجی معاملات میں صلاح و مشورہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ "مکتوبات سلیمانی" کی دو جلدیں جو سید صاحب کے چار سو ایک چھوٹے بڑے مراسلات پر مشتمل ہیں اسی ربط باہمی کی یادتازہ کرتی ہیں۔ حصہ اول ۱۹۶۳ء میں اور حصہ دوم ۱۹۶۶ء میں شاہی پریس لکھنؤ میں چھپ کر صدق جدید بک ایجنسی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

"مکتوبات سلیمانی" میں پہلا خط یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کا اور آخری خط شروع نومبر ۱۹۵۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے قبل کے خط پر ۱۴ جولائی ۱۹۴۹ء کی تاریخ ہے۔ گویا آخری دو خطوط کے درمیان تقریباً سوا چار برس کا وقفہ حائل ہے۔ مولانا کے ایک نوٹ سے جو انھوں نے آخری خط سے قبل تحریر فرمایا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے تمام خطوط "غائب ہو گئے"۔ اس طرح ان دونوں مجموعوں کے خطوط کو صحیح معنی میں یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء اور ۱۴ جولائی ۱۹۴۹ء کے درمیانی عرصے کی مراسلت کا حاصل سمجھنا چاہیے۔ کچھ کم سینتیس سال کی یہ مدت مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کی زندگیوں کے اہم ترین ادوار پر محیط ہے۔ ان خطوط کی سب سے نمایاں اور قابل لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ ان کی مدد سے تقریباً نصف صدی کی اس مدت کے اہم واقعات اور حالات و کوائف کا احاطہ کر کے سید صاحب اور مولانا عبدالماجد دونوں کی مستند سوانح عمریاں مرتب کی جا سکتی ہیں۔

ادب میں خطوط کی اہمیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ ان میں کبھی مکتوب نگار کی شخصیت اور کبھی مکتوب الیہ کی ذات اپنے پورے جمال و جلال، حسن و قبح اور پست و بلند کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ دلوں کی گرہیں کھلتی ہیں اور تکلفات کے نقاب اٹھتے ہیں اور اس طرح ارباب نظر کو شخصیات کے ان گوشوں تک رسائی کا موقع مل جاتا ہے جہاں سے خلوت و جلوت کے درمیان حد فاصل کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی ان خطوط کی اہمیت مسلّم ہے۔

جیسا کہ سطور ماقبل میں بیان کیا جا چکا ہے، اپنی تصنیفی و تالیفی زندگی کے ابتدائی دور میں مولانا عبدالماجد کا زیادہ تر زور قلم فلسفہ و منطق اور دیگر سماجی علوم کی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے پر صرف ہوا۔ اس قسم کے موضوعات پر قلم اٹھانے والوں کو سب سے بڑی دقت اس وقت پیش آتی ہے جب موزوں اصطلاحات اور مناسب الفاظ کی تلاش میں ان کی زبان کی تنگ دامانی قدم قدم پر ان کی راہ روکنا شروع کر دیتی ہے۔ مولانا بھی بارہا اس قسم کی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ چونکہ سید صاحب اردو کے ساتھ جدید عربی زبان و ادب پر بھی بہت گہری نگاہ رکھتے تھے اور انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقف تھے۔ اس کے علاوہ مختلف زبانوں کے مترادف الفاظ اور رائج الوقت اصطلاحوں کا ایک وسیع خزانہ ان کے ذہن میں محفوظ تھا اس لیے مولانا ایسے مواقع پر اکثر ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کی معلومات اور مشوروں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں الہلال کے شمارے میں مولانا کی زیر طبع کتاب فلسفۂ جذبات کا ایک باب حظ و کرب کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے عنوان کے دونوں لفظ "حظ" اور "کرب" انگریزی الفاظ PLEASURE اور PAIN کے بدل کے طور پر استعمال کیے گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام

نے اپنے ایک نوٹ میں مضمون نگار کی رائے سے اختلافات کرتے ہوئے "حظ" کی بجائے "لذت" اور "کرب" کی جگہ "الم" کے استعمال کا مشورہ دیا تھا۔ اس اختلاف رائے نے ایک مستقل بحث کی صورت اختیار کرلی حتیٰ کہ مولانا عبداللہ عمادی کے الفاظ میں لوگ اس تکرار سے بدحظ ہونے لگے۔ مولانا نے اس باب میں سید صاحب سے جو اس زمانے میں الہلال سے منسلک تھے ان کی ذاتی رائے معلوم کی۔ اس استفسار کے جواب میں ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"میری رائے اس مسئلے کی نسبت یہ ہے کہ ..... یقیناً قدیم اور محفوظ زبانِ عرب میں "حظ" بمعنی مسرت و شادمانی نہیں آیا۔ لیکن تطوّر و تقلّب سے زبان بھی خالی نہیں جیسا کہ علم الالسنہ میں محقق ہے۔ "حظ" کے اصل معنی بہرہ اور حصہ کے ہیں۔ اس کے بعد بمعنی قسمت مستعمل ہوا جیسا کہ اس کے مرادف الفاظ مثلاً "نصیب" اور "قسمت" وغیرہ مستعمل ہیں کہ ان کے اصل معنی درحقیقت حصہ کے ہیں اور آج کل عام طور سے سوءالحظ اور حسن الحظ بولتے ہیں۔ فارسی میں بھی "حظ" بمعنی قسمت و تقدیر آیا اور یہیں سے خصوصاً حسنِ قسمت و تقدیر میں مستعمل ہو کر خوشی و مسرت کے معنی میں آگیا اور اسی پر صائب کا دوسرا مصرعہ دال ہے جس پر الہلال کا عمل ہے یعنی ..... حظوظِ نفس کے پابند[1] ..."

جس زمانہ میں "حظ و کرب" کے موضوع پر سلسلۂ بحث جاری تھا "الہلال" ہی کے کسی شمارے میں وضع اصطلاحات سے متعلق سید صاحب کا ایک مضمون بھی شائع ہوا تھا۔ مولانا نے اس مضمون سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تجربات کی بنیاد پر ان کے وضع کردہ اصولوں میں سے بعض میں جزوی ترمیموں کی تجویز پیش کی تھی اور بعض کے انطباق میں متوقع دشواریوں کے حوالے دے کر ان پر مزید غور و فکر کی جانب توجہ مبذول کرائی تھی۔

۲۶ر اکتوبر کے اسی مکتوب میں ان تمام امور کا احاطہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

"(۱) اصولِ اوّل یعنی "یات" اور علم کے الحاق و اضافہ سے میں متفق ہوں ... آئندہ اس کی اصلاح کر لوں گا۔

(۲) ہم کو درحقیقت دو صفت کی نہیں، تین صفت کی ضرورت ہے۔ نفسی (یعنی متعلق بہ نفس)، نفسیّ (یعنی متعلق علم النفس) اور نفسیّی (یعنی عالم علم النفس) انگریزی میں جہاں تک مجھے علم ہے، اوّل و دوم کے لیے ایک لفظ ہے مثلاً NATURE سے NATURAL دونوں کے لیے بلا امتیاز اور تیسرے کے لیے NATURALIST۔ پس عربی میں بھی اوّل و دوم کے لیے بلا امتیاز ایک ہی لفظ رکھیے۔ امتیاز اس طرح پیدا ہوگا کہ علوم و فنون میں جب نفسی کا لفظ آئے گا تو دوسرے معنی سمجھے جائیں گے اور عام گفتگو اور آداب لسان و لغت میں اوّل جیسا کہ خود انگریزی میں ہے۔

تیسرے معنی کے لیے نفسیاتی اور طبعیاتی رکھیے کہ عالم علم النفس اور نفسیات داں بڑا لفظ ہے۔ آپ کے عربی داں دوست کی تحقیق صحیح ہے لیکن آج کل پیشہ کے لیے، جیسا کہ میں نے کہا کہ نفسیاتی کو عالم علم النفس کے معنی میں لیتا ہوں، بولتے ہیں۔ آج کل نہیں بلکہ جب سے گھڑی مسلمانوں میں موجود ہے یعنی دوسری صدی سے گھڑی ساز کو "ساعاتی" کہتے ہیں جو ساعت بمعنی وقت کی جمع اور پھر منسوب ہے۔

(۳) اس تفصیل کے بعد تیسرے سوال کا جواب شاید میرے لیے ضروری نہیں پھر بھی امتثالاً للامر میں عالم نفسیات کو نفسیات داں سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ دوسرا لاحقہ مبتذل اور پامال، اور اردو میں بمعنی ظرف کثیر الاستعمال مثلاً پان دان، جامہ دان، جزدان وغیرہ۔

---

[1] صائب کا پورا شعر یہ ہے۔
ثنائے خود بخود گفتن نمی زیبد ترا صائب — حظوظِ نفس کے پابند جو زن پستان خود مالد

اصطلاح سازی کے فن میں سید صاحب کو کسی حد تک درک حاصل تھا اور انھوں نے اس کام میں کسی حد تک مولانا کی مدد اور رہنمائی کی، یہ اندازہ کرنے کے لیے مختلف خطوط سے کچھ اور اقتباسات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنی کتاب "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" کے ترجمے کے سلسلے میں "لیڈر" اور "ڈیماگاگ" (DEMAGOGUE) کے لیے "قائد" اور "زعیم" کے الفاظ انتخاب کئے تھے لیکن وہ اپنے اس انتخاب سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے "زعیم" کی بجائے ایک اور لفظ "سرغنہ" بھی ان کے پیش نظر تھا۔ ان دو الفاظ میں سے حتمی طور پر کسی ایک کو ترجیح دینے میں ان کے تذبذب کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی لفظ بھی اصل انگریزی لفظ کے مفہوم پر پوری طرح حاوی نہیں۔ بالآخر کسی صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے انھوں نے سید صاحب کی طرف رجوع کیا اور انھوں نے اپنے جواب سے یہ مشکل آسان کردی فرماتے ہیں :-

"قائد بینک لیڈر کا صحیح ترجمہ ہے DEMAGOGUE کے لیے ایک لفظ مشکل سے ملے گا۔ سرغنہ میں فساد کا عنصر شامل ہے۔ طلاقتِ لسانی وعام فریبی نہیں ہے۔ قدیم عربی میں ایک لفظ مِلْذ رہ ہے جس کے معنی "سید القوم و لسانہم" ہیں۔ ایک لفظ "زعیم" ہے اور یہ کسی قدر اردو میں معروف بھی ہے۔ اسی کو اس معنی میں استعمال کرنا چاہیے۔ اور تقریباً آپ نے مفہوم کے مطابق کیا ہے اس کے لغوی معنی ہیں "سردار یا بلند آواز سخن گوینده از طرفِ ایشان"....." (مکتوب مورخہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۳ء)

مولانا کو مناسب اصطلاحات اور موزوں الفاظ کی ضرورت دو زیر تصنیف کتابوں "فلسفۂ جذبات" اور "فلسفۂ اجتماع" کے سلسلے میں پیش آرہی تھی اور یہ ضرورت مسلسل و متواتر تھی کیونکہ مسئلہ چار چھ یا دس بیس مترادفات کی تلاش اور ترکیبوں کے اختراع کا نہیں۔ متعدد اور مختلف النوع بنیادی، ذیلی اور ضمنی مباحث کے لیے بکثرت الفاظ کے انتخاب کا تھا۔ فارسی اس معاملہ میں اردو سے زیادہ مجبور تھی اور مصر کے بعض علمائے نفسیات نے جو اصطلاحیں وضع کی تھیں، وہ اپنی معنوی تنگ دامانی کے باعث نہ عربوں میں مقبول ہو سکی تھیں اور نہ مولانا ان سے مطمئن تھے۔ اس لیے وہ ہر ہر قدم پر سید صاحب سے رجوع کرتے اور ان سے مشورہ طلب کرتے تھے، گویا اس پر پیچ وادی میں یہی ایک ذات تھی جو ان کے لیے دلیل راہ اور نشان منزل بنی ہوئی تھی۔ ۶ر نومبر ۱۴ ۱۹ء کے خط میں ایسے ہی ایک استفسار کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"لفظ "روح الاجتماع" خود مصر میں معروف علیہ ہے میری اصلی رائے تو یہ ہے کہ نفسیات کی دو قسمیں قرار دی جائیں۔ نفسیات فردیہ، اور نفسیات جمیعہ۔ COLLECTIVE PSYCHOLOGY کے لیے صحیح مفہوم کی تعبیر دوسرا لفظ کرتا ہے۔

فلسفۂ اجتماع یا اسرار جماعات کو گو مقصود سے وسیع تر مفہوم رکھتے ہے تاہم فلسفۂ اجتماع اسرار جماعات سے رواں تر ترکیب ہے۔ بجائے اسرار اگر سِرّ استعمال کیا جائے تو زیادہ روانی ہوگی۔ مثلاً سِرّ الاجتماع، سِرّ الجماعات، سِرّ المجتمعات

ایک مدت تک ترجمہ نگاری سے مسلسل سابقے کی بنا پر مولانا کو الفاظ و مصطلحات کی تحقیق کا چسکا سا پڑ گیا تھا۔ چنانچہ اپنے مخصوص دائرہ کار کے باہر بھی جب کبھی کوئی نامانوس لفظ یا نئی اصطلاح ان کے سامنے آتی تو وہ اس کے محل استعمال اور ہیئت و معنویت پر غور کرتے۔ اگر کوئی اشتباہ ہوتا تو حسب دستور سید صاحب کے سامنے پیش کرتے اور ان کی تحقیق سے مستفید ہوتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد حیدرآباد میں گریجویٹ کے لیے طیلسانی کی اصطلاح عام طور پر استعمال ہونے لگی تھی۔ مولانا کا ذہن اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا کیونکہ "حدیث کے ابواب فتن میں "طیلسا نیئن" کا ذکر محلِ ذم میں آیا ہے یعنی پیروانِ دجال کے لیے"۔ سید صاحب نے اس ضمن میں ان کے استفسار پر ۲۹ر اگست ۱۹۲۷ء کے مکتوب میں اس اصطلاح

کے مصدر و ماخذ کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ قدیم و جدید عربی زبان کے یکساں عبور اور استحضار علم کی مظہر ہے لکھتے ہیں :۔

"طیلسان ایک چھوٹی سی چادر ہوتی ہے جو عمامہ کے اوپر سے دونوں کندھوں پر اوڑھ لی جاتی ہے۔ شیعہ مجتہدین کو تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ مغربی علماء (تونس والجزائر) میں اب تک مروج ہے۔ یہ طریقہ لباس علماء کے امتیاز کی غرض سے قاضی ابو یوسف صاحب نے اختیار کیا تھا۔ بعد کے علماء نے اس کی تقلید کی۔ اس طرح طیلسانی عالم کے معنی میں مستعمل ہوا۔ مصر کے موجودہ لٹریچر میں اس کا استعمال کثرت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو حیدرآباد والوں نے کیوں اختیار کیا؟"

وضع اصطلاحات اور تحقیق الفاظ کے علاوہ دوسرے بہت سے معاملات و مسائل میں بھی سید صاحب برابر اپنے فاضل دوست کی رہنمائی اور ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔ "معارف" کے اجرا کے کچھ دن بعد ہی انھوں نے اس کی ترتیب و تہذیب کے سلسلے کی بعض ذمہ داریاں اعزازی طور پر مستقلاً مولانا کے سپرد کر دی تھیں۔ اس ضمن میں مختلف علمی موضوعات اور وقتی مسائل پر مفصل مضامین کے علاوہ شذرات، اخبار علمیہ، ترجمہ اور تلخیص و تبصرہ کے لیے ہر مہینے چار چھ صفحات لکھتے رہنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ مولانا کے اس تعاون کو سید صاحب لفظاً و معناً ادارے کی خوش قسمتی اور ان کے گرانقدر مضامین و مقالات کو رسالے کے وزن و وقار کی ضمانت تصور کرتے تھے، لیکن ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے اختیارات کے استعمال اور ذمہ داریوں کی تکمیل میں کسی تساہل یا رواداری سے کام لینا ان کی افتاد طبیعت کے خلاف تھا۔ چنانچہ اگر انھیں مولانا کے کسی نقطۂ نظر یا ذاتی رائے سے اصولاً یا پیشہ ورانہ مصالح کی بنا پر اختلاف ہوتا تو وجوہ کی وضاحت کر کے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے یا کسی تحریر میں ضابطوں کے تقاضے یا مواد اور لہجے کے اعتبار سے کوئی ترمیم مقصود ہوتی تو نہایت دل نشین انداز میں اس کی طرف توجہ منعطف کراتے تھے۔ ۱۱ر اگست ۱۹۱۶ء کے خط میں شذرات اور اخبار علمیہ کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"شذرات اور اخبار علمیہ کی طرز تحریر میں ذرا فرق ہونا چاہیے۔ اخبار علمیہ چھوٹے، سادے اور بلا اظہار رائے ہوں۔ شذرات مع اظہار رائے، رنگین اور چیٹ پٹا ہو۔ علم کائنات سے معافی چاہتا ہوں کہ سورج کو چراغ دکھانے کی جرأت کرتا ہوں۔"

مولانا کی شادی ۱۷ر جون ۱۹۱۶ء کو اس وقت کے رسم و رواج کے بالکل برخلاف ان کی اپنی پسند کے مطابق ہوئی۔ اس سے کچھ پہلے ان کے مزاج کی "شعریت ابھرنا شروع ہو گئی تھی"۔ اس زمانے میں انھوں نے جو غزلیں کہیں وہ عاشقانہ جذبات سے مملو ہوتی تھیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء میں سیاست سے دلچسپی کے آغاز کے ساتھ ان میں رفتہ رفتہ سیاسی رنگ بھی شامل ہو گیا۔ غزل ہر دور میں عصری میلانات اور سیاسی و عمرانی مسائل کی ترجمانی کرتی رہی ہے۔ اس لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اس صنف کا اپنا ایک مزاج ہے جو مخصوص رموز و علائم کا پابند رہتا ہے اور اسکات انداز میں گفتگو کا متحمل نہیں ہوتا۔ مولانا نے اس روایت کو نظرانداز کر کے ایک غزل میں کچھ سیاسی مضامین کھلے طور پر نظم کر دیئے تھے۔ سید صاحب اس واعظانہ بے پردگی کو تہذیب غزل کے منافی قرار دیتے ہوئے ۲۲ر اگست ۱۹۱۷ء کے مکتوب میں مولانا کو اس سے احتیاط کی جانب ان الفاظ میں متوجہ کرتے ہیں :۔

"ناظر کی غزل خدا "حاضر ناظر" ہے، داد سے مستغنی ہے۔ لیکن پالیٹکس کو کلمات وعظ کی طرح بے پردہ نہ ہونا چاہیے۔"

۱۹۲۱ء کے اواخر میں مولانا نے ایک نعتیہ غزل معارف میں اشاعت کے لیے بھیجی۔ ان کے اپنے الفاظ میں "اس میں علاوہ زبان و محاورہ کی غلطیوں کے مضامین بھی پست و مبتذل سے تھے۔ قوالی کی محفلوں میں جس طرح کی غزلیں چلی ہوئی تھیں بس انھیں کی نقالی تھی"۔ سید صاحب کو انھیں نقائص کی بنا پر مولانا سے اس غزل کا انتساب نامناسب معلوم ہوا اور انھوں نے

ان کی ناگواری اور دل شکنی کے تمام اندیشوں کو نظر انداز کرکے اسے یکسر مسترد کردیا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے مولانا کا اس فیصلے کو خوش دلی اور خاموشی کے ساتھ قبول کرلینا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ آئندہ خط میں انھوں نے اپنی ناخوشی کا اظہار کرکے سید صاحب کے لیے ایک تکلیف دہ اور مشکل صورت حال پیدا کردی۔ بالآخر ملاطفت و دلدہی کے ساتھ فہمائش کا حربہ جو ان کی معاملہ فہمی اور مصلحت شناسی کے ترکش کا سب سے موثر تیر تھا ان کے کام آیا اور انھوں نے مولانا کے مرتبۂ علمی اور حق رفاقت کے مطابق اس طرح ان کے جذبات کی جراحتوں پر مرہم رکھ کر اپنی بزرگی کا حق ادا کیا :۔

"آپ کے والا نامہ کے بعد جس میں کافی اثر نمایاں تھا۔ میں نے آپ کی غزل دوبارہ سہ بارہ پڑھی۔ معارف کی خاطر نہیں، بلکہ آپ کی خاطر میں اس کی نسبت آپ کی طرف نہ کرسکا۔ اس میں متعدد اوہام مجھے ہیں۔ واپس اس لیے نہیں بھیجی کہ میں سمجھا تھا کہ آپ کے پاس اس کی نقل ہے "بار دیگر" والا شعر تو صاف کھٹکتا ہے۔ بایں ہمہ اپنے جرم پر نادم ہوں اور فرمائیے تو شائع کردوں "کفارہ ہمیں سہل است و شکستن دلِ دوستاں مشکل" مجھے دل شکستہ نہ سمجھیے بلکہ میرے بہت سے گناہوں سے چشم پوشی کیجیے یہ الفاظ میرے سچے دل کے ہیں، ان سے کچھ اور مراد نہ لیجیے گا"

۱۹۲۰ء کے اواخر میں عدم تعاون کی تحریک پورے زور شور سے جاری تھی۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقا بھی اس تحریک میں مہاتما گاندھی کی ہم نوائی و رفاقت میں پیش پیش تھے۔ اور ان لوگوں نے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہی میں جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک علیحدہ ادارہ بھی قائم کرلیا تھا۔ اس ادارے کے بانیوں اور مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے درمیان نظریاتی اختلافات کی جو خلیج حائل تھی وہ بھی کبھی آپس میں تند و تیز قلمی جنگ اور تلخ و ترش انداز گفتگو کا سبب بن جاتی تھی۔ انھیں اثرات کے تحت مارچ ۱۹۲۲ء کے معارف میں شذرات کے ذیل میں بعض ذمہ داران علی گڑھ خصوصاً نواب سر مزمل اللہ خاں کے متعلق کچھ ایسے فقرے لکھ دیے تھے۔ جو متانت و ثقاہت سے بعید اور معارف کے صحافتی معیار کے خلاف تھے۔ سید صاحب نے ان کی اشاعت روک دی اور مولانا کو مطلع کیا کہ

"میں نے اور میرے احباب مخلص نے آپ کے "راجہ اندر سبھا" کو پسند نہیں کیا۔ میں نے اس کی جگہ اپنی طرف سے مسلم یونیورسٹی پر کچھ ریمارک کیے ہیں۔ ملاحظہ سے گزریں گے آفتاب احمد خاں کو خطاب کیا ہے"

(مکتوب مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۲۲ء)

۱۹۴۰ء میں مولانا نے اردو میں قرآن کے ترجمے اور تفسیر کا کام شروع کیا۔ سید صاحب کی یہ خواہش تھی کہ ان کی یہ کوشش ہر اعتبار سے منفرد اور ان کے شایان شان ہو۔ اگرچہ عمر، مطالعے تجربے اور مشق کے اعتبار سے یہ مولانا کی پختگی کا دور تھا اور اس منزل تک پہنچتے پہنچتے عموماً فکر کی ایک نہج اور طریقۂ کار کا ایک معیار مقرر ہوجاتا ہے جس میں کسی تبدیلی کی گنجائش کم ہی رہتی ہے۔ تاہم سید صاحب بعض معاملات میں مولانا کے تقشف انتہاپسندی اور مناظرانہ انداز کلام کی وجہ سے کسی وقت بھی ان کی اصلاح اور رہنمائی کے خیال سے غافل نہیں رہنا چاہتے تھے۔ قرآن کا معاملہ دنیا کی عام کتابوں سے مختلف ہے۔ فصاحت و بلاغت کے پورے لوازم اور خطابت کے تمام آداب کے ساتھ نرم و شیریں لہجے اور دلکش انداز میں اپنا پیغام مخاطبین و قارئین تک پہنچانا اس کی اہم ترین اور مستقل خصوصیت ہے۔ لہٰذا مترجم اور مفسر کا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے ترجمے اور تفسیر میں جہاں تک ممکن ہو، اس خصوصیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔ سید صاحب نے اس اہم اور ذمہ دارانہ کام کے سلسلے میں مولانا کو دوسرے امور کے علاوہ اس طرف بھی متوجہ کیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۰ء کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"آپ نے تفسیری حواشی بڑھانے کی خدمت اپنے ذمہ لی

ہے تو میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ وہ حواشی آپ کے مرتبہ کے لائق ہوں۔ شبہات جدیدہ کا جواب دینا ضروری ہے۔ پھر سب سے پہلے عامۃ الورود مسائل پر ایک محققانہ مقدمہ لکھئے جس میں وحی، نزول وحی، روح، معجزات و خرق عادت و مکالمۂ الٰہی پر پوری فلسفیانہ ذمہ داری سے گفتگو فرمائیے۔ طرز مناظرہ کا نہ ہو، تفہیم کا ہو۔"

سید صاحب مولانا سے بعض اصولی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ہمیشہ ان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کے معترف اور بے مثال زور قلم کے مداح رہے اور برابر اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ وہ کسی طرح دارالمصنفین کی کوئی خدمت قبول کر کے اعظم گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کر لیں لیکن مولانا نے ذاتی مصلحتوں کی بنا پر اس پیشکش کے جواب میں کبھی مثبت رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برخلاف جب صاحبزادے آفتاب احمد خاں نے انھیں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے اسے بلا تامل قبول کر لیا۔ مولانا نے بربنائے "مجبوبیت" سید صاحب کو اس تقرر کی اطلاع نہیں دی لیکن جب مولانا عبدالباری ندوی کے خط سے انھیں اس کا علم ہوا تو وہ ارباب علی گڑھ کی خوش قسمتی اور اپنی محرومی کے اس تجربے سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ اپنے جذبات حسرت و تاسف کے اظہار اور پیغام تہنیت کے لیے مولانا کو از خود ان الفاظ میں مخاطب کیا :-

"مولوی عبدالباری کا ایک طویل خط آیا ہے کہ آخر مسٹر عبدالماجد ہاتھ سے جاتے رہے لیکن انھیں کیونکر سمجھاؤں کہ اس غریب مجلس کے حسن و جمال عالی شان نہیں۔ بہرحال اس نئی خدمت پر جو آئندہ کے لیے زینہ ہے، مبارکباد دیتا ہوں۔

"اہل کنشت" "اہل کعبہ" کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ آخر جنت علمی کا بہترین حوری نژاد انھیں کے حصہ میں آیا۔" (مکتوب مورخہ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء)

چوبیس سال کی مختصر اور ناپختہ عمر میں کسی شخص کی تفضیلت علمی کا اس سے بڑھ کر اور کیا اعتراف ہو سکتا ہے کہ اسے "جنت علمی کا بہترین حوری نژاد" قرار دیا جائے۔ سید صاحب کی یہ رائے کسی جذباتی رد یا وقتی تاثر کا نتیجہ نہیں تھی، اس کے پیچھے ان کا عمیق مشاہدہ اور گہری بصیرت کارفرما تھی۔ وہ مولانا کے مضامین اور ان کی کتابیں شروع ہی سے اشتیاق اور توجہ کے ساتھ پڑھتے رہے تھے اور ان کے مطالعے سے انھیں اپنے کم عمر مگر بالغ نظر دوست کی عبقریت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اظہار رائے میں کسی بے جا حمایت اور پاسداری کے عادی نہیں تھے بعض مضمون یا کتاب میں جو خامیاں اور کوتاہیاں نظر آتیں ان پر دو ٹوک الفاظ میں تنقید کرتے اور جو قابل تعریف پہلو ہوتے ان کی بھرپور داد دیتے تھے۔ اس غیر جانبدارانہ انداز نظر نے ان کے تاثرات میں ایک وزن اور وقار پیدا کر دیا ہے۔ "فلسفۂ جذبات" کے بعد "فلسفۂ اجتماع" مولانا کی دوسری مکمل تصنیف تھی جو ۱۹۱۵ء میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوئی۔ سید صاحب نے اسے "فلسفۂ جذبات" سے زیادہ پسند کیا۔ ۵ فروری ۱۹۱۶ء کے مکتوب میں اس ترجیح کی وجوہات اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ ایک کتاب پر اظہار خیال کے ساتھ بالواسطہ دوسری پر بھی تبصرہ ہو گیا ہے اور دونوں کی خوبیاں اور خامیاں کھل کر سامنے آ گئی ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"باپ کی محبت بھری آنکھوں میں اس کے تمام بچے یکساں نظر آتے ہیں۔ تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ فطرت کی فیاضی ہر ایک کے ساتھ یکساں نہیں ہوتی۔ آپ کے فرزندانِ طبع میں سے منجھلا (فلسفۂ اجتماع) بڑے (فلسفۂ جذبات) سے زیادہ مجھے عاقل اور ہوشیار نظر آتا ہے۔ روانی عبارت، تسلسل بیان، کثرت مواد ہر حیثیت سے فلسفۂ جذبات سے بہتر ہے۔"

مولانا کا شمار اردو کے صاحب طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے۔ ان کے اسلوب کی کچھ منفرد خصوصیات ہیں جو انھیں دوسرے تمام نثر نگاروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اسلوب کی یہ انفرادیت بڑی حد تک کثرت مشق اور

امتدادِ وقت سے وجود میں آتی ہے لیکن اس کے آثار ابتدا ہی میں نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ مولانا کی نثر کی بھی شروع سے یہی کیفیت تھی کہ اس کے توسط سے انھیں بہ آسانی پہچان لیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کے رسالے میں ڈراما "زود پشیماں" جو مئی ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ سے بمبئی تک کے سفر کے دوران بڑی روا روی میں لکھا گیا تھا، مولانا کے اپنے نام کی بجائے "ناظر" کے فرضی نام سے شائع ہوا جب یہ ڈراما سید صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اس کے اصل مصنف کو بیک نظر پہچان لیا۔ قریب زمانے کے ایک خط میں جس پر کوئی تاریخ درج نہیں اس پہچان کے تذکرے، ڈرامے کی تعریف اور بعض اصلاحات کی تجویز کے ساتھ بڑے موثر اور مخلصانہ انداز میں یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ آپ کو اپنی توجہات مختلف المذاق قارئین کی ضیافتِ طبع پر صرف کرنے کی بجائے قدر دانوں کے کسی ایک حلقے کے لیے مخصوص کر دینا چاہییں۔ فرماتے ہیں :۔

"زود پشیماں" کے مصنف کو میں نے بہت جلد پہچان لیا۔ اتنے اشخاص ہیں کہ جن کی تحریر کی ایک ایک سطر میں پہچانتا ہوں، شبلی، نذیر احمد، ابوالکلام، عمادی، ماجد؛ شاید آپ بھی یہی الزام مجھ پر قائم کریں۔ میں آپ کی اس ادبی کامیابی پر صمیم قلب سے مبارکباد دیتا ہوں۔ اگر قلتِ ضخامت و صفحات کوئی عیب نہ ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی ڈراما علم اور فن کی حیثیت سے ہماری زبان میں نہیں لکھا گیا۔ غزلیں بھی نہایت ..... سنجیدہ و ردوال ہیں۔ خیالات غالب دعوتی سے ٹکراتے ہیں۔ کہیں کہیں نظرِ ثانی اور حلِ تعقید کی ضرورت ہے۔ آپ کی اثارِ صفتِ ذات کن کن بیماروں کو شفا دے گی۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے بیماروں کے حلقہ پر ایک تنقیدی نظر ڈالیے، جو سب سے زیادہ قابلِ رحم بیمار نظر آئے اپنے کو اس کے حوالے کر دیجیے۔"

"قابلِ رحم بیمار" سلیمان ۔ (مکتوب نمبر ۳۴)

مولانا اپنی آزاد خیالی اور الحاد پرستی کے دور میں مغرب سے اس حد تک متاثر و مرعوب اور مستشرقین سے یہاں تک برگشتہ و بدظن تھے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں علوم و فنون کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان کے اعتراف کی بجائے انھیں ان کے دفترِ اعمال میں ناکامیوں اور نارسائیوں کے علاوہ کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ اس قسم کے خیالات کا وہ اپنے خطوط میں وقتاً فوقتاً اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں ڈرامائی لٹریچر سے اسلامی ادب کی تہی دامنی کا ذکر کرتے ہوئے، اس کے اسباب و علل کے ذیل میں غالباً اہلِ یورپ کی یہ دلیل دہرائی تھی کہ "درحقیقت مسلمانوں کے عقیدۂ تقدیر نے ان میں نہ سنس آف ٹریجڈی پیدا ہونے دیا اور نہ سنس آف کامیڈی، اس لیے اکثر فنونِ لطیفہ کی طرح وہ اس فن سے بھی نابلد رہے"۔ اس کے جواب میں سید صاحب نے تقدیر کے اعتقاد کی صرف مسلمانوں کے ساتھ تخصیص کو تاریخِ مذاہب اور فلسفۂ قدیمہ سے جہل کا ثبوت اور موسیقی، شاعری اور مصوری و فنِ تعمیر میں ان کے عظیم الشان کارناموں کو نظر انداز کر کے محض ڈرامے سے عدمِ دلچسپی کی بنا پر اس قسم کی الزام تراشیوں کو انتہائی لغو اور مضحکہ انگیز قرار دیا تھا۔ عام روش کے برخلاف اس خط میں سید صاحب کا لہجہ کسی قدر درشت اور تند و تیز ہو گیا تھا اور یہ بات تالیفِ قلب اور "حکمت و موعظتِ حسنہ" کے ان مقتضیات کے منافی تھی جن پر وہ اپنے رفیق اینق کی اصلاح کے لیے اب تک کاربند رہے تھے۔ چنانچہ اگلے خط میں انھوں نے اس اندازِ گفتگو پر جس طرح معذرت چاہی ہے، اس کا ایک ایک لفظ ان کی عالی ظرفی، بلند نگاہی اور دردمندی کا شاہد اور دلداری و دلنوازی کے اہتمام کا حامل ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"گذشتہ خط میں اگر اعتدال سے زیادہ کوئی لفظ قلم سے نکل گیا ہو تو عفو طلب ہوں۔ یورپ کے مسلسل اکاذیب اور استلزامات سے وہ برہمی تھی۔ آپ کی شخصیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یقین جانئے کہ ہماری جماعت کا ہر شخص آپ سے خلوص برادرانہ رکھتا ہے"۔

(مکتوب مورخہ ۴ جولائی ۱۹۱۵ء)

مولانا علم نفسیات سے اپنے غیر معمولی شغف کی بنا پر ۱۹۱۵ء کے اواخر میں "سائکالوجی آف دی قرآن" کے موضوع پر کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ سید صاحب کو اندازہ تھا کہ اس میدان میں قدم رکھنے کے بعد تحیر دلنیاری اور عقلیت پرستی کی رو انھیں کہاں سے کہاں لے جائے گی لیکن نہ تو وہ ان کے تصنیفی مشاغل میں کسی قسم کے تعطل کے روادار تھے اور نہ یورپ کے مفروضاتِ ذہنیہ کی تائید میں ان کے زورِ قلم کے زیاں کو خاموشی کے ساتھ گوارا کر سکتے تھے۔ اس لیے نہایت محتاط اور ملتجیانہ انداز میں مشورہ دیتے ہیں کہ

"نفسیات القرآن لبشوق لکھیے لیکن داد دینے کے لیے نہ عیب جوئی کے لیے۔ قرآن میں نفسیات کا جو گر ہے وہ شاید ہی ہو جس کو آپ تحریکِ نفس بذریعہ خطابیات و دعوتِ متلذذات کہیں گے۔ بہر حال اگر آپ اسلام کی حمایت کا اس سے کام لیں گے تو خدارا جلد لکھیے اور اگر کچھ اور نیت ہے تو اس امتِ مرحومہ پر للہ رحم فرمائیے جو خود ہی مر رہا ہو اس کو ماریے۔" (مکتوب مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۱۵ء)

الحاد و دہریت کے اسی دورِ شباب میں مولانا کا ایک مضمون بعنوان "مذہب اور ارتقائے تمدن" رسالہ "زمانہ" کانپور میں شائع ہوا تھا جس میں "مذہب کی عملی افادیت کو نمایاں کیا گیا تھا"۔ سید صاحب کی نگاہ میں "ایک ملحد کے قلم سے مذہب کی یہ حمایت" ایک قسم کے فکری انقلاب کا پیش خیمہ تھی چنانچہ انھوں نے اس کی بھرپور داد دی۔ ان کا یہ نسجِ اعجاز مختصر خط کل تیرہ الفاظ پر مشتمل اور بلاغتِ کلام کا ایک بے مثل شاہکار ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بنام نگارندہ

"مذہب اور ارتقائے تمدن"

غازی چو توئی۔ راست کافر بودن" (مورخہ مارچ ۱۹۱۵ء)

مولانا کو اپنی ابتدائی زندگی میں علمی کاموں میں انہماک کی ترغیب سب سے زیادہ علامہ شبلی سے ملی لیکن اپنی کم عمری اور نومشقی کے باوجود نہ تو وہ ان کے مرتبۂ علمی سے مرعوب ہوئے اور نہ انھوں نے ان کی شخصیت کو تنقید سے بالاتر سمجھا۔ ان کا حاسۂ انتقاد جو منطقیانہ استدلال سے مربوط تھا، انھیں برابر ہر مسئلے کی آزادانہ تحقیق اور ہر معاملے میں بطور خود غور و فکر کی طرف مائل کرتا رہتا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں الکلام پر ان کی تنقید جس نے علامہ شبلی کو بھی ان کے ذوقِ تحقیق کے اعتراف پر مجبور کر دیا اسی رجحان کی آئینہ دار تھی۔ چار سال کے بعد ۱۹۱۴ء میں جب انھوں نے شعر العجم کو توجہ کے ساتھ پڑھا اور فنِ شعر سے متعلق اس کے بہت سے بیانات "مقدمۂ شعر و شاعری" کی صدائے بازگشت معلوم ہوئے تو سید صاحب کو اس توارد کی طرف متوجہ کرتے ہوئے، اس پر تنقید لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سید صاحب اس سلسلے میں حالی اور شبلی دونوں کے مبلغِ علم سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور یہ دونوں کتابیں لکھ کر ان بزرگوں نے اپنے اپنے میدان میں بنیادی نوعیت کے جو کارنامے انجام دیے ہیں، ان کی اہمیت کا بھی انھیں بخوبی اندازہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ اس دور کے عام اردو دانوں میں تنقید اور عیب جوئی میں امتیاز کی صلاحیت معدوم اور متوازن ادبی نظریے شخصیات کی قدر و منزلت کے تعین کا تصور مفقود تھا، اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس قسم کی بحثیں اٹھا کر کسی لاحاصل معرکہ آرائی کی ابتدا کی جائے اور اس کا ذمہ دار ایک ایسا شخص قرار پائے جو ان کا عزیز اور محترم دوست ہو۔ چنانچہ اپنے جوابی مکتوب مورخہ ۶ نومبر ۱۹۱۴ء میں موضوعِ بحث کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شعر العجم اور مقدمۂ حالی کا توارد مطالب اس لیے تعجب انگیز نہیں کہ دونوں ایک ہی سرچشمہ سے ہیں۔ علوم و فلسفات کی بحث میں توارد تعجب انگیز نہیں بلکہ ان کی صحت کی دلیل ہے۔ ارسطو نے شاعری پر جو کچھ لکھا ہے کہ وہ دونوں کے لیے دلیلِ راہ ہے۔ اب تو للہ طالب علمانہ نزاعات سے اوپر بڑھیے، ان کا نوٹس میں کب تک الجھیے گا۔

اور وداں پبلک تنقید و تنقیح میں ابھی فرق نہیں کر سکتی اس لیے کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم۔"

اس اقتباس کے آخری جملے میں کسی موضوع پر اظہارِ خیال کے وقت مخاطبین کی فکری سطح کو ملحوظ رکھنے کا جو مشورہ دیا گیا ہے وہ ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے اس اصول کی خلاف ورزی بعض اوقات ایسے نزاعات کا موجب بن جاتی ہے جو تضیعِ اوقات اور ناخوش

گوارگی و بدمزگی پر منتج ہوتے ہیں مولانا ایسی ہی ایک صورت حال سے ۱۹۴۳ء میں اس وقت دوچار ہوئے جب انھوں نے ایک فلم کے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات کا صدق کے صفحات میں بالاعلان اظہار کیا۔ اس زمانے میں عوام کی نگاہ میں ان کی حیثیت ۱۹۲۰ء سے قبل کے مسٹر عبدالماجد سے بالکل مختلف تھی۔ قرآن کے ایک مترجم و مفسر کی سینما سے دلچسپی اور اخبار کے ذریعے اس کا اعلان واشتہار یقیناً ایک ایسی جسارت تھی جسے لوگ آسانی سے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ خود مولانا کے الفاظ میں "ملک میں ایک آگ سی لگ گئی اور تفسیق سے گزر کر نوبت کہیں کہیں تکفیر تک کی آ گئی"۔ سید صاحب نے اس موقع پر بھی حسب دستور دلجوئی و ہمدردی کے ساتھ فہمائش کا حق ادا کیا اور صدق کے مندرجات کے سلسلے میں ایک لطیف توجیہ سے کام لے کر تالیف قلب کے ذریعے اصلاح کی صورت نکالی۔ مکتوب مورخہ ۱۳ر مئی ۱۹۴۳ء میں لکھتے ہیں:۔

"تماشائے سینمائی کو آپ فسق جانتے ہیں، اس پر بھی آپ نے اس اعترافِ فسق کی جو جرأت پائی، یہ خود ایک نوع کی توبہ ہے۔ اس گناہ کا علی الاعلان اقرار کیا اور نکتہ چینیوں کی پروا یا اپنے جاہ و شہرت کو صدمہ پہنچنے کا وہم گمان نہ کیا تاہم مجھے آپ سے ان معاملات میں اختلاف ہے۔ نیت کیسی ہی اچھی ہو مگر فعل قبیح نیت کی تحسین سے حسن نہیں ہو سکتا۔ شراب میں پانی اگر اتنا ملا دیا جائے کہ وہ مسکر نہ رہے تو شاید فقہا اس کے جواز کا فتویٰ دیدیں۔ مگر اہل سلوک اور علمائے سیاست دین اس کا فتویٰ نہ دیں گے۔ کیونکہ یہ آپ کے سیکڑوں پیروؤں اور ہزاروں بہانہ جوؤں کے لیے جواز کی دلیل بن جائے گی۔ عراق کی نبیذ غیر مسکر آخر خلفائے بغداد کی بزم میں شراب خالص بن گئی جو حد و دپر قائم رہنا سخت مشکل ہے۔"

۱۹۲۰ء کے آس پاس کا زمانہ مولانا عبدالماجد کی تصوف سے گرویدگی کا دورِ عروج تھا۔ تصوف یوں بھی بنیادی طور پر صلح جوئی اور امن و آشتی کا پیغامبر ہے اور اختلاف و افتراق اور جدال و قتال سے احتراز کی تلقین کرتا ہے اور پھر اس زمانے میں تو پہلی جنگ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں نے امن دوستی کے رجحان اور امن طلبی کی خواہش کو وقت کی اہم ترین ضرورت بنا دیا تھا۔ ان حالات میں ایسی تمام تحریکوں کے ساتھ جن کے مقاصد میں امن کی تبلیغ اور تشدد کی مخالفت کو اولیت حاصل تھی، مولانا کا ربط و تعاون ایک بدیہی امر تھا۔ سید صاحب ان کے اس طرز فکر سے بھی متفق نہیں تھے۔ وہ امن اور جنگ کے درمیان ایک توازن اور اعتدال کے قائل تھے اور محکوم و مغلوب قوموں کے لیے امن پسندی کے شدید رجحان اور صلح جوئی کے غیر مشروط جذبے کو مہلک تصور کرتے تھے۔ چنانچہ جب مولانا نے فروری ۱۹۲۰ء کے "معارف" میں جو سید صاحب کے دورۂ یورپ کی وجہ سے اس زمانے میں پوری طرح ان کے زیر ادارت آ گیا تھا، عالمی امن کے علم بردار فرانسیسی مصنف پال رچرڈ کی کتاب "ٹو دی نیشنز" کے ترجمے کا ایک حصہ اپنے حواشی اور اضافوں کے ساتھ شائع کیا اور یہ شمارہ لندن میں سید صاحب کے پاس پہنچا تو انھوں نے پورے منطقی استدلال کے ساتھ اس کے مندرجات کی تردید کی اور ایک فردوس تخیل کی تلاش میں قوائے فکر و عمل کے بے سود زیاں سے خبردار کیا۔ اس قسم کی نظریاتی بحثوں میں اکثر احتیاط و اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جایا کرتا ہے اور لہجے میں غیر ارادی و غیر اختیاری طور پر ایک طرح کی سختی و درشتی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن سید صاحب کو انتہائی ہیجان انگیز حالات میں بھی گفتار کے اسلوب پر قابو رکھنے میں جو کمال حاصل تھا، اس نے یہاں بھی ان کی باتوں میں دل میں اتر جانے والی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"فروری کا معارف پہنچا۔ میں قطعاً آپ کی اس رائے کا مؤید نہیں کہ "خسرو کی تلاش کرو، تغلق کی نہیں، سعدی چاہیے، سوز نگی کی حاجت نہیں، حافظ مطلوب ہے، شاہ شجاع نہیں۔ ابن رشد کو ڈھونڈو، حکم کو نہیں، شیخ الاشراق بس ہیں، سلطان ایوبی درکار نہیں ـــــ ابن سینا سے مطلب ہے، خوارزم شاہ

اور ابو المعالی قابوس سے نہیں"۔ میرے امن طلب دوست اور سکون پسند فلسفی! "تخیل" اور "عمل" دو مختلف عالم ہیں۔ تغلق نے خسرو کو پیدا کیا۔ اکبر نے عرفی کو نشو و نما بخشا۔ قابوس بن وشمگیر اور شمس الدولہ شاہ نے ابن سینا کو ابن سینا بنایا۔ دولت سامانی نہ ہوتی تو ابن سینا کو گنجینۂ علوم کتب خانہ میسر نہ آ سکتا۔ سلجوقی ترک نہ ہوتے تو جلال الدین رومی ایشیائے کوچک کی سرزمین میں نہ پیدا ہوتے۔ محکوم قوم کا درماندہ دماغ فلسفۂ عمل کے نکتہ کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ بس اگر حاکم قوم میں پیدا ہوتا تو اسے اپنے تجربہ خانے کے لیے در بدر بھیک نہ مانگنی پڑتی۔ ٹیگور کا عالم تخیل اگر اس دنیائے عمل کے مطابق ہوتا تو خطاب اعزازی سے محرومی پسند کرتا۔ انسان کے تمام دماغی و جسمانی قویٰ اس کے اقوائے ہیجی کے ماتحت ہیں۔ دل افسردہ قوم کے لیے فلسفہ کا امن اور شاعری کا ہنگامہ کوئی چیز مطلوب نہیں۔ خیام کا پُر سکون دماغ ملک شاہ سلجوقی کی تلوار کے سائے میں آرام پا رہا تھا۔" (مکتوب مورخہ یکم اپریل ۱۹۲۰ء)

تبلیغ امن کی جانب مولانا عبد الماجد کا میلان خاطر اس قدر قوی تھا کہ سید صاحب کی یہ مشفقانہ گفتگو نہ صرف یہ کہ ان کے دل میں گھر نہ کر سکی۔ بلکہ انھوں نے اسے دلائل نقلیہ سے مرعوب کرنے کی کوشش قرار دیا۔ دوسری طرف سید صاحب بھی مولانا کے "براہین عقلیہ" کو تمام تر تخیل کی کارفرمائی تصور کرتے تھے اور ان کے فلسفہ کے مثبت اثرات کی افادیت کے مقابلے میں منفی نتائج کی مضرتیں انھیں اپنے موقف سے ہٹنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ مولانا کو اصرار تھا کہ قرآن بھی ان کے پیام امن کا مؤید ہے لیکن سید صاحب کی رائے میں یہ استدلال یکسر ارشادات ربانی کی روح کے منافی تھا، اس لیے ایک بار پھر مولانا کو محکوم و مجبور مسلم قوم میں اس قسم کے راہبانہ خیالات کی تبلیغ و اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ۲۰ مئی ۱۹۲۰ء کو پیرس سے رقمطراز ہیں:-

"آپ کا پیام امن ہم سپاہیوں کے دلوں کو سرد نہیں کر سکتا
میں نے جیسا کہ آپ سے زبانی عرض کیا تھا، پھر عرض کرتا ہوں کہ

آپ کا فلسفہ محکوم قوم کو نہیں حاکم قوم کو درکار ہے ظفر
جو خود ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

میں آپ کے اس خیال سے قطعاً اختلاف کرتا ہوں کہ پیام امن کے دیباچہ میں آپ مذہباً قرآن و حدیث سے اپنے فلسفہ کے اثبات کی کوشش کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے خیال میں تحقیق واقعہ کے مطابق بھی نہ ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو قرآن آپ پڑھتے ہیں، اس میں ڈھونڈیئے گا تو یہ آیت بھی ملے گی۔ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا اور یہ بھی پڑھیے گا أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا۔ تلخیص البحث کی کتاب الفتن جہاں آپ پڑھتے ہیں، کتاب الجہاد بھی پڑھیے ہم غریب مسلمانوں کو آپ امن کی تعلیم کیوں دیتے ہیں۔ ان کو دیکھیے جن کی طمع شہنشاہی تمام دنیا میں امن شکن ہو رہی ہے۔"

سید صاحب کی جانب سے اپنے ہر استشہاد کی تردید کے نتیجے میں مولانا کو ان کی انتہا پسندی، رد عمل کے اس نقطۂ عروج تک لے گئی کہ وہ انھیں سرے سے امن و سلامتی کا مخالف تصور کرنے لگے حالانکہ ان کا مقصد بالکل واضح تھا۔ وہ امن اور جنگ کے کسی یک طرفہ اور جامد تصور کے خلاف تھے اور ان دونوں حالتوں کے رد و قبول کے فیصلے کو وقت کے تقاضوں کا تابع رکھنا چاہتے تھے۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء کے مکتوب میں اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت اور مولانا کے تردد کی تردید اس طرح کرتے ہیں:-

"آپ نے اپنے عنایت نامہ میں اپنے مذہب کی جو تفصیل کی ہے، مجھے اس سے قطعاً اختلاف نہیں۔ دنیا میں امن و سلامتی کے دور کا خواہاں مسلمان سے بڑھ کر کون ہوگا۔ کمزور قوموں کے لیے یہ آواز نوید حیات ہے۔ لیکن میرا یہ کہنا ہے کہ اس آب حیات کی حاجت ستمگر، جفا پیشہ، اپنی قوت و طاقت پر مغرور اور امن و سلامتی کو اپنی تلواروں سے وابستہ سمجھنے والی قوموں کو ہے۔ آپ غریب ہندوستان کی اسپرٹ کو اس امن

سلامتی کے وعظ سے کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں ؛ ہاں یہ ہوگا کہ اس میں زندگی کی جو کچھ بھی روح ہے، اس کا بھی خاتمہ ہو جائے ؛"

سید صاحب کو یورپ اور ہندوستان کے طول و عرض میں متواتر تجربات کی بنا پر انگریزی کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت کا بہ شدت احساس تھا۔ مولانا عبدالماجد اس مشن کی تکمیل کے لیے ہر طرح موزوں تھے لیکن ۱۹۳۱ء تک وہ انگریزی میں دینی کام کی اہمیت و ضرورت کے اس حد تک قائل نہ تھے اور افادیت کے وسیع تر امکانات کے پیش نظر انگریزی داں طبقے کی بجائے اردو داں عوام سے تخاطب کو قابل ترجیح تصور کرتے تھے۔ سید صاحب چاہتے تھے کہ وہ اپنے اس موقف کو جس میں خانقاہی انداز فکر کی جھلک نمایاں تھی، بدل کر ان کی آواز پر لبیک کہیں؛ چنانچہ اگست ۱۹۳۱ء میں محکمہ تعلیم بمبئی کے زیر اہتمام کسی اسلامی موضوع پر سلسلۂ تقاریر کے لیے ان کا نام تجویز کرنے سے قبل جب ان کی منظوری حاصل کرنے کے لیے خط لکھا تو یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ یہ خطبات انگریزی میں دیے جائیں۔ اپنی بات کو منوانے کے لیے انھوں نے اس خط میں تاسف، تنبیہ اور ترغیب کے جو حربے استعمال کیے ہیں، وہ دل سوزی و دردمندی کے ترکش سے نکلے ہوئے تیر معلوم ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں :—

آپ انگریزی سے گریز کرتے ہیں اور بخدا میں حسرت کرتا ہوں کہ میں انگریزی سے محروم رہا ورنہ میں دین اور خالص دین کا کام جو گہرے اثر کے ساتھ کر سکتا۔ آپ نے اپنی دنیا اردو داں طبقے تک محدود کر کے علم و مذہب کا بڑا فائدہ نہیں پہنچایا۔ آپ کا فرض ہونا چاہیے تھا جو ہم جیسوں کی آواز نہیں سن سکتے۔ وہاں تک اپنی آواز پہنچانا۔ آپ برا مانیں گے اور میں کہوں گا کہ آپ نے اپنے کو خانقاہ کے دائرہ میں بند کر کے اپنے کو محدود اور دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے سلسلے کو مختصر کر دیا۔ اس دماغ نفسی کا حاصل یہ ہے کہ آپ کو یہ خطبہ انگریزی میں دینا چاہیے ؛"

(مکتوب مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۳۱ء)

معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے جواب میں مولانا نے ایک بار پھر اپنے اس موقف کو دہرایا کہ ضرورت انگریزی سے زیادہ اردو میں کام کرنے کی ہے۔ سید صاحب ان کے دلائل سے مطمئن نہیں تھے لیکن اس بحث کو طول دے کر انھیں کسی الجھن میں بھی مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے اتمام حجت کے طور پر ۲۵ اگست ۱۹۳۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :—

" بہت اچھا، جب تک آپ کو ہندوستان کے طول و عرض اور اس کی اردو داں اور ذہنی کا حال نہ معلوم ہوگا، آپ کو انگریزی کی ضرورت کا یقین نہ آئے گا اور غیر ملکوں تک تو ہماری آواز پہنچ ہی نہیں سکتی۔ بہر حال وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشَقُونَ مَذَاهِبُ"

باہمی تعلقات و روابط کے ابتدائی دور میں ایک اور اہم مسئلہ جو سید صاحب اور مولانا کے درمیان ایک مدت تک مابہ الاختلاف رہا، علم، سیاست اور مذہب کے باہمی تعلق کا تھا۔ سید صاحب ابتدا ہی سے تینوں کو ایک دوسرے سے مربوط و متعلق سمجھتے رہے۔ ندوۃ العلما سے ترک ملازمت کے بعد "الہلال" کے ادارۂ تحریر سے وابستگی کے لیے ان کی آمادگی کی بڑی وجہ یہی تھی کہ یہاں انھیں اپنے اس نقطۂ نظر کو عام کرنے اور اس کی تائید و حمایت میں قلم کے جوہر دکھانے کے امکانات زیادہ روشن نظر آئے تھے۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھتے ہیں :—

" آپ جانتے ہیں کہ میں علم سیاست اور مذہب کو متحد سمجھتا ہوں۔ اختلافاً لکم، اسی چیز کا مشتاق ہو کر یہاں آیا تھا۔"

اس اقتباس میں اختلافاً لکم سے مولانا کے نقطۂ نظر کی وضاحت مقصود ہے۔ سید صاحب کے برخلاف ان کا خیال یہ تھا کہ علم اور مذہب کو سیاست کے خارزار سے دور رکھنا چاہیے۔ اس موضوع پر ان کے اور سید صاحب کے درمیان بارہا تبادلہ خیال ہوا اور سید صاحب ہمیشہ اپنے وسیع تر مشاہدات و تجربات کی بنا پر سیاست سے اہل علم اور اہل مذہب کی بے تعلقی کے مضرات اور وابستگی کے نتائج سے انھیں آگاہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۹۲۰ میں قیام یورپ کے دوران سید صاحب اور ان کے رفقاے

وفد کو خلافت کے مسئلے پر مستشرقین سے جو قلمی جہاد کرنا پڑا۔ اس نے اس سلسلے میں ان کے موقف کو اور بھی مستحکم کر دیا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۲۰ء کے خط میں جو لندن سے لکھا گیا ہے، انھوں نے ان تجربات کا ذکر "تنے موثر اور دل نشیں" انداز میں کیا ہے کہ ان کے ایک ایک حرف مکتوب الیہ کے لیے اس مسئلے پر از سر نو غور و فکر کی دعوت پوشیدہ ہے۔ لکھتے ہیں:

"آپ کہا کرتے ہیں کہ اہل علم کو سیاست سے کیا تعلق؟ کبھی کبھی آپ کا پر اثر وعظ سن کر میں بھی آپ کا معتقد ہو جانا چاہتا تھا لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ علم بھی سیاست کے لیے سکھا جاتا ہے — مارگولیو تھ صاحب تو کھلم کھلا مسئلہ خلافت میں مناظرہ کرنے کے لیے میدان میں اتر آئے ہیں۔ "آبزرور" میں ان کی اور سید حسین صاحب کی کشتی ہوئی۔ ایک اطالین مستشرق کو "آؤٹ لک" میں میں نے بچھاڑا۔ ایک اور بھی مضمون تیار ہو گیا ہے جس میں مستشرقین کو نبرد آزمائی کی دعوت دی گئی ہے۔"

سید صاحب اسی دورۂ یورپ کے سلسلے میں فرانس میں مقیم تھے کہ ۱۶ مئی ۱۹۲۰ء کو پوپ نے جان آف آرک کو جسے پانچ سو سال قبل ساحرہ قرار دے کر آگ میں جلا دیا گیا تھا، ولیہ تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور پیرس میں اس کے مجسمے کے سامنے واقع کیتھولک گرجے میں ایک جشن منعقد کر کے اس اعلان کی توثیق کی گئی۔ سید صاحب ۲۰ مئی کے خط میں اس واقعے اور جشن سے متعلق اپنے مشاہدات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:—

"اس ایک واقعے سے یہ نتیجہ آسانی سے نکل سکتا ہے کہ یورپ باایں ہمہ حریت و روشن خیالی بلکہ الحاد و بے دینی مذہب کی بجز ہی اور کن زنجیروں میں کس طرح جکڑا ہے۔ لیکن آپ فلسفی ہیں۔ اس لیے اس واقعے کو ایک اور نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یورپ کا مذہب کس طرح سیاست سے دست و گریباں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جان آف آرک فرانس کی وہ ہیرو اور شجاع خاتون ہے جو فرانس کو انگریزوں کے ہاتھوں سے نجات دلانے کے لیے نکلی تھی۔ مذہباً کیتھولک تھی۔ اس نے انگریزوں کو بارہا شکست دی اور آخر انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر اس پر ساحرہ ہونے کا الزام قائم ہوا اور وہ بیدردی سے آگ میں جلا دی گئی۔۔۔۔ فرانس کی اس ہیرو کو جس نے انگریزوں (پروٹسٹنٹوں) کے ہاتھ سے جام شہادت پیا، ولایت کا درجہ دینا آپ سمجھے کیا معنی رکھتا ہے۔ گویا فرانس کی رگ احساس پر ایک نشتر رکھا گیا ہے جو ہر سال تازہ ہوتا رہے گا۔"

تینتالیس چوالیس سال کے طویل دور رفاقت میں سید صاحب اور مولانا کے تعلقات اختلاف رائے اور اتحاد فکر و عمل کے مختلف مراحل سے گزرے لیکن نہ تو کبھی کسی اختلاف کی وجہ سے باہمی خلوص میں کوئی کمی آئی اور نہ اتحاد نے ایک کو دوسرے کی غیر مشروط پیروی اور بے جا حمایت پر آمادہ کیا۔ باعتبار عمر بزرگ ہونے کے باوجود سید صاحب کے دل میں مولانا کے لیے احترام کا جو بے پناہ جذبہ تھا، وہ آخر عمر تک غیر متزلزل اور لازوال رہا۔ وہ ان کے "محدود حلقۂ احباب" میں اپنی شمولیت کو ہمیشہ اپنے لیے "باعث افتخار" سمجھتے رہے[1]، اور اس اعتراف کے باوجود کہ "فطرۃً مجھ میں احباب پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں اور اس سے زیادہ (بدبختی) یہ ہے کہ احباب کو احباب قائم رکھنے کی صلاحیت اور زیادہ مفقود ہے، سلسلۂ مکاتبت میں طبعاً سست ہوں[2]" تعلقات کی خوشگواری اور سلسلۂ مراسلت کی استواری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اگر کسی ہنگامی صورت حال یا خاص مصروفیت کی وجہ سے خط لکھنے میں تاخیر ہو جاتی تو اسے اپنی بدتوفیقی سے تعبیر کرتے یا کبھی اتفاقاً قلم سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جس کے مولانا کی طبع نازک پر گراں

---

[1] "آپ کے محدود حلقۂ احباب میں داخل ہونا میرے لیے ہمیشہ باعث افتخار رہے گا۔" (مکتوب مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۰ء)
[2] مکتوب مورخہ ۲ جنوری ۱۹۲۳ء

گزرنے کا احتمال ہوتا تو معذرت خواہی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے، یہاں تک کہ اگر مولانا کی جانب سے جواب ملنے میں دیر ہوتی تب بھی ان سے شکایت کرنے کی بجائے اپنی ہی کسی موہوم لغزش یا نامعلوم کوتاہی کو اس کا ذمہ دار گردانتے۔ اس بے پایاں خلوص اور بلند اخلاقی و عالی ظرفی کی مثالیں مکاتیب کے ان مجموعوں میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

مکتوب مورخہ ۱۱ محرم ۱۳۴۰ھ: "آج شاید تین چار مہینے کے بعد مجھے یہ توفیق ملی ہے کہ چند سطریں اس بزرگ کو لکھوں جس کے مکاتیب سے اس سے پہلے شاید کوئی ہفتہ خالی گیا ہو؟"

مکتوب مورخہ ۸ فروری ۱۹۴۳ء:- "تیسرا نیاز نامہ حاضر خدمت ہے۔ جواب سے محروم ہوں ..... اگر میری جانب سے کوئی امر آپ کے خلاف مزاج صادر ہوا ہو تو معاف فرمائیں کہ میں نے دانستہ کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ اب اس عمر میں جی نہیں چاہتا کہ ان گنے چنے دوستوں میں سے کسی کے اعتماد محبت سے محروم ہو جاؤں۔"

مکتوب مورخہ ۶ اپریل ۱۹۴۹ء: "میری تلخ نوائی سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو تو آپ کی تضیع وقت تو ضرور ہوئی جس کی معافی چاہتا ہوں اور آپ سے بدل درخواست کرتا ہوں کہ میرے لیے اور میری اصلاح حال کے لیے دعائے خیر کریں۔

..... میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا محب قدیم اور مخلص صمیم سمجھا ہے اور اب بھی سمجھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ آپ کی مخلصانہ رائے اور خیر خواہانہ مشورہ اور دوستانہ اصلاح میرے لیے سرمایۂ راحت ہے۔ اگر اس طویل عرض حال میں نادانستہ کوئی فقرہ ایسا ہو جو آپ کے خیال میں جادۂ حق سے بعید ہو گیا، باعث ملال خاطر ہو تو اس کو نادانستگی اور غفلت پر محمول فرما کر معاف فرمائیں اور مجھے مطلع بھی فرما دیں تاکہ میں اپنی ندامت ظاہر کر سکوں۔"

"مکتوبات سلیمانی" کے اس مطالعے کی روشنی میں یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ مولانا عبدالماجد کے انفرادی تشخص اور علمی فضیلت کے نقش کو ابھارنے، نکھارنے اور سنوارنے میں سید صاحب کی ہمدردی و خیر خواہی اور دردمندی و دل سوزی کے جذبات سے سرشار شخصیت نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، اس کے پیش نظر وہ ان کے محسنین میں سرِ فہرست جگہ پانے کے مستحق ہیں اگرچہ اپنے اس جادۂ اعتدال سے بھٹکے ہوئے رفیق سفر کو راہِ راست پر لانے کی کوشش میں سید صاحب کے علاوہ علامہ شبلی، حضرت اکبر الٰہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کی نیک خواہشات اور حکیمانہ اقدامات کو بھی بڑا دخل ہے لیکن ان محترم ہستیوں میں سے کسی شخص کو بھی زندگی کے اتنے مراحل میں اور اس قدر طویل عرصے تک ان کی رہنمائی و ہمت افزائی کا موقع نہیں مل سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت پر سید صاحب کا نقش سب سے زیادہ گہرا اور پائیدار نظر آتا ہے۔

★

مصطفٰے فطرتؔ

"عبدالماجد دریابادی"

حاملِ صدق و خلق و محبت عبدالماجد دریابادی
تم تھے مجسم روحِ شرافت عبدالماجد دریابادی
"صدق جدید" اس دور میں واحد "صدق جدید" اس بات کا شاہد
سب سے الگ تھا رنگِ صحافت، عبدالماجد دریابادی
فرض شناسی، داخلِ طینت، خدمت انساں شاملِ فطرت
سمجھیں انھیں تم جزو عبادت، عبدالماجد دریابادی
لفظیں شیریں، فکر میں رفعت، طرزِ بیاں میں شوخی و ندرت
تم سے بڑھی اردو کی عظمت، عبدالماجد دریابادی
جب جب اٹھا اک شورِ تلاطم، ایک قدم پیچھے نہ ہٹے تم
جھیل گئے طوفانِ سیاست، عبدالماجد دریابادی
عمر گریزاں، تھوڑی مدت، پھر بھی کی اردو کی وہ خدمت
محو تماشا چشمِ بصیرت، عبدالماجد دریابادی
رائے تمھاری آزادانہ، کیا اپنا اور کیا بیگانہ
چھوڑی نہ تم نے راہِ صداقت، عبدالماجد دریابادی
فکر رسا سے نقد و نظر تک، فہم و ذکا سے قلب بشر تک
طے کی تم نے راہِ مسافت، عبدالماجد دریابادی

ڈاکٹر اصفہ نعمانی

عبدالماجد دریابادی

مسٹر سے مولانا تک

مثل مشہور ہے "ہونہار بروا کے ہوت چکنے پات" اور یہ مثل مولانا عبدالماجد دریابادی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ آپ کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا، آپ کے دادا مفتی مظہر کریم حمید اپنے دور کے زبردست عالم تھے، آپ کے والد عبدالقادر صاحب سررشتہ دار، تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدوں تک فائز رہے۔ ایسے ذی علم خاندان کے چشم و چراغ کی پرورش بھلا کیونکر مدھم ہو سکتی تھی۔ بچپن ہی سے آپ نہایت ذہین اور لکھنے پڑھنے کے رسیا تھے۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات کھانا کھاتے وقت بھی آپ کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور نظر آتی۔ آپ کا خالی وقت بھی عموماً لائبریریوں کے چکر کاٹتے ہی گذرتا۔

عبدالماجد صاحب کی زندگی میں ایک چیز خاص طور پر ابتدا ہی سے کارفرما نظر آتی ہے وہ ہے اپنی من مانی کرنا جس کو طبیعت قبول نہ کرے وہ کام کبھی نہ کرنا۔ کوئی یہ چاہے کہ آپ پر کوئی بات لاد دی جائے اور آپ اسے قبول کرلیں ایسا ممکن ہی نہیں۔ اس ضمن میں آپ کے بچپن کا وہ واقعہ بہت اہم اور کافی دلچسپ ہے جس سے آپ کے انداز فکر کے سلسلہ میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھیں کی زبانی سنیے: — "دستور برادری اور گھرانے میں پانچواں برس بسم اللہ خوانی کا تھا۔ اپنی عمر ابھی چوتھی ہی سال اور سن ۱۸۹۵ء تھا کہ بسم اللہ کرنا طے پاگئی۔۔۔۔۔۔ مولوی صاحب بے چارے نے پیار و شفقت کے لہجہ میں کہا کہ "کہو بسم اللہ —" یہاں جواب میں قطعی خاموشی۔

...... والد مرحوم کو آخر غصہ آیا ...... چھڑی ہاتھ میں لے لی انھوں نے جمانا شروع کر دی ...... آخر میں جو میری کھلائی تھیں ان بے چاری نے کہا — "واہ میرے بھیا کو کیا بسم اللہ کہنا آتا نہیں۔" میں نے کہا — "آتا کیوں نہیں —" بس میں ان کے ساتھ جا مولوی صاحب کے کمرے کے باہر ہی سے انھیں چلا کر سنا آیا ...... اسی کو کہتے ہیں "ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو —"

دیکھا آپ نے — جب اس ضدی بچے سے کہا گیا کہ بسم اللہ کہو تو مسلسل خاموشی، کیوں — ؟ اس لیے کہ اس کی اَنا یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ جو کہا جائے وہ اسے ادا کر دے — اور یہی وہ چیز تھی جو آخر تک قائم رہی دنیا کچھ کہے — کسی روش پر چلے — ماجد صاحب جس کو خود صحیح سمجھتے وہی کہتے — ابتدا میں ان پر الحاد کا غلبہ بھی اسی وجہ سے ہوا کہ وہ اپنی سمجھ کے مطابق جو کچھ پڑھ رہے تھے۔ دیکھ رہے تھے اسی کو بہتر تصور کر رہے تھے۔ اصلاح لینے کا جذبہ طبیعت کو گوارا نہ تھا۔ طالب علمی کے ہی زمانے میں علامہ شبلی کی کتاب الکلام پر مخالفانہ مضمون جو ماہنامہ الناظر میں شائع ہوا اس بات کا شاہد ہے کہ وہ اپنے دور کے معلم ادب سے بھی نظریاتی اختلاف روا رکھنے کی جرأت کر سکتے تھے۔ انھوں نے اس کے خلاف لب کشائی کرتے وقت، جو اپنے تئیں بہتر سمجھا بے خوف ہو کر کہا — اپنی بات پر اڑے رہنے

والا شخص قدرتی طور پر نڈر اور بے باک بھی ہوتا ہے تبھی تو آگے چل کر آپ نے جب صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو باون برس تک "سچی باتیں" کتابوں پر تبصرے ایک بے باک ایڈیٹر کی حیثیت سے کرتے رہے۔

نوجوانی کا زمانہ تھا Dr. DRYSDATE کی کتاب ELEMENTS OF SOCIAL SCIENCE کا مطالعہ کیا تو طبیعت نے اسی کو حقیقت قبول کیا۔ مذہب سے بیزاری اور بڑھ گئی۔ INTERNATIONAL LIBRARY OF FAMOUS LITERATURE میں WASHINGTON AURWING کے مضمون نے اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کیا اور آخر کار وہ پورے طور پر ملحد ہو چکے تھے۔ خود فرماتے ہیں :-

"پڑھنے لکھنے کی ہوس گویا مادر زاد تھی۔ اسی کے طفیل نوجوانی میں فرنگی علوم کا نشہ سوار ہوا اور بد مستی، الحاد، عقلیت اور لاادریت کے دروازے تک کھینچ لائی، عمر عزیز کے دس سال اسی گمرہی اور برگشتگی کی نذر ہو گئے۔"

مضمون نگاری کا شوق بچپن ہی سے تھا اور بارھویں سال سے تو باقاعدہ مضمون نگاری شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی قلم سے جو مضمون نکلا وہ بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا۔ مضمون نگاری کے میدان میں کبھی کسی سے اصلاح لینے کو طبیعت راغب نہ ہوئی۔ اپنے ملحدانہ خیالات کو بھی جوں کا توں پیش کرتے رہے۔

چنانچہ اسی دور کی تصنیف میں "سائیکالوجی آف لیڈر شپ" کو جو لندن سے شائع ہوئی اور جس کی اردو تلخیص بعد کو "فلسفۂ جذبات" یا "فلسفۂ اجتماع" کے نام سے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کی (جسے آپ نے الحاد کے دور کے بعد اپنی تصانیف سے خارج کر دیا) خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ فلسفہ اور منطق سے خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس دور میں فلسفیانہ مضامین کی بھرمار نظر آتی ہے۔ بیشتر مضامین رسالہ "الناظر" میں نکلتے رہے۔

اس کے علاوہ مبادی فلسفہ حصہ اول و دوم۔ فلسفہ اور اس کی تعلیم، مکالمات برکلے وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب زندگی کے ہر شعبہ پر جدید اثرات پڑ رہے تھے دیکھا جائے تو اس کی داغ بیل انیسویں صدی ہی سے پڑ چکی تھی اور جو اپنی تب و تاب کے ساتھ سر سید تحریک کے ذریعے دور دور تک پھیل بھی چکی تھی۔ حالی، آزاد، شبلی، سرشار، اور شرر تک ہر ایک نے اس کے اثرات قبول کیے تھے۔ لکھنے والوں کی دوسری نسل نے اپنے پیش رووں کا اثر تو قبول ہی کیا ساتھ ہی مغربی ادب سے بھی اچھا خاصا استفادہ کیا۔ ان میں مولانا آزاد، محمد علی مہدی افادی، نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، حسن نظامی، سجاد انصاری وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں۔ یہ وہ حضرات تھے جنھوں نے اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق نہ صرف ادب کے نئے سانچے متعین کیے بلکہ ادبی میدان کو وسعت دی اور اپنی اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑ گئے۔

مسٹر عبد الماجد کے سامنے یہی نمونے تھے لیکن ان کی جدت پسند طبیعت نے ان میں سے کسی رنگ کو شرف قبولیت نہ دیا۔ آپ کی کسی بھی تصنیف کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، نہ صرف اسلوب جدا ہے بلکہ طرز فکر بھی جداگانہ ہے اسی لیے ہم انھیں کسی دلبستان ادب سے منسوب نہیں کر سکتے۔ البتہ زبان پر لکھنؤ کی چھاپ نمایاں ہے۔ یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ آپ لکھنؤ میں مشکل سے دو برس رہے لیکن زبان خالص لکھنؤ کی استعمال کرتے ہیں۔ یہ ان کی غیر معمولی ذہانت کی دلیل ہے۔ غالب کی طرح آپ ہمیشہ روش عام سے ہٹ کر چلنے کے عادی رہے۔ کہا گیا ہے غیر معمولی ذہین ہستیاں اپنا راستہ خود ہی نکالتی ہیں چنانچہ وہ بھی اپنے ہی تلاش کیے ہوئے راستے پر گامزن رہے۔ طرز تحریر میں طنز کا پہلو ہمیشہ پوشیدہ رہتا اور یہ شاید بلا واسطہ طور پر حضرت اکبر الہ آبادی کی شخصیت کا اثر تھا۔ سر سید احمد خاں کی طرح ان کا اسلوب بھی استدلالی رنگ رکھتا ہے۔ ہر بات جامع اور مدلل ہوتی ہے جس میں کہیں سے کوئی جھول نہیں ملتا۔

بات کو خوب جھاڑ پھٹک کر دیکھ لیتے تب نوکِ قلم تک لاتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے فقرے ایجاز و اعجاز کا نمونہ ہیں۔

نوجوانی میں طبیعت شعر و شاعری کی طرف بھی مائل ہوئی خود فرماتے ہیں :۔ "سنہ ۱۹۱۱ء سے میرا دورِ غزل گوئی شروع ہوا جو شادی سے دو سال قبل شروع ہوا اور شادی سے ڈیڑھ دو سال بعد تک رہا —" یہ عبارت اس بات کی غماز کو رہی ہے کہ کسی کے تیرِ نظر نے انھیں شاعر بنا دیا۔ کیونکہ آگے لکھتے ہیں کہ "جہاں میں چاہتا تھا وہیں میری شادی ہوئی۔" تخلص ناظر اختیار کیا۔ اصلاح کے لیے کبھی کبھی اپنی غزلیات اکبر الٰہ آبادی کے پاس بھیجتے رہے۔ غزلیں عموماً حسرت موہانی، شیفتہ اور جوہر کی زمینوں میں ہوتی تھیں۔ زود پشیماں (ڈرامہ) اسی دور کی دین ہے۔ اس میں شامل غزلیں انھیں کی کہی ہوئی ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

تجھ کو کھلنے نہیں دیتی کبھی عصمت تیری
شوخیوں پر بھی تری مُہر حیا ہوتی ہے

ہو چکی صبر و سکون و خامشی کی انتہا
جامِ ضبطِ آہ و نالہ اب چھلک جانے کو ہے

لو دیکھو آگیا نہ زباں پر کسی کا نام
مدت سے ہم تھے ضبطِ محبت کیے ہوئے

لذتِ درد کے منکر کو سنا دو یہ شعر
ناظرؔ آساں نہیں غالبؔ سا سخندان ہونا

سنہ ۱۷-۱۸ء کے معارف اور الناظر میں بھی ان کی کچھ غزلیں شائع ہوئی تھیں۔

قدرت کو اس ذہین ہستی سے بڑے کام لینا تھے۔ چنانچہ امام غزالی کی طرح مدتوں بھٹکنے کے بعد انھیں دور کہیں سے رشد و ہدایت کی باریک کرن کسی پوشیدہ روزن سے جھانکتی ہوئی نظر آئی۔ ہوا یوں کہ حیدر آباد کے کچھ عرصہ قیام کے بعد جب آپ لکھنؤ واپس تشریف لائے تو ہند و فلسفہ کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ مسز بیسنٹ، ڈاکٹر بھگوان داس، اربند گھوش اور ٹیگور کی تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ ذہن کے دریچے وا ہوئے۔ اب ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مادیت اور فرنگیت ہی زندگی کا مداوا نہیں، روحانیت اور خدا پرستی بھی کوئی چیز ہے۔ گویا اب کشمکش کا دور شروع ہو چکا تھا۔ دو برس تک وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ یہ سنہ ۱۹-۱۹۱۸ء کا زمانہ تھا۔ ان کے ذہن نے کچھ لچک اس وقت قبول کی۔ مولانا کے ذہن نے غیر ارادی طور پر تین جانب سے اثرات قبول کیے۔ اول مذہبی کتابوں کا مطالعہ، دوئم اس دور کی اہم شخصیتوں کے اثرات، سوئم بزرگانِ دین سے عقیدت و ارادت کی جانب جھکاؤ۔

اسی زمانے میں انھوں نے مثنوی مولانا روم کی چھ جلدیں مع شرح و حاشیہ اور ۲۷ ہزار اشعار لفظاً لفظاً پڑھ ڈالے۔ علامہ شبلی کی سیرۃ النبی، محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ القرآن، ڈنس کی سائیکالوجی آف ریلیجن وآلاڈ کی انٹروڈکشن ٹو دی فلاسفی آف ریلیجن خاص طور سے مطالعہ میں رہیں۔ اہم شخصیات میں اکبر الٰہ آبادی جو آپ کے والد کے گہرے دوستوں میں سے تھے ہمیشہ ان کو راہ راست پر لگانے کی فکر میں لگے رہے۔ مولانا شبلی نعمانی کی مردم شناس نگاہیں اس ناتراشیدہ ہیرے کی پوشیدہ چمک سے واقف ہو چکی تھیں۔ مولانا شبلی سے وابستگی کی بدولت ان کے تعلقات علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر علمائے ندوہ سے بھی قائم ہوئے۔ اس ربط ضبط نے علوم اسلامیہ سے کافی روشناس کرا دیا۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا اشرف علی تھانوی کے فیضانِ صحبت نے ان پر ایسا اثر ڈالا کہ ان کے دل و دماغ سے تشکیک کے وہ سائے مٹ گئے جن کی تاریکیوں میں وہ صحیح راستہ کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ ایک جگہ خود فرماتے ہیں :۔ "اس کے بعد اسم ہادی کی تجلیات نے پھر زد

باندھا اور جس طرح دیے پاؤں ایمان کی روشنی رخصت ہوگئی تھی اسی طرح تشکیک و انکار کی تاریکیاں بھی کافور ہوگئیں۔ پھر قسمت نے دستگیری کر کے مرشد تھانوی کے آستانے تک پہنچا دیا۔"

(صدق جدید۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء)

گویا اب آپ از سر نو مسلمان ہو چکے تھے۔ فرماتے ہیں:-

"سنہ ۱۹۲۱ء میں اکبر کی وفات کے وقت میں بحمد اللہ پورا مسلمان تھا۔"

(دیباچہ خطوط مشاہیر صفحہ ۳۷ - ۳۸)

اب ان کی تشنہ روح بزرگان دین کی تلاش میں سرگرداں ہوئی۔ چنانچہ ایک مدت تک حیدرآباد، اجمیر شریف، دیوی شریف، کلیر شریف، بانسہ شریف، ردولی اور نہ جانے کہاں کہاں حاضری دیتے رہے۔ استقامت دین حاصل ہوا تو اس حد تک کہ بچپن میں ہاتھ پر کھدوایا ہوا نام تک ڈاکٹر کے لاکھ منع کرنے کے باوجود کھیں اپنے تک کھرچوا دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ الحاد کی کوئی نشانی ان کے دل و دماغ اور جسم کے کسی حصے میں باقی رہ جائے۔ اب تشکک فلسفی کو صحیح منزل مل چکی تھی اور اب مسٹر عبدالماجد مولانا عبدالماجد ہو چکے تھے۔ جب دل نور ایمانی سے منور ہو جاتا ہے تو انسان بڑا رقیق القلب ہو جایا کرتا ہے چنانچہ ان کی رقت قلب کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی انھیں اپنے دور الحاد کا خیال آجاتا تو آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ ان کے قلم کو صحیح منزل مل گئی تو ان کی تخلیقات کا دھارا بھی فلسفہ سے تفسیر کی جانب مڑ گیا۔ چنانچہ تفسیر ماجدی (انگریزی و اردو) شائع کردہ تاج کمپنی کراچی، خطبات ماجدی یا سیرۃ نبوی قرآنی، سفر حجاز، فیہ ما فیہ یا ملفوظات مولانا جلال الدین رومی، سوانح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی جیسی ذی قدر تصانیف شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ترجمہ یا تفسیر لکھنا کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ مترجم اگر دونوں زبانوں کے صرفی و نحوی نکات پر عبور نہ رکھتا ہو تو کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی اس میدان میں پورے اترے ہیں۔ اگرچہ مولانا ابوالکلام کی تفسیر ترجمان القرآن اردو میں نئے انداز کی بہترین تفسیر ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا بیان القرآن، مولانا امیر علی ملیح آبادی کی تفسیر، جدید علوم کی روشنی میں مولانا مودودی کی تفہیم القرآن وغیرہ شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن مولانا ماجد دریابادی کی تفسیر ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی حامل ہے۔ انھوں نے اسلام کی تعلیمات کی برتری کو سائنسی نقطہ نظر سے بھی ثابت کر کے دکھا دیا۔

مولانا ماجد کی تصنیفی عمر ساٹھ سال سے زائد ہے اور آپ کی کل مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد بھی ساٹھ سے کچھ اوپر ہے۔ گویا مولانا ہر سال ایک نئی تخلیق پیش کرتے رہے اور وہ بھی مختلف موضوعات پر۔ ان میں فلسفیانہ مضامین بھی شامل ہیں اور تراجم بھی، تاریخ و تمدن پر بھی قلم اٹھایا ہے اور سوانح و سیرت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، طنز نگاری میں بھی جداگانہ انداز رکھتے ہیں اور صحافت کے میدان میں بھی اترتے ہیں تو ۵۰ برس تک اپنے ہفتہ وار سچ و صدق اور صدق جدید میں ہزاروں صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیکڑوں مقالے، مضامین، خطوط اور کتابوں پر تبصرے لکھے ہیں۔ اتنے سارے کام اور ایک نحیف جان، نہ کوئی اسٹینو نہ مددگار۔ بقول ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی آپ کی شخصیت واقعی ایک "بحر العلوم" کی تھی۔ اور نور ایمان کے مشرف ہو جانے کے بعد تو ان کا معمول ہو گیا تھا کہ بعد نماز فجر سے عصر تک خود کو کمرے میں مقید کر لیتے اور صرف پڑھنے لکھنے کا شغل رہتا۔ ساری زندگی تصنیف و تالیف کی نذر کر دینا اور اتنی گرانقدر تخلیقات صرف اپنے اکیلے دم پر پیش کرنا واقعی کسی دیوزاد شخصیت کا ہی کام ہو سکتا تھا ؎

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈھنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

★

قمر جہاں

اکبر الہ آبادی اور مولانا عبدالماجد

ایک جائزہ

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور اکبر الہ آبادی کے باہمی تعلقات کا آغاز مارچ ۱۹۱۲ء میں اس وقت ہوا جب مولانا بی۔ اے کے امتحان میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ سے الہ آباد گئے تھے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں کالج تو تھے لیکن یونیورسٹی نہ تھی۔ اسی لیے طلباء کو امتحانات کے لیے الہ آباد جانا پڑتا تھا۔ اکبر الہ آبادی اس وقت ۶۶ برس کے تھے اور ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت کے حامل تھے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اردو کا کوئی ادیب اور شاعر یا مشرقی علوم سے دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص الہ آباد پہنچے اور حضرت اکبر الہ آبادی کی زیارت کے لیے ان کے آستانہ پر حاضری نہ دے۔

مولانا عبدالماجد کا تعلق اودھ کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ ان کے دادا مفتی مظہر کریم کو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں باغیوں کو پناہ دینے اور بغاوت کے لیے اکسانے کے الزام میں ۱۴ سال قید کی سزا بہ عبور دریائے شور ملی تھی۔ اس زمانے میں انھیں متعدد علما کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔ ادبی ذوق کے مالک اور صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ مولانا کے والد کے ساتھ اکبر کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اکبر عدالت خفیفہ کے جج رہ چکے تھے اور مولانا کے والد شیخ عبدالقادر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ حج سے مشرف ہونے کے دو دن بعد ۱۴ نومبر ۱۹۱۲ء میں مولانا کے والد شیخ عبدالقادر کا مکۂ معظمہ میں ہیضے کے عارضے سے انتقال ہو گیا تو حضرت اکبر نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا ؎

پیشوائے قوم، والا مرتبت — شیخ عبدالقادر عالی صفات
آخرت ہی پر نظر رکھتے تھے وہ — سمجھے تھے دنیائے دوں کو بے ثبات
جادۂ منصب میں وہ گو ممتاز تھے — کرتے تھے یاد خدا دن ہو کہ رات

ان کے ذکر و شغل کا تھا یہ اثر
شغل ہی میں نکلی تاریخ وفات

۱۳۳۰ھ

مولانا کو زمانۂ طالب علمی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا اور وہ اپنی ذہانت و ذکاوت کی بدولت مصنفین کی صف میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں مضمون نگاری شروع کر دی تھی اور ریاض الاخبار گورکھپور، اودھ اخبار لکھنؤ، ادیب، الہ آباد۔ الناظر لکھنؤ اور الندوہ، لکھنؤ میں اپنے مضامین شائع کرا چکے تھے۔ مولانا کے دو طویل مضمون محمود غزنوی اور غذائے انسانی کے عنوان سے ۱۹۰۹ء کے 'وکیل' امرتسر میں شائع ہوئے تھے۔ جنھیں ۱۹۱۰ء میں وکیل بک ایجنسی نے کتابچوں کی شکل میں شائع کر دیا تھا۔ یہی ایک امر مولانا کے ان مضامین کی افادیت اور اہمیت کا ثبوت ہے۔ مولانا اس وقت طالب علم تھے، کوئی بڑے آدمی نہ تھے، نہ کسی جاہ و حشم کے مالک تھے کہ ان کے اثر و رسوخ کو دخل ہوتا۔

اکبر اور ماجد کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ اکبر الہ آبادی

عمر کی ۶۶ منزلیں طے کر چکے تھے اور مولانا ابھی سن بلوغ کو پہنچ رہے تھے۔ وہ اپنے جسم کی ساخت سے اکہرے بدن اور نحیف جثے کے مالک تھے۔ اس لیے ۲۰ برس کی عمر میں تو وہ ایک لڑکے سے لگتے رہے ہوں گے۔ لیکن اکبر کی تجربہ کار نظروں نے اس جوہر کو تاڑ لیا اور عمر کے طویل فرق کے باوجود دونوں میں انس و محبت کا اٹوٹ رشتہ قائم ہو گیا۔

اکبر اور ماجد میں باہمی جذب و کشش کی ایک قدر مشترک فلسفے سے دونوں کی دلچسپی تھی۔ اکبر کو فلسفے سے لگاؤ تھا اور مولانا کا تو اوڑھنا بچھونا ہی فلسفہ تھا۔ اسلام سے محبت، عقیدت، اور مشرقی علوم بالخصوص اردو، فارسی اور عربی ادبیات سے غیر معمولی دلچسپی بھی ذہنی قربت کا باعث تھی۔ بہر حال پہلی ہی ملاقات میں دونوں میں انس و محبت کا ایسا رشتہ قائم ہو گیا جو آخری دم تک قائم رہا۔

مولانا عبدالماجد اس زمانہ میں مسٹر عبدالماجد کہلاتے تھے۔ فلسفے سے خاص دلچسپی تھی۔ عام طور پر فلسفیانہ اور منطقی ذہن استدلال کے بغیر کوئی بات قبول نہیں کرتا۔ ان کی نگاہیں حق و شک کے گرداب میں مضطرب تھیں۔ نوجوانی کا اُبال اور ذہانت کا کمال، عالم رنگ و بو کے نئے نئے گوشے تلاش کر رہا تھا۔ تشکیک و الحاد کا غلبہ تھا۔ ہمہ وقت الحادی فلسفہ ان کے پیش نظر رہتا تھا بلکہ اس سے دلچسپی روز افزوں تھی۔

اکبر نے پہلی ہی ملاقات میں مولانا کی ذہانت و فطانت کو بھانپ لیا تھا اور ان کے الحاد سے بھی واقف تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ذہین نوجوان الحادی فلسفے کی بھول بھلیوں میں پھنس کر بھٹکتا پھرے۔ مولانا ابھی شباب کی وادی میں قدم رکھ رہے تھے۔ اور اس وقت تک ان کے مزاج میں ایسی سختی پیدا نہ ہوئی تھی کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو۔ کیونکہ مولانا کا الحاد برائے الحاد یا تقلیدی نوعیت کا نہ تھا۔ بلکہ ان کا الحاد غلط قسم کی کتابوں کے مطالعہ یا کتابوں سے غلط نتائج اخذ کرنے کی وجہ سے تھا۔ اس لیے انھیں راہ راست پر لانے کے لیے کافی محنت اور تجربے کی ضرورت تھی۔

بہر حال ایک طرف نوخیز اور لاابالی مگر ذہین جوانی تھی تو دوسری طرف عمر کی چھیاسٹھ منزلوں کا تجربہ تھا۔ ایک طرف مولانا ماجد ایسا زبردست ملحد تھا جو خدا و رسول کے وجود کا منکر تھا اور دوسری طرف اکبر جیسا دعا ملیت کا ایسا عاشق شیدا کہ جسے زیادہ دیر تک رسولؐ اور ائمہ کا ذکر بھی ناگوار تھا۔[1] اس ذہنی بُعد اور اختلاف کے باوجود اکبر مولانا کے مطالعہ کی وسعت اور علمیت سے متاثر تھے۔ وہ قوم کے ایک ذہین نوجوان کو بے راہ ہوتے نہ دیکھ سکے۔ اپنی طویل زندگی کے تجربات کی بنا پر وہ جذبات کی ہیجانی کیفیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔

مولانا کا الحاد اکبر الہ آبادی کے لیے چیلنج بن گیا اور انھوں نے مولانا کو اسلام کی طرف واپس لانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ اپنے خیالات غیر محسوس طریقے پر مولانا کے دل و دماغ تک پہنچاتے رہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ علم النفس کے مطابق براہ راست نصیحت نہ صرف یہ کہ کارگر نہیں ہوتی بلکہ اکثر و بیشتر الٹا اثر کرتی ہے اور طبیعت میں ضد اور درشتی پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لیے اکبر نے تبلیغ کا کام نہایت محتاط طریقے سے ہاتھ میں لیا۔

اس زمانے میں مولانا کا قیام اکبر سے دور لکھنؤ میں تھا دونوں کے لیے روز ملنا ممکن نہ تھا۔ مزید بریں اس زمانے میں مولانا بے روزگار تھے۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور باپ کا چھوڑا ہوا سرمایہ بنک کے دیوالیہ ہو جانے کی وجہ سے غارت ہو گیا تھا۔ اکبر انھیں الہ آباد آنے کی دعوت دیتے تھے تو سفر کے اخراجات اپنے ذمہ رکھتے تھے تاکہ ایک طالب علم کو زیر بار نہ ہونا پڑے۔ اس لیے اکبر نے خطوط کے ذریعے اپنا

---

[1] اکبر نامہ۔ عبدالماجد دریابادی ص ۱۲۵

کام شروع کیا۔ ان خطوط میں اکبر نے مولانا کو برنائے عقیدت اسلامی تعلیمات یا قرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے نہیں کہا۔ اس لیے کہ عقیدت تو وہاں تھی ہی نہیں۔ اکبر تو جانتے تھے کہ عربی۔ اسے بس مولانا کے پاس عربی ایک مضمون کی حیثیت سے تھی۔ اس لیے انھوں نے مولانا کو قرآن مجید کے ذریعے عربی زبان وادب کے مطالعہ کی طرف راغب کیا۔ اس ضمن میں مولانا لکھتے ہیں :

"ایک دور مجھ پر الحاد کا گزرا ہے۔ خدا اور رسولؐ تک کا منکر تھا۔ اسی زمانے میں ایک روز یوں ہی باتوں باتوں میں پوچھے "کیوں صاحب، آپ نے عربی لی تھی نا ؟" عرض کیا، "جی ہاں" فرمایا، "تو پھر اب قرآن آپ کبھی پڑھتے ہیں ! مذہبی کتاب سمجھ کر نہ سہی، اس کی اعلیٰ لٹریری حیثیت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ سنتا ہوں یونیورسٹیوں میں ادب عربی کے کورس میں داخل ہے۔ کیا حرج ہے اگر عربی ادب سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے لیے اسے کبھی کبھی پڑھتے رہیے۔ آخر انگریزی بھی تو پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ کے لیے کوئی قید باوضو ہونے اور قبلہ رخ بیٹھنے کی نہیں۔ وضو بے وضو جب بھی جی چاہے پڑھ لیا کیجئے اور جو آیت پسند آجائے اسے ذرا ایک دو بار دہرا لیا کیجئے جیسے اچھے شعر کو دو چار بار پڑھ لیا جاتا ہے۔"

اکبر ایک خط میں مولانا کو لکھتے ہیں :

"قرآن شوق سے دیکھئے، خوب دیکھئے، یہاں تک کہ بلا مدد ترجمہ اس کے ظاہری معنی سمجھنے لگئے۔ تفسیر کی تو حد نہیں۔ مذاق مفسرین کی بوقلمونی حیرت انگیز ہے۔ قرآن مجید کو بطور تلاوت پڑھا کیجئے۔ ایک سرے سے پڑھ جائیے اور پھر پڑھنے زیادہ نہ رکیے۔ پڑھتے جائیے۔ ثواب کا عقیدہ نہ سہی لٹریری لطف و ذوق کا خیال کیجئے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی کسی وقت کوئی آیت متوجہ کرے گی۔۔۔ غور اور استڈی اور کرٹسزم اور مضمون نگاری کے لیے قرآن مجید کو خاص طور پر جا بجا حسب مرضی دیکھنے کا کوئی اور وقت نکالیے۔"

اکبر مولانا کو طرح طرح سے ترغیب دیتے اور متاثر کرتے رہتے تھے۔ کبھی قرآن کے ادبی لطف سے محفوظ ہونے کے لیے تو کبھی بندہ ہونے کے بارے میں پوچھتے۔ خود مولانا لکھتے ہیں :

"ایک بار دوران گفتگو میں مجھ سے پوچھا، "کیوں صاحب آپ کو کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے۔ خدا کی بات الگ رکھئے۔ صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ آپ بندے ہیں یا نہیں ؟" عرض کیا، "جی ہاں، کیوں نہیں۔ اس میں تو شک ہوا نہیں۔" بولے "بس، پھر بیڑا پار ہے۔ اسی بندگی کا احساس کرتے رہیے۔ آپ کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ خدا کے عرفان کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ جنھوں نے جانا ہے انھوں نے بھی کیا جانا ہے"۔[1]

اکبر کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ ماجد میاں الحاد شرک کا دعویٰ کتنا ہی کریں، لیکن ان کا دل شقی نہیں۔ ان میں باتوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ بشرطیکہ عقیدے اور دین سے متعلق امور کو صحیح طریقے سے ان تک پہنچایا جائے۔ مولانا نیاز احمد کے ایک شعر کی تضمین میں اکبر نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

ماجد کو آپ سمجھیں بیگانۂ طریقت
دل میں مرے تو اک ہے امید کا قصیدہ
ہیں غالباً وہ مصداق اس شعر باثر کے
ارشاد کر گیا ہے اک عبد برگزیدہ
من پاکباز عشقم، ذوق فنا چشیدہ
آہوے دشت ہویم از ما سوا رمیدہ

بہرحال مولانا ماجد، اکبر کے خیالات سے غیر محسوس طریق پر متاثر ہو رہے تھے۔ قرآن اور اسلامی فلسفے کا مطالعہ بھی رنگ لا رہا تھا۔ اسلام کی عظمت کا نقش ان کے دل میں بیٹھنے لگا۔

---

[1] اکبر نامہ۔ عبدالماجد دریا آبادی ص ۱۴۷

اکبر کے تجربے اور وسعت مطالعہ کی وجہ سے ان کے افکار و خیالات اور ان کے تاثرات و عمل کو رد کرنا بہت مشکل تھا۔ اکبر کے انداز و طریقۂ تبلیغ کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں :

"ایک خاصی حد تک دخل حضرت اکبر کی شخصیت اور تعلیمات کو بھی ہے۔ تبلیغ بڑے مزے سے کرتے رہتے، سیدھے، دل نشیں اور موثر انداز سے۔ سننے والے کو پتہ بھی نہ چلتا اور وہ دین کی محبت یا وقعت دل میں بٹھانے چلے جاتے ....

اکبر شاعر اور ظریف شاعر سے کہیں پہلے مومن اور مومن گر تھے"۔ [1]

خط و کتابت کے ذریعے اور زبانی تبلیغ کا یہ سلسلہ اکبر سے ملاقات کے تقریباً ایک ڈیڑھ برس بعد یعنی اگست ۱۹۱۳ء سے شروع ہوا اور اکبر کی وفات (۱۹۲۱ء) تک جاری رہا۔ مولانا کو دین اسلام کی طرف راجع کرنے کے مقصد کے حصول کے بعد اس سلسلے کے جاری رہنے کی وجہ پہلے ہی سے موجود تھیں۔

آخر کار حضرت اکبر کی چھ سات برس کی محنت رنگ لائی۔ مولانا کے عقائد و افکار میں انقلابی تبدیلی پیدا ہوئی۔ ان کے خیالات کا دھارا الحاد سے اسلام کی طرف مڑا۔ مولانا نے الحاد کا جامہ اتار پھینکا اور خرقۂ اسلام پہن لیا۔ انھوں نے پہلی نماز حضرت اکبر کے ساتھ ان کے گھر "عشرت منزل" میں ادا کی۔ مولانا لکھتے ہیں :

"اپنے عقائد و خیالات کی اصلاح میں میں نے حضرت اکبر کے اثر کو چپکے چپکے غیر شعوری طور پر اور غیر محسوس طور پر کام کرتے ہوئے پایا۔ وہ ابھی زندہ ہی تھے کہ میں بحمد اللہ مسلمان از سر نو بن چکا تھا۔ جب پہلی نماز حضرت اکبر کے ساتھ عشرت منزل میں ادا کی۔ ظہر کا وقت تھا۔ اس وقت ان کی خوشی کا کیا کہنا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کتنی بڑی دولت خود انھیں مل گئی ہے" [2]

مولانا عبدالماجد ایک عظیم ادیب تھے۔ وہ قرآن و حدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ و نفسیات، سوانح و سیرت، سفرنامہ، ڈائری، سیاسیات، سماجیات، ادبیات وغیرہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے ادب کے جتنے مختلف النوع موضوعات پر لکھا ہے، شاید ہی اردو کے کسی ادیب نے اتنے موضوعات پر قلم اٹھایا ہوگا۔ اکبر الہ آبادی بھی ایک ہمہ جہت ادیب تھے۔ انھوں نے بھی نظم اور نثر دونوں میں فلسفہ، تصوف، سیاست، معاشرت وغیرہ پر کہیں اختصار سے اور کہیں تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اسی وجہ سے دونوں میں گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ اکبر مولانا سے ملنے کے ہمیشہ متمنی رہتے تھے اور اپنے خطوں میں اکثر اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔

"اس وقت ایسی حالت میں ہوں کہ آپ سے زیادہ کسی کو اپنے دل سے قریب نہیں پاتا"

"آپ کی صحبت تو مستقل طور پر چاہتا ہوں، اگر میسر آئے"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

دل چاہتا ہے کہ دو ایک روز کے لیے لکھنؤ آؤں بعض صاحبوں سے ملوں اور زیادہ تر آپ کے ملنے سے سرور حاصل کروں"

۳ر جون ۱۹۱۶ء کو مولانا کی شادی ہو گئی۔ اکبر اپنی علالت اور ضعیفی کی بنا پر شریک نہ ہو سکے۔ اس لیے انھوں نے مبارکباد کا خط لکھا، اور "فروغ ماجد" کا تاریخی مادہ بھی لکھ کر بھیجا۔ "فروغ ماجد" کا مادہ حسب حال تھا۔ اس لیے کہ مولانا نے یہ شادی اپنی رضا و رغبت سے کی تھی۔ اس زمانے میں مولانا رومانی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس رومان کی کامیابی کے نتیجے میں یہ شادی طے ہوئی تھی اور یقیناً مولانا ماجد کے

---

[1] خطوط مشاہیر، ص ۳۵ ، [2] اکبر نامہ ص ۱۶۸

فروغ کا باعث ہونے والی تھی اور ہوئی بھی۔

اگست ۱۹۱۷ء میں مولانا کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو اکبر سے عقیدت اور محبت کی بنا پر مولانا نے اس فرزند کا نام اکبر رکھا۔ یہ بچہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں صرف سوا برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔

۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے لیے شعبہ تالیف و ترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔ فلسفہ و اخلاق سے متعلق کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے مولانا عبدالماجد کو اس شعبے میں ادبی مشیر کی حیثیت سے دعوت دی گئی۔ ستمبر ۱۹۱۷ء میں مولانا حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ حضرت اکبر کو ان کی جدائی شاق گزری۔ اس غم کا اظہار اپنے ایک خط میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"لکھنؤ پہنچا تو آپ کے بغیر سونا نظر آئے گا۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :۔

مشتاق ترا اکبر رنجور بہت ہے
افسوس یہی ہے کہ دکن دور بہت ہے

مولانا عبدالماجد بھی حضرت اکبر الہ آبادی سے بہت انس اور محبت، عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ انھوں نے اکبر کی باقاعدہ شاگردی اختیار کی ہو یا نہ کی ہو لیکن وہ علمی اور ادبی مسائل سے پوری دلچسپی دکھاتے تھے اور مفید مشوروں سے مولانا کا دل بڑھاتے رہتے تھے۔

۱۲۔۱۹۱۴ء میں مولانا فلسفہ جذبات لکھ رہے تھے یہ ان کی پہلی اہم اور قابل قدر کتاب تھی۔ فلسفے سے متعلق اصطلاحیں وضع کرنا پڑتی تھیں۔ مولانا کو اس ضمن میں جب دقت پیش آتی تو وہ اکبر سے رجوع کرتے تھے۔ اکبر الہ آبادی اپنے خط میں لکھتے ہیں :۔

"آپ کی محبت اور عنایت اور مہربانی اور سعادت اور نیک دلی ہے کہ آپ نے مجھ کو قابل مشورت سمجھا ہے۔ اگرچہ کچھ جانتا بھی تھا تو سب بھول گیا۔ اردو زبان پر بھی عبور نہیں رہا۔ البتہ مذاق شاعری کے سبب لفظوں کی ترتیب سے وسیع معانی پیدا کر لینے کا کچھ سلیقہ تھا وہ بھی اب حیرت اور غم کی کثرت سے مفقود ہوتا جا رہا ہے۔"

اسی زمانے میں PLEASURE اور PAIN، فلسفے کی دو اصطلاحوں کا مسئلہ درپیش آیا۔ مولانا عبدالماجد نے ان کا ترجمہ بالترتیب حظ و کرب کیا تھا۔ پھر اس عنوان سے "الہلال" جون ۱۹۱۳ء کے دو شماروں میں ان کا مضمون شائع ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے حظ و کرب کی اصطلاح کے بجائے لذت و الم کو زیادہ صحیح بتاتے ہوئے توضیحی نوٹ شائع کر دیا۔ اس پر بحث و مباحثے کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ حضرت اکبر نے مولانا کی اصطلاح کی تائید کی۔ اختلافات کے باوجود مولانا آزاد ماجد کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن کو عام حالت میں امتیاز و استثنا حاصل ہے اور ہماری مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نشان امید رکھتے ہیں۔ میں ان کی وقعت کرتا ہوں۔ انھیں چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبدالماجد بی۔ اے بھی ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو ان شاء اللہ بہت فائدہ پہنچائے گا اور علوم حدیثہ کے تراجم میں ان سے بہت مفید مدد ملے گی۔ جواب تک اردو زبان میں گویا مفقود محض ہیں۔"

اکبر الہ آبادی اس نوجوان ادیب کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ فلسفے سے متعلق مولانا کی مجوزہ اصطلاحات کے بارے میں اکبر لکھتے ہیں :۔

"یہ جو الفاظ (بعد غور) مقرر فرمائیں گے، ہم طالبان علم پر اس کی پابندی لازم ہوگی۔ بس یہ خیال ضروری ہے کہ حتی الامکان ثقالت اور طوالت سے احتراز کیا جائے

لہ اکبر نامہ صفحہ ۱۰۸۔ لہ "الہلال" ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء

اور تعریفات واضح طور پر لکھ دی جائیں۔"

اسی زمانے میں مولانا نے برکلے کے مکالمات کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ترجمے سے متعلق مولانا کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ترجمہ کرنے والے کو اس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جائے زیادہ مہارت چاہیے، کیونکہ بہ نسبت سمجھنے کے سمجھانا مشکل ہے۔"

اسی طرح فلسفۂ جذبات کی اشاعت پر مولانا کو مبارکباد دیتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

"اردو زبان میں یہ بہت قیمتی علمی اضافہ ہے۔ خدا آپ کو علمی ترقیاں نصیب کرے۔"

سنہ ۱۹۱۴ء میں مولانا کو شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے ناظر تخلص اختیار کیا۔ مولانا اپنی غزلیں بہ نظر اصلاح اکبر کی خدمت میں بھیجتے تھے۔ اکبر ان کے ابتدائی کلام کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ مولانا کی پہلی غزل "زاریاں نہ گئیں" کی ردیف میں تھی۔ اکبر نے یہ شعر بہت پسند کیا ؎

رہی ہر چند عقل صبر آموز
نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

اسی سلسلے میں ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"کبھی کبھی کچھ اشعار عبرت آگیں یا عاشقانہ کہہ لیا کیجئے۔"

۱۹۱۸ء کے اواخر میں مولانا نے داغ دہلوی کی مشہور زمین ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

میں ایک غزل کہی تھی۔ اکبر نے مولانا کی غزل کو داغ کی غزل پر ترجیح دیتے ہوئے لکھا:۔

"اگر داغ سے آپ بڑھیں تو عالمانہ اور اخلاقی متانت پر داغ آجائے لیکن اس غزل میں تو میری نگاہ میں داغ پھیکے رہے۔"

مولانا کو سنہ ۱۹۲۱ء تک اکبر سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا اور انھوں نے بوجوہ احسن استفادہ کیا۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں لیکن اتنا بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنے اسلوب کے تعین میں سب سے زیادہ فائدہ اکبر الہ آبادی سے حاصل کیا۔ آغاز کار میں انھوں نے شبلی اور آزاد وغیرہ کے اسلوب کی پیروی کی کوشش کی اور تھوڑی دور تک ہمراہ رو کے ساتھ چلے بھی، لیکن اکبر کے اسلوب کے ساتھ جو طبعی مناسبت پائی جاتی تھی وہ کسی اور کے اسلوب میں نہ تھی۔ اس لیے مولانا نے اسی اسلوب کو اپنایا اور اس پر اپنی انفرادیت کا نقش قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

اکبر کی مزاحیہ اور طنزیہ شاعری اختصار و اجمال کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ ایک لفظ سے ایک جملے بلکہ ایک پیرے کا کام لیتے تھے۔ یہی اسلوب نثر میں مولانا کے یہاں پایا جاتا ہے۔ وہ ایک جملہ اور بعض اوقات ایک لفظ سے معنی آفرینی کرتے ہیں مثال کے طور پر صدق کے نثری شذرات، طنز و مزاح اور مختصر نویسی میں اکبر الہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا نعم البدل ہیں۔ مولانا نے اس فن میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ تبصرے بھی ان کی مختصر نگاری کا شاہکار ہوتے تھے۔ اس مختصر نگاری نے مولانا کی تحریروں کو ایک طرف حشو و زوائد سے پاک و صاف رکھا تو دوسری طرف ان کی تحریروں میں تلوار کی سی برّش پیدا کی۔"

★

مولانا عبدالماجد اصلاً ادیب ہیں اور ان میں ادب و انشا کا ذوق اتنا رچا اور بسا ہوا ہے کہ ان کا امتیازی وصف بن گیا ہے جس سے ان کی مذہبی اور فلسفیانہ تصانیف بھی خالی نہیں۔ زبان و ادب کے ہر پہلو پر ان کو حکمرانی بلکہ حقیقی حاصل ہے اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پرانے کلاسیکی ادب میں جو خصوصیات الگ الگ پائی جاتی تھیں وہ مولانا میں یک جا نظر آتی ہیں سنجیدہ علمی ادب، لطف زبان، روزمرہ طنز و ظرافت اور ضلع جگت سب پر ان کے قلم کی حکمرانی یکساں ہے اس لحاظ سے وہ اس دور کے سب سے بڑے ادیب ہیں۔

مولانا شاہ معین الدین ندوی

ضیاءالدین انصاری

تفسیرِ ماجدی
ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی شخصیت، ان کے علمی و ادبی کارنامے، ان کی صحافتی خدمات، ان کی بلند پایہ انشا پردازی اور ان کا منفرد انداز و اسلوب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اس عہد کی ایک ایسی شخصیت تھے جسے صحیح معنی میں نابغۂ عصر کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مختلف اور متنوع موضوعات پر سیکڑوں مضامین اور متعدد کتابیں لکھیں اور جو کچھ ان کے خامۂ زرنگار سے نکلا اس میں ان کی انفرادی حیثیت بہرحال نمایاں ہے۔ اسلامی موضوعات سے متعلق جو کتابیں اور مضامین ان کی یادگار ہیں وہ ایک طرف اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں ایک نمایاں اور باوقار جگہ پانے کے مستحق ہیں تو دوسری طرف ادب و انشاء کے بہترین شاہکار کے زمرے میں آتے ہیں۔ "تفسیر ماجدی" ان کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسے بجا طور پر مصنف کے لیے توشۂ آخرت اور قاری کے لیے سامانِ بصیرت کہا جا سکتا ہے۔ مولانا نے اس تفسیر میں عہدِ حاضر کے علمی و تحقیقی مذاق اور مغربیت زدہ طبقے کی نفسیات کا بطور خاص لحاظ رکھا ہے اور قدیم و جدید مفسرین و شارحین قرآن کی تفسیری کاوشوں سے استفادہ کرتے ہوئے جدید طرز پر قرآن پاک کا آسان، سلیس اور عام فہم ترجمہ اور بے نظیر تفسیر لکھ کر قرآن فہمی کی راہیں استوار کی ہیں۔

علمائے ہند نے مختلف النوع اسلامی موضوعات پر جو بلند پایہ اور وقیع کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں وہ ایک طرف اپنی کمیت و کیفیت کے لحاظ سے اسلامی لٹریچر کا بیش بہا سرمایہ ہیں تو دوسری طرف ہندستانی علما کی عبقریت اور علم و تحقیق کے میدان میں ان کی عظمت و انفرادیت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ملکی زبانوں کے علاوہ غیر ملکی زبانوں میں بھی ان علمائے کے بعض کارنامے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ کسی غیر ملکی زبان میں مہارت تامہ حاصل کرنا اور اس میں ایسی بلند پایہ کتابیں تصنیف و تالیف کرنا جو خود اہل زبان کے لیے باعث رشک ہوں فی الحقیقت ہندستانی علما کا ایک ایسا امتیاز ہے جس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ خاص علم تفسیر پر جو گرانقدر تصانیف ان علما کی یادگار ہیں وہ علم تفسیر کی تاریخ میں خاص اہمیت اور قدر و قیمت کی حامل ہیں۔

تفسیر نگاری ایک مشکل فن ہے۔ اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں اس کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا موضوع کتاب الٰہی کا مطالعہ ہے جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان بقدر استطاعت قرآنی علوم و معارف کو سمجھے اور احکام خداوندی سے زندگی کے رہنما اصولوں کا استنباط کرے اور ان پر عمل پیرا ہو کر دینی و دنیوی سعادتوں سے بہرہ مند اور شاد کام ہو۔ اس فن کی اہمیت اور غرض و غایت کا اقتضا یہ تھا کہ اس کی ترقی پر خاص توجہ مبذول کی جائے اور ضرورت و حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے موثر اور دلنشیں انداز و اسلوب میں قرآن کی تشریح و تفسیر کی خدمات انجام دی جائیں چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ علمائے اسلام نے اس تقاضے کی تکمیل میں حتی الامکان کوئی کسر نہیں چھوڑی اور تاریخ کے مختلف ادوار میں اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ہندستانی علما بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر زبانوں سے قطع نظر صرف اردو میں تراجم و تفاسیر قرآن کا جو بیش قیمت سرمایہ ان علما نے فراہم کیا ہے اس کا اندازہ اس طویل فہرست سے کیا جا سکتا ہے جو "سیارہ

ڈائجسٹ کراچی" کے قرآن نمبر میں شامل ہے۔ اس فہرست کو محمد عالم مختار حق نے بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ اس فہرست کے مطابق مکمل تراجم و تفاسیر کی تعداد ۲۵۰ اور غیر مکمل کی تعداد ۳۶۶ ہے۔

بعض اسباب و موانع کی بنا پر اردو زبان میں ترجمہ و تفسیر کا آغاز کسی قدر تاخیر سے ہوا۔ محققین نے تاخیر کے ان اسباب کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ اس تاخیر کا سبب کچھ تو علما کی تنگ نظری اور قدامت پسندی ہے اور کچھ وہ مشکلات ہیں جو ایک زبان میں پیش کردہ خیالات کو دوسری زبان کا جامہ پہنانے میں سد راہ ثابت ہوتی ہیں۔ اول الذکر سبب کو "ملاؤں اور مذہبی پیشواؤں کی کوتاہ اندیشی" سے تعبیر کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے:

"لیکن ایک مشکل اور بھی ہے وہ یہ کہ ان صحیفوں کا ترجمہ آسان کام نہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ زبان پر کامل قدرت ہونی چاہیے۔ عقائد و احکام کا دارومدار الفاظ کے مفہوم پر ہے۔ الفاظ کا مفہوم مرور زمانہ سے بدل جاتا ہے۔ اس لیے مترجم کے لیے لازم ہے کہ وہ جانتا ہو کہ جس زمانہ میں یہ کتاب نازل ہوئی اس وقت ان الفاظ کے کیا معنی تھے اور قائل کا ان سے کیا مقصود ہے۔ کبھی کبھی ذو معنی اور پہلودار لفظ بھی آجاتے ہیں۔ ایک جماعت ان کا مفہوم کچھ لیتی ہے اور دوسری جماعت کچھ۔ اور ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک لفظ کے معنی یا نحوی ترکیب کی وجہ سے عقائد میں اختلاف پیدا ہو گیا اور دو فرقے بن گئے۔ ترجمے میں ایسے لفظ استعمال کرنا کہ ان میں بھی دونوں پہلو قائم رہیں، بہت دشوار بلکہ اکثر اوقات ناممکن ہوتا ہے۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود ترجمے میں اصل کی سی فصاحت اور قوت بیان اور اثر قائم رکھنا سب سے بڑا دشوار کام ہے۔"[1]

اردو زبان میں ترجمہ و تفسیر کی مشکلات پر متعدد علما نے تفصیل کے ساتھ بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں ان تحریروں کا استقصا مقصود نہیں، کہنا صرف اس قدر ہے کہ اس تاخیر کا اصل سبب علما کی کوتاہ اندیشیوں سے کہیں زیادہ وہ مشکلات اور دشواریاں ہیں جن سے ایک مترجم و مفسر کو عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ انتہائی حزم و احتیاط کے باوجود ہر مترجم و مفسر بالآخر اس اعتراف پر مجبور نظر آتا ہے کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ترجمہ نگاری کی ان مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کتاب کسی زبان کی بھی ہو، اگر ادبی اعتبار سے بلند اور معنوی اعتبار سے عظیم ہے تو اسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ ہر صاحب علم کے لیے کٹھن، بلکہ کہنا چاہیے کہ صبر آزما ہے۔ ہر زبان کی ساخت الگ ہوتی ہے۔ ترکیبیں جداگانہ، نشست الفاظ کی ایک ہیئت مخصوص، صرف و نحو کے قاعدوں ضابطوں کی ایک وضع خصوصی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر لفظ اپنی زبان میں جو ضمنی مدلولات اور مخفی اشارات و کنایات رکھتا ہے انھیں زبان ترجمہ کے کسی لفظ میں بعینہ کیوں کر لے آیا جائے؟ ترجمہ میں اگر پابندی زبان ترجمہ کے طور طریقوں، ترکیبوں اور بندشوں، محاورہ اور روز مرہ کی رکھیے، تو یہ تو اپنا نا ہوا، ترجمہ کرنا نہ ہوا زیادہ سے زیادہ اسے ترجمانی کہہ لیجیے اور اگر کہیں التزام اصل لفظ کی جگہ لفظ رکھ دینے کا کر لیا، اور تکیہ تمام تر لغت اور فرہنگ کی کتابوں پر رکھا، تو عبارت ایسی سپاٹ اور بے رنگ و کیف بن جائے گی کہ خود اپنی ہی طبیعت بدمزہ ہو کر رہے گی اور جی اس کے پڑھنے کو نہ اٹھے گا۔"[2]

ان مختلف النوع دشواریوں کے باوجود اردو زبان میں سیکڑوں ترجمے کیے گئے اور تفسیریں لکھی گئیں۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے ترجمے اور تفسیری حواشی اور ان کے ماقبل و مابعد کے مترجمین و مفسرین کے تراجم و تفاسیر سے لے کر آج تک اس موضوع پر مسلسل کام ہو رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی سے جو اردو میں قرآن کے ترجمہ و تفسیر کے آغاز کا عہد ہے، دور حاضر تک اس زبان میں ترجمہ نگاری اور تفسیر نویسی

---

[1] قدیم اردو، ڈاکٹر عبدالحق، ص ۱۲۰ تا ۱۲۱ [2] تفسیر ماجدی، جلد اول، افتتاحیہ ص ۱

کے فن نے ارتقار کی متعدد منزلیں طے کی ہیں اور اس ترقی کی بدولت خود اردو زبان معانی و بیان کی بے پناہ وسعتوں سے آشنا ہوئی ہے۔ مختلف مکاتیب فکر کے علمار نے اپنے اپنے مخصوص انداز و اسلوب اور مختلف اغراض و مقاصد کے پیش نظر اردو میں جو ترجمے کئے اور تفسیریں لکھیں ان سب کا تفصیلی تذکرہ اس مختصر مقالہ میں دشوار بھی ہے اور غیر ضروری بھی تاہم عہد حاضر کی چند ایسی تفسیروں کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنھیں ترجمہ نگاری اور تفسیر نویسی کی اعلیٰ سے اعلیٰ کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ من جملہ ان تراجم و تفاسیر کے دور حاضر کی تصانیف میں مولٰینا ابو الکلام آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی "تفہیم القرآن" مولانا امین احسن اصلاحی کی "تدبر قرآن" اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی "تفسیر ماجدی" کو ایک خاص اہمیت اور ممتاز درجہ حاصل ہے۔ ذیل کی سطور میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ "تفسیر ماجدی" کی علمی، ادبی، تحقیقی اور فنی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مولانا عبد الماجد نے مکمل دو ضخیم جلدوں میں پورے قرآن پاک کا ترجمہ سلیس اور عام فہم زبان میں لکھا ہے۔ اور نہایت موثر، دلنشیں اور تحقیقی انداز میں آیات قرآنی کی تشریح و توضیح کی ہے۔ ان کی یہ کوشش قدیم انداز فکر اور جدید طرز تحقیق و تصنیف کے امتزاج کی بہترین مثال ہے۔ مولانا کی تعلیم و تربیت جدید ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ بلا کے ذہین اور نکتہ رس نگاہ و نکتہ سنج طبیعت کے مالک تھے۔ فلسفہ ان کے مطالعہ کا خاص موضوع تھا، اس میں حد سے زیادہ استغراق اور جدید تعلیم اور لادینی ماحول کے زیر اثر ابتدا میں وہ مذہب سے برگشتہ اور الحاد و بے دینی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ علمار و مشائخ پر طعن و تشنیع کرنا اور مذہبی اقدار کی تحقیر کرنا ان کا شیوہ تھا۔ بایں ہمہ اپنے عہد کے مشاہیر علمار، محققین اور شعرار و ادبار سے ان کے گہرے روابط تھے۔ ان کے عقائد و نظریات کے کٹر مخالف ہونے کے باوجود ان کے شریک بزم اور ہم جلیس تھے۔ ان بیدار مغز ارباب فضل و کمال نے جن میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد، اکبر الہ آبادی اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں، اس باغی نوجوان کو اس کے باغیانہ خیالات و نظریات کے باوجود اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اور اس کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو صحیح رُخ دینے میں وہ حکیمانہ طریقہ اپنایا جس کی طرف قرآن کی آیت "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ[1]" اشارہ کرتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے ایک موقع پر انھیں لکھا:

> "کہ تم عربی کے طالب علم رہے ہو۔ قرآن مجید کو الہامی کتاب سمجھ کر نہ سہی عربی ادب کی بہترین کتاب سمجھ کر پڑھو۔ زبان و ادب سے تمھیں دلچسپی بھی ہے۔"

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے ان الفاظ میں انھیں مطالعہ قرآن کی ترغیب دی:

> "تم قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتے اس لیے اس کے آداب تلاوت کے بھی تم مکلف نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اگر کسی وقت بے وضو بھی تم اس ادب کے شاہکار اور انقلاب آفریں کتاب کو بیٹھے یا لیٹے ہوئے پڑھ لیا کرو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"
>
> (جامعہ، مارچ ۱۹۷۷ء ص ۴۴)

ان دو بزرگوں کی حکیمانہ فہمائش، اپنے عہد کے علمار و مشائخ کے فیض صحبت اور ان سب سے بڑھ کر اس کتاب ربانی کے مطالعہ کے اثر سے نہ صرف یہ کہ ان کے مزاج و فکر اور عقائد و نظریات میں زبردست اور حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئیں، بلکہ وہ قرآن کی ایسی عظیم الشان خدمت کر گئے جو دوسرے گم کردہ راہ لوگوں کے لیے مشعل ہدایت اور خضر راہ کا درجہ رکھتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ قرآن کے مطالعہ کا ذوق بڑھتا گیا۔ قرآن کے شارح اول جن کی ذات قرآن پاک کی آیت "هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ

---

[1] ترجمہ: اے پیغمبر اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ، اس طرح کی حکمت کی باتیں بیان کرو اور اچھے طریقے پر پند و نصیحت کرو۔ اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقے پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ ہو۔

اٰیَاتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ[1] کی ہمراہ ہے، ان کی سیرت سے مولانا کا رشتہ زیادہ سے زیادہ مضبوط اور استوار ہوتا گیا۔ قرآن و سیرت کے موضوع پر ان کی بلند پایہ اور معرکۃ الآرا کتابیں ان کے اسی ذوق و شوق کی مرہونِ منت ہیں۔ انھوں نے سیرت نبوی کو قرآن کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ اور سیرت نبوی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو براہ راست قرآن سے اخذ نہ کیا گیا ہو۔ بشریت انبیاء پر ان کے مختصر رسالے کے علاوہ "اعلام القرآن" یا قرآنی شخصیتیں "الحیوانات فی القرآن" اور "ارض القرآن" وغیرہ کتابیں ایک طرف اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے نہایت مفید اور معلومات افزا ہیں تو دوسری طرف ان کے قرآنی ذوق کے آئینہ دار ہیں لیکن وہ کتاب جو ان کی مذہبی کتابوں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے بلاشبہ "تفسیر ماجدی" ہے۔ انھوں نے خالی الذہن ہو کر براہ راست قرآن کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب ربانی کی حیات بخش اور ایمان افروز کرنوں نے نہ صرف یہ کہ ان کے دل و دماغ کی تاریکیوں کو دور کر دیا بلکہ اسے ایک ایسے صاف و شفاف آئینے میں تبدیل کر دیا جس سے اس شعاع ربانی کی کرنیں منعکس ہو کر طالبین راہِ حق کی رہنمائی و رہبری کے لیے "تفسیر ماجدی" کی شکل میں صورت پذیر ہو گئیں۔ جس طرح قرآن کے مطالعہ کی تاثیر نے ان کے خیالات، عقائد و نظریات اور سیرت و کردار میں ہمہ گیر تبدیلیاں پیدا کر دیں اسی طرح جو شخص بھی ان کی کتاب "تفسیر ماجدی" کا مطالعہ کرے گا اس کے افکار و خیالات، نظریات و عقائد اور سیرت و کردار پر اس کے اثرات کا مرتب ہونا یقینی اور ناگزیر ہے۔

یہ تفسیر تکمیل و تبییض کے پورے ۱۳، ۱۴ سال کے بعد پہلی مرتبہ علیحدہ علیحدہ ۳، ۳ پاروں کی شکل میں ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کی کتاب کی پہلی طباعت سے بوجوہ مولانا قطعی مطمئن نہیں تھے، نیز اشاعت میں غیر معمولی تاخیر اور ناشر کی بے احتیاطی سے انھیں دلی رنج اور صدمہ پہنچا تھا جس کا اظہار انھوں نے طبع ثانی کے مقدمہ میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"طبع اول کا مسودہ کوئی چار پانچ سال کی مدت میں ۱۹۴۳ء میں ختم ہو گیا تھا۔ چار سال سے اوپر کی مدت مسودہ میں کانٹ چھانٹ اور صفائی یعنی مسودے سے مبیضہ بننے میں لگ گئے۔ ۱۹۴۸ء تک مبیضہ ناشر کے ہاتھوں پہنچ گیا تھا۔ پھر جو کچھ گزری اور کتاب جب اور جس ہیئت و صورت کے ساتھ ۱۳، ۱۴ سال کے صبر آزما انتظار کے بعد یعنی ۱۹۶۲ء میں پریس سے باہر نکلی اس کے تذکرے سے اب کچھ حاصل نہیں۔"[2]

ناشر کے غیر ذمہ دارانہ طرز عمل، طباعت و اشاعت کی خرابیوں و خامیوں اور غیر ضروری تاخیر سے مولانا کو کتنی اذیت پہنچی ہو گی اس کا صحیح احساس تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس قسم کے ناخوش گوار تجربات سے دوچار ہوئے ہوں۔ تاہم مولانا نے سنبھلے ہوئے الفاظ اور محتاط لب و لہجہ میں جو کچھ کہا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں۔ جو کتاب تصنیف و تالیف کے تمام دشوار گذار مراحل ۹ سال میں طے کرے اسے اشاعت و طباعت کا مرحلہ طے کرنے میں ۱۳، ۱۴ سال لگ جائیں تو ظاہر ہے کہ اس المیہ کو ہنسی خوشی صرف وہی برداشت کر سکتا ہے جو احساس سے عاری ہو۔ دوبارہ یہ تفسیر خود مولانا کی نگرانی، نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے ساتھ صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہونا شروع ہوئی۔ اس کی پہلی جلد سورۂ فاتحہ سے آل عمران تک جو فل اسکیپ کے سائز کے ۶۹۰ صفحات پر محیط ہے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد بھی اس سائز پر سورہ نساء سے سورۂ توبہ تک ۷۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، طبع ہوئی، باقی حصے ابھی طبع نہیں ہو سکے تھے کہ مولانا نے صدائے "یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیہ" کو لبیک کہا۔ پہلی جلد میں انڈکس نہیں تھا، جس پر مولانا نے مقدمہ میں معذرت کی ہے، لیکن دوسری جلد میں انڈکس موجود ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ مولانا کی یہ تفسیر جدید طریقہ تصنیف و تالیف اور اصول تحقیق و تدقیق کے بموجب دور حاضر کے

---

[1] ترجمہ: وہی وہ ذات ہے جس نے امیوں میں انھیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا، جو ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ [2] تفسیر ماجدی، جلد اول، افتتاحیہ، ص ۱۱

سماجی، سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی حالات اور معاشرتی زندگی کی پیچیدگیوں اور مختلف عصری علوم و فنون، اور افکار و نظریات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ مولانا نے ان تمام مسائل کا نہایت کامیابی کے ساتھ استقصا کیا ہے جن سے جدید تعلیم یافتہ ذہنوں میں تشکیک اور بے راہ روی کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ وہ مغربی علوم سے متاثر طبقے کے خیالات و جذبات، افکار و نظریات اور ان کی نفسیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کیونکہ اپنی ابتدائی زندگی میں وہ بھی اس سیلاب بلاخیز کے تھپیڑے کھا چکے تھے جو مشرقی علوم و فنون، فکر و فلسفہ، تہذیب و تمدن اور معاشرت و معیشت کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ اس طبقے کے لیے ان کی حیثیت درون میخانہ کے محرم راز کی سی تھی۔ اس لیے انھوں نے مغربیت زدہ نوجوانوں کے افکار و خیالات ان کی کج فکری و گمرہی اور اس کے اسباب و علل کو بطور خاص موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھی ہے، ان کے دل کے چوروں کی نشاندہی کی ہے اور نہایت دلنشیں اور موثر انداز میں انھیں ان کے باطل خیالات سے آگاہ کر کے اسلامی تعلیمات کی صداقت و عظمت سے روشناس کرایا ہے، انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ مغربی تہذیب کے دور رس اثرات و نتائج اس کے کھوکھلے پن اور اس کے مضرت رساں پہلوؤں کی گرفت کی ہے۔ اور مستشرقین و متشککین کے اعتراضات و شکوک کا نہایت عمدہ طریقے سے رد کیا ہے۔

ترجمہ و تفسیر کا عام انداز یہ ہے کہ متن قرآن کے نیچے اس کا سلیس و بامحاورہ ترجمہ درج ہے۔ ترجمہ میں وضاحت کے لیے جو الفاظ و عبارات لکھی ہیں وہ قوسین میں بند ہیں۔ ترجمہ زیادہ تر مولانا اشرف علی تھانوی کے ترجمے سے جو مولانا کے پیر مرشد ہیں، مستفاد ہے، ترجمہ کے بعد حاشیے میں نمبر دے کر حسب ضرورت کہیں مفصل اور کہیں مختصر تفسیری نوٹ لکھے ہیں۔ مشکل الفاظ قرآنی کی لغوی تحقیق اور بعض مقامات پر صرفی و نحوی ترکیب بھی کی ہے۔ جگہ جگہ اپنی انگریزی تصنیف کے حوالے بھی دیے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی اس تفسیر کی یہ ہے کہ اس میں انھوں نے پیش رو مفسرین کے تفسیری نکات، اور ان کی علمی تحقیقات کو نہایت اختصار اور سلیقے کے ساتھ جمع کر دیا ہے جس کا سب سے زیادہ اہم فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ مبسوط تفسیروں کے مطالعہ کی استعداد یا موقع سے محروم ہیں وہ ان تفسیری نکات کو یک جا دیکھ سکتے ہیں۔ اپنے اس فائدے کے باوجود اس طریقۂ تصنیف و تالیف کی بنا پر یہ تفسیر اردو کے عام قارئین کے لیے کسی قدر مشکل اور ناقابل فہم ہو گئی ہے۔ اس سے وہی شخص استفادہ کر سکتا ہے جو قرآنی علوم اور عربی زبان سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ لیکن بحیثیت مجموعی اپنے بلند پایہ تحقیقی انداز، صاف و سلیس اور عام فہم زبان، پُر اثر اسلوب نگارش، ادب و انشار کی مابہ الامتیاز خصوصیات، ایجاز و اختصار اور دیگر ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے یہ تفسیر اردو تفاسیر میں ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی رائے بڑی حد تک درست ہے:

"تفسیر ماجدی کے بعد جن حضرات نے قرآن مجید کی تفسیر یا اس کی تفہیم کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں انھوں نے درحقیقت مولانا ہی کی خوشہ چینی کی ہے۔ مولانا کے خامۂ زرنگار سے جو مضمون نکل گیا، سدا بہار ہو گیا۔ لیکن علمی، تحقیقی اور ادبی حیثیت سے تفسیر ماجدی مولانا کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی آب و تاب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھے گی اور آئندہ نسلیں شکر گزاری کے ساتھ انھیں یاد رکھیں گی۔"[1]

توریت، و زبور، انجیل اور دیگر مروجہ صحف سماوی کے مختصر اقتباسات قرآنی بیانات کی تائید و توثیق کے لیے نقل کئے ہیں۔ زمانہ حال کے انگریز مورخین و محققین کے بیانات، انسائیکلوپیڈیا وغیرہ کے مشتملات وغیرہ بھی جا بجا نقل کئے ہیں، انبیاء سابقین، پیغمبر اسلام، پیشوایان مذہب کی سیرت و کردار اور ان کی شخصیت کے بارے میں ان کے معاندانہ اعتراضات و شکوک کا بھی ذکر کر کے روایت و درایت اور تاریخی حقائق و معلومات، اور اکتشافات جدیدہ کی روشنی میں تردید کی ہے۔

مولانا ترجمہ و تفسیر نگاری کا واضح تصور اور بلند معیار رکھتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ہر عہد کے مفسر و مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہد

---

[1] جامعہ بابت مارچ ۱۹۷۷ء، جلد ۷۴، شمارہ نمبر ۳ "مولانا عبدالماجد دریا آبادی" مولانا ابو سلمان شاہجہاں پوری ص ۱۴۶ تا ۱۴۷۔

کے تقاضوں، رجحانات اور عقائد و نظریات پر گہری نظر رکھتا ہو۔ مروج علوم و فنون، خاص طور تاریخ اقوام، جغرافیہ عالم، یہودیت و نصرانیت، مجوسیت عرب و تواریخ عرب اور ان کے مشرکانہ عقائد، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت اور ان کے تمام ذہنی و فکری میلانات و جذبات وغیرہ سے پوری طرح باخبر ہو۔ ساتھ ہی جدید سائنس کے مختلف شعبوں خاص طور پر فلکیات سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو۔ نیز قرآن کی زبان، اس کے معیار فصاحت و بلاغت، اس کے مختلف اسالیب بیان، زمانۂ جاہلیت کے ذخیرہ اشعار و نمونہ خطابت، اس کے نزول کے عہد کے حالات اور زبان و بیان کے مختلف معیارات اور عہد بعہد اس کے تغیرات دارتقار سے بھرپور واقفیت رکھتا ہو۔ ان شرائط کی تکمیل کے بغیر کسی مترجم و مفسر کا اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا محال ہے۔ مولانا کے خیال میں مفسر و مترجم کا محض متقی و پرہیزگار ہونا اور اسلامی علوم و فنون، اور عربی زبان و ادب پر محض گہری نظر رکھنا کافی نہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

" لازم ہے کہ جدید مفسر و شارح تاریخ اقوام پر بھی نظر رکھتا ہو اور جغرافیہ عالم پر بھی۔ اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور عرب و تواریخ عرب کے شرکیہ مذاہب سے بھی فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو۔ اور جدید سائنس کے بھی مختلف شعبوں (خصوصاً فلکیات) سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو۔ ورنہ باوجود تدین و تقویٰ، صالحیت و معقولیت کے سخت علمی غلطیوں کا شکار ہو جائے گا۔ اس کا قلم کہیں فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی کو بجائے بحر قلزم کے دریائے نیل میں دکھلائے گا، کہیں حضرت مسیح کا تلوار سے قریب القتل ہونا بیان کرے گا۔ اور کہیں فرعون کو کسی تاج دار کا شخصی نام سمجھ کر دعوائے الوہیت اس کی شخصیت کی جانب منسوب کرنے لگے گا۔"[1]

مقدمہ میں ترجمہ نگاری کی مشکلات پر بھی انھوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور اردو و عربی کے اسالیب بیان کے اختلافات اور دونوں زبانوں کے معیار فصاحت و بلاغت کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ مفرد الفاظ کے لغوی، اصطلاحی اور مرادی معنی کی تعیین کی مشکلات عربی زبان کی وسعت اور اس کی کثرت کے مقابلے میں اردو کی تنگ دامانی اور اس کے سرمایۂ الفاظ کی قلت نیز اس قسم کی دوسری بے شمار دشواریاں قدم قدم پر ایک مترجم کے لیے سنگ گراں ثابت ہوتی ہیں۔ اگر دماغ سوزی دیدہ ریزی اور تلاش و محنت سے کسی حد تک وہ ان دشواریوں پر قابو پالے تب بھی سب سے بڑی دشواری ہے جس سے کوئی بھی مترجم عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ وہ خود مولانا ہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

" جو دشواری بڑے سے بڑے فاضل کے لیے بھی اس راہ میں سنگ گراں ہوتی ہے وہ خود قرآن کا اعلا اور حد بشری سے مافوق مرتبۂ بلاغت ہے۔ جس شدت کا زور اور جوش قرآن میں اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے اور جس غضب کی تاثیر سے اس کی ایک ایک آیت اور ایک ایک ترکیب لبریز ہے اس کا، بلکہ اس کے عشر عشیر کا بھی ترجمہ میں منتقل کر دینا دنیا کے بڑے سے بڑے انسان کے بس میں نہیں ... بڑے بڑے فاضل روزگار کے شرف و افتخار کے لیے یہی بہت ہے کہ اپنی بساط کے لائق کچھ تھوڑے ہی بہت نکتے بلاغت قرآنی کے سمجھ لے۔"[2]

قرآن کے آسان و سہل ہونے نہ ہونے کا مسئلہ بھی بحث و تمحیص کا خاص موضوع ہے۔ جو لوگ مطلقاً قرآن کے سہل الفہم ہونے کے قائل ہیں وہ آیت قرآنی "لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ" سے استدلال کرتے ہیں۔ اور یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ قرآن ہر شخص کے لیے یکساں آسان ہے۔ ہر خاص و عام اس کو پڑھ کر اکتساب فیض کر سکتا ہے، اور مسائل و احکام کا استنباط کر سکتا ہے، اس ادعا باطل کے اسباب و محرکات، اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے تفصیل[3] کے ساتھ بحث کی ہے، اور نہایت مدلل طریقے سے اس استدلال کی خامیوں کو واضح کیا ہے۔ دوسرے علماء نے بھی اپنے

---

[1] تفسیر ماجدی، جلد اول، افتتاحیہ، ص ۶ [2] تفسیر ماجدی، جلد اول، افتتاحیہ، ص ۴۔
[3] فہم قرآن، سعید احمد اکبرآبادی، ص ۶ تا ۸۔

اپنے انداز میں اس سلسلہ میں لکھا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی اس مسئلہ پر مختصراً روشنی ڈالی ہے، اور لکھا ہے کہ قرآن موعظت وعبرت پذیری کے پہلو سے یقیناً آسان ہے، لیکن دوسرے پہلوؤں سے وہ ہرگز آسان نہیں۔ فرماتے ہیں:

"قرآن معنوی اعتبار سے بھی ایک مرتب ومنظم کتاب ہے اور انشائی اعتبار سے انتہائی بلیغ اور اس نسبت سے قدرتاً ایک دشوار ترین کتاب بھی اس کے دقائق واسرار تو الگ رہے۔ اس کی ظاہری، لفظی ترکیبیں تک بھی ہر جگہ آسان نہیں... قرآن مجید نے اپنے کو آسان جو فرمایا ہے، وہ موعظت اور عبرت پذیری کے پہلو سے، قابل عمل ہونے کے لحاظ سے... نہ کہ دوسرے پہلوؤں سے۔"[1]

ہم ذیل میں چند آیات قرآنی کے ترجمہ وتفسیر کے مختصر اقتباسات "تفسیر ماجدی" سے بطور نمونہ پیش کرتے ہیں جس میں زبان وبیان کی لطافت ہے، علم وتحقیق کی اعلیٰ وارفع روایت ہے، اثبات حق کے موثر اور باوقار اسلوب اور ابطال باطل کے مدلل اور مستحکم انداز ہے اور عربی زبان وادب اور اس کے اسالیب بیان سے گہری واقفیت اردو زبان اور اس کے ادب وانشاء کی رمز آشنائی میں انفرادیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت ہے۔

"وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" (بقرہ آیت نمبر ۲۵)

ترجمہ: اور ان کے لیے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ (ان بہشتوں) میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس کے بعد لفظ مطہرہ کے معنی ومفہوم کی وضاحت اور اس ضمن میں تفسیر ابن جریر، معالم التنزیل، تفسیر کبیر، بیضاوی، تفسیر ابن قیم اور تفسیر مدارک وغیرہ قدیم کتب تفسیر ومفسرین کے اقوال واقتباسات عربی میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"بعض روشن خیالوں کو پاکیزہ بیویوں کے نام سے خدا معلوم کیوں ایسی شرم آئی کہ انھوں نے اس معنی ہی سے انکار کر دیا۔ اور ازواج مطہرہ کی تفسیر عجب توڑ مروڑ کر کی ہے۔ گویا بہشت میں رضائے الٰہی کے مقام میں ہر قسم کی انتہائی لذت، مسرت وراحت کے موقع پر بیویوں کا ملنا بڑے ہی شرم وندامت کی بات! جنت کے نفس وجود ہی سے اگر انکار ہے، جب تو بات ہی اور ہے۔ اور ایسے مخاطب کے سامنے پہلے جنت کا اثبات کیا جائے گا۔ لیکن اگر جنت کا اقرار ہے، پھر وہاں کی کسی لذت، نعمت، کسی راحت سے انکار کے کوئی معنی نہ نقل کے لحاظ سے صحیح ہیں اور نہ عقل کے اعتبار سے۔ جنت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ وہ مادی اور روحانی ہر قسم کی لذتوں، مسرتوں، راحتوں کا گھر ہوگا۔ یا پھر یہ ہے کہ بیوی کے نعمت اور اعلیٰ نعمت ہونے ہی سے انکار ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس عقیدہ کا رشتہ اسلام سے کہیں زیادہ رہبانیت اور مسیح کی لائی ہوئی نہیں پولوس کی پھیلائی ہوئی مسیحیت سے وابستہ ہے۔ زوجیت جب اللہ کا ایک اعلیٰ انعام ہے تو آخر جنت میں کس جرم میں اس سے محرومی ہو جائے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ جسمانی، مادی، حسی، خصوصاً ازدواجی نعمتوں کو حقیر سمجھنا، یا ان سے شرمانا تمام تر جاہلی مذہبوں خصوصاً پولوسی مسیحیت سے دماغی مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ اسلام تو حسی اور معنوی، مادی اور جسمانی اور عقلی ہر قسم کی نعمت کی قدر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسی خشک لذت جس میں کوئی شائبہ نہ لامسہ کا ہو نہ باصرہ کا، نہ ذائقہ کا نہ سامعہ کا اور صرف اسی پر قانع رہنا کمال نہیں نقص ہے۔ ہنر نہیں عیب ہے۔ اور معلوم ہے کہ نقص وعیب جنت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ کل زوجیت سے ایک دوسرا مقصود جو دنیا میں حاصل ہوتا رہتا ہے یعنی بقائے نوع یا افزائش نسل وہ تو جنت میں موجود نہ ہوگا۔ غذا کی طرح صحبت کی لذت ہی وہاں مقصود رہ جائے گی۔"[2]

اسی سورہ کی دوسری آیت:

"فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ

---

[1] تفسیر ماجدی، جلد اول، افتتاحیہ، ص ۶
[2] " " ، ص ۵۴ تا ۵۵

هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ (سورہ بقرہ آیت ۹)

ترجمہ: "سو (بڑی) خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب (الٰہی) کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اس سے قدرے قلیل معاوضہ حاصل کریں۔"

"تفسیر: پچھلی آیت میں ذکر عوام یہود کا تھا۔ اب ذکر خواص و اکابر یہود کا ہے۔ توریت کی تحریف اب کوئی اختلافی یا نزاعی مسئلہ نہیں۔ دوست دشمن سبھی کو اب تسلیم ہو چکا ہے کہ یہ کلام الٰہی نہیں۔ اور اس کے دوست زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا رسیدہ انسانوں کی تصنیف ہے۔ کسی جامد سے جامد یہودی میں بھی اب یہ ہمت باقی نہیں کہ توریت کو قرآن مجید کی طرح تنزیل لفظی قرار دے۔ اب زیادہ سے زیادہ جو کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خاصان خدا نے الہام خداوندی سے مشرف ہو کر اسے اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترتیب و تالیف کیا ہے اور خدائے تعالیٰ کی جانب اس کا انتساب صرف مجازاً اور بالواسطہ ہے۔ حقیقی اور براہ راست کے مفہوم میں نہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً جو تصحیفات ہوتی رہی ہیں وہ بالغرض کسی مصلحت یا ضرورت ہی سے ہوتی ہوں گی۔ بہرحال نفس ان کے وقوع کا اعتراف کھلے خزانے سب کو ہے اور بائبل کی تنقید عالیہ (HIGH CRITICISM) ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جرمن، فرنچ، انگریزی وغیرہ میں چھوٹی بڑی صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اس موضوع پر تیار ہو چکی ہیں۔ اور مقالات و مضامین کا تو شمار ہی نہیں۔ پھر فن کئی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ انتقاد متن (TEXTUAL CRITICISM) انتقاد تاریخی (HISTORICAL CRITICISM) وغیرہ اور ہر شاخ کے الگ الگ ماہرین پیدا ہو رہے ہیں۔ کاش سید احمد خاں مرحوم (اللہ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے) آج زندہ ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ یہود و نصاریٰ کی طرف سے جس الزام کی صفائی خواہ مخواہ انھوں نے اپنے سر لے رکھی تھی اس جرم کا اقبال اب کھلے لفظوں میں بھی لوگ کس کثرت سے کر رہے ہیں۔ یورپ اب جا کر چونکا ہے اور یہ فن ابھی پچھلی صدی یعنی انیسویں صدی سے پیدا ہوا ہے۔ عرب کے اُمّی کے لائے ہوئے کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے تیرہ صدی پیشتر ہی اہل کتاب کی "کتاب" (جو لفظی ترجمہ ہے بائبل کا) کو تمام محرف اور ناقابل اعتماد قرار دیا تھا۔"[1]

(۳) سورہ بقرہ آیت نمبر:

"مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

ترجمہ: "ہم جس نشان کو موقوف کر دیتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں۔ تو (کوئی) اس سے بہتر ہی یا مثل اس کے لے آتے ہیں۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

امام راغب و بیضاوی کے اقوال نقل کرنے کے بعد پہلے آیت کے معنی و مفہوم کی وضاحت کی پھر مسئلہ نسخ پر جو علماء و مفسرین کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ ہے، تفصیل سے روشنی ڈال کر نسخ کے حقیقی معنی و مفہوم کی تعیین کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"تفسیر: آیت کا مفہوم بہت وسیع ہو۔ اس کا اطلاق آیت مکتوبی پر بھی ہوتا ہے اور نشان، دلیل، معجزہ پر بھی۔ یہاں مراد اگر دلائل و معجزات سے لی جائے جب تو آگے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کے بجائے دوسرا نشان حقانیت قرآن کا وجود میں اب بھی آتا رہتا ہے اور زمانۂ نزول میں تو خارق عادت نشانوں کی بھی کمی نہ تھی۔

البتہ اگر آیت مکتوبی ہی مراد لی جائے جب بھی دو شقیں موجود ہیں۔ آیتیں قرآن مجید کی ہوں گی یا کتب سابق کی۔ اگر کتب سابق کی آیتیں مراد ہیں، جیسا کہ ابو مسلم خراسانی کا مذہب ہے جب بھی بحث آگے نہیں بڑھتی۔ پرانی آیتوں کا قرآنی آیتوں سے منسوخ ہونا تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ جس میں نہ کوئی اختلاف ہے نہ نزاع ہاں اگر آیات قرآنی مراد ہوں تو سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ان کے نسخ سے کیا مفہوم ہے۔

نسخ سے مراد تو کسی نے آج تک یہ تو لی نہیں کہ فلاں عقیدہ کسی زمانہ میں واجب تھا اور اب وہ منافی ایمان ہو گیا یا جھوٹ، چوری، زنا، قتل پہلے حرام تھے پھر حلال قرار پا گئے۔ یا فلاں حکایت پہلے جس طرح قرآن میں بیان ہوئی تھی بعد کو اس کی تردید ہو گئی۔ غرض نسخ کی گنجائش عقائد میں، کلیات اخلاق میں، امور حسی میں، قصص گذشتہ

---

[1] تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۱۴۴ تا ۱۴۵۔

اور حکایات ماضی میں، اخبار غیب میں غرض قرآن مجید کے بیشتر حصے میں تو کوئی قائل نہیں۔ نسخ کی گنجائش جو کچھ بھی ہے لے دے کے بس باب احکام میں اور احکام کی مثال طبیب کے نسخے کی سی ہے"۔[1]

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی" (سورہ بقرہ آیت ۱۷۸)

(ترجمہ: اے ایمان والو تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کردیا گیا) کی تشریح و توضیح نہایت تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ قصاص کی اہمیت پر قدیم مفسرین کی آرا، فقہا کے اختلافات اور ان کے قانونی مباحث کو مختصراً پیش کرنے کے بعد اسلام کے اس عادلانہ قانونی حکم کا اس ضمن میں وضع کیے ہوئے قوانین سے موازنہ و مقابلہ کر کے شریعت اسلامی کی حکمت کو واضح کیا ہے۔ اور عقل و درایت کی روشنی میں اس حکم کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے بتایا کہ شریعت اسلامی کے مطابق قتل کا جرم اگر ایک طرف فوج داری سے تعلق رکھتا ہے تو دوسری طرف اس کا تعلق دیوانی سے بھی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"رومیوں کی مشرک قوم میں قتل تمام تر ایک جرم نالون فوج داری کا تھا۔ قانون دیوانی سے اسے کوئی علاقہ ہی نہ تھا۔ موجودہ فرنگی قانون چونکہ تمام تر رومیوں ہی کے قانون (رومن لا) پر مبنی ہے اس لیے اس میں بھی قتل محض ایک فوج داری جرم ہے۔ شریعت اسلامی کی نظر فطرت بشری کی گہرائیوں اور مصالح اجتماعی کی باریکیوں پر اس سے کہیں زائد ہے اس لیے اپنے اصول قانون میں یہ بات ملحوظ رکھی ہے کہ قتل جس طرح فوج داری کا جرم ہے دیوانی کا بھی ہے۔ اس جرم سے محض (اسٹیٹ) حکومت اور (سوسائٹی) ہیئت اجتماعیہ ہی کے ایک قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوتی بلکہ فرد پر بھی اس کی شخصی حیثیت سے ایک حملہ ہے۔ گویا یہ جرم ایک پبلک حیثیت رکھتا ہے اور ایک پرائیویٹ اور جب اس کی یہ ایک گونہ حیثیت ہے تو مقتول کے وارثوں یا خون کے مدعیوں کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ چاہیں تو مجرم کو پوری سزا (اسٹیٹ) حکومت سے دلائیں اور چاہیں تو خود معاوضہ لے کر اتہائی سزا سے دست بردار ہو جائیں۔ اسی مالی معاوضہ کو شریعت میں دیت یا خوں بہا کہتے ہیں۔ اس میں گھٹ بڑھ برابر ہو سکتی ہے ... آج بھی انٹرنیشنل لا میں (بین الاقوامی قانون) میں یہ بالکل جائز ہے کہ جب ایک (اسٹیٹ) ملک کی رعایا کا خون دوسرے ملک (اسٹیٹ) کے باشندوں کے ہاتھوں ہو جائے اور غیر ملک میں فوج داری کا مقدمہ چلانے میں دقتیں اور دشواریاں محسوس ہوں تو بجائے فوج داری استغاثہ اور اس کی پیروی کے صرف ہرجانہ (COMPENSATION) کی رقم پر کفایت کر لی جائے۔ یہ ہرجانہ ہی خوں بہا کے لیے ایک خوش نما اور جدید اصطلاح ہے"۔[2]

سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۸۹

"اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ"۔

ترجمہ: بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ادل بدل میں اہل عقل کے لیے (بڑی) نشانیاں ہیں۔

"تفسیر: اللہ کی توحید اور فردیت کی، اللہ کی حکمت و صنعت کی اور اللہ کی قدرت و حاکمیت کی نظام فلکی اور اس کی تفصیلات چاند سورج ستاروں کی تعداد ان کے درمیانی فاصلے ان کے باہمی تعلقات و تاثرات ان کی گردشوں کی پیمائش گہن کے اسباب و آثار ان کے طلوع و غروب، نور و حرارت وغیرہ کے قاعدے ضابطے اس قسم کی تفصیلات سے علم ہیئت کی کتابوں کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ رہی زمین تو ہیئت ارض، ساحت ارض، معدنیات ارض، کشش ارض، ہوا اور موسموں کے تغیرات معدنیات کے لیے تو کوئی ایک پورا فن بھی کافی نہ ہوا بلکہ جغرافیہ، جغرافیہ طبعی، جیالوجی، پیٹرولوجی، آرکیالوجی، خدا جانے کتنے فنون پر فنون نکلتے چلے آرہے ہیں اور حکمت باری اور صنعت باری کے اندازے اور تخمینے ختم ہونے کے قریب بھی نہیں آئے ہیں۔ آیت میں ضمناً ان مشرک قوموں کا بھی رد آ گیا جنھوں نے آسمان پر یا زمین یا رات دن کو دیوی دیوتا سمجھا ہے۔ معبودیت کی صلاحیت

---

[1] تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۱۱۳

[2] تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۱۱۳ -

ان میں کسی میں بھی نہیں یہ سب کے سب مملوک و مسخر ہیں ایک صانع اعظم کے۔"[۱]

سورہ مائدہ آیت نمبر ۲:

"وَاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ"[۲]

ترجمہ: اور تمھیں وہ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو کبھی نہیں دیا گیا تھا۔

"تفسیر: یہ نعمت عظمیٰ نعمت توحید ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اقوام عالم میں نسلی و قومی حیثیت سے توحید اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ ورنہ اور قومیں من حیث القوم شرک ہی میں مبتلا رہی ہیں۔ ہمارے مفسرین کو اس مضمون کی آیتوں کی تفسیر میں بڑی دشواری یہ پیش آتی رہی ہے کہ اگر بنی اسرائیل کو سب سے افضل مان لیا جائے تو پھر امت محمدی کے لیے کون سا مقام باقی رہ جائے گا؟ اشکال اور دشواری کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہے۔ یہاں مقابلہ تو دنیا کی ساری قوموں اور نسلوں کا ہو رہا ہے ان میں بے شک سب سے افضل و اشرف نسل اسرائیلی ہی ہے۔ کہ بہ خلاف دوسری قوموں کے شرک اور وہم پرستیوں کے توحید اور اس کے لوازم یعنی رسالت، وحی، حشر وغیرہ عقائد صحیحہ کی حامل دنیا کی تاریخ میں یہی ایک قوم رہی ہے۔ بخلاف اس کے امت محمدی تو کسی قوم یا نسل کا نام ہی سرے سے نہیں۔ یہاں تو اسرائیلی، اسماعیلی، حبشی، چینی، روسی، جاپانی جو کوئی بھی عقائد اسلامی پر ایمان لے آئے وہی امت محمدی میں داخل ہے۔ اس پر مفصل حاشیے "اِنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ" کے تحت میں سورہ بقرہ کے رکوع ۵، ۶ میں گزر چکے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل اللہ کے خاندان میں سے ہونا ایک نعمت ہے جس پر شکر واجب ہے، کیونکہ اس تعلق سے دین اس پر سہل ہو جاتا ہے البتہ اس پر فخر اور گھمنڈ روا نہیں۔"[۳]

سورہ انفال آیت نمبر ۴۵:

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ"

"اے ایمان والو جب تم کسی جماعت (مخالف) کے مقابل ہوا کرو تو ثابت قدم رہا کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہا کرو تاکہ فلاح پاؤ۔"

"تفسیر: یہ حکم عام ہے۔ یہاں یہ بتا دیا گیا کہ فلاح کا ذریعہ بھی ثبات قلب ثبات قدم کا اجتماع ہے اور فلاح کے عموم میں شخصی و اجتماعی، دینی و اخروی ہر قسم کا فلاح آ گیا۔ اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً اس لقاء یا مڈبھیڑ ہو جانے سے مراد جہاد میں سامنا ہو جانا ہے۔

فَاثْبُتُوْا یعنی پست ہمتی اور بزدلی نہ دکھاؤ بلکہ ان دشمنان دین کے سامنے جم جاؤ۔ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا قلب میں قوت و ثبات اسی ذکر الٰہی اور کثرت ذکر سے پیدا ہوگی۔

امرھا الذکر حتی یثبت القلب علی الیقین ویثبت اللسان علی الذکر (قرطبی) خوب غور کر لیا جائے کہ لشکر اسلام کو یہ حکم نہیں ہوتا کہ اپنے وطن کی یا اپنے قبیلہ کی جے پکارو یا اپنے لیڈروں کے نام کے نعرے لگاؤ بلکہ اس نازک گھڑی میں جب موت سامنے کھڑی ہو اللہ ہی کو پکارے جاؤ ــــ زمین کے ٹکڑوں کے واسطے، ملک و مال کے واسطے، رنگ و زبان کے واسطے، لڑنے والوں سے، ان لوگوں کے طریقے بالکل دوسرے ہوتے ہیں۔ جو محض اللہ کے دین کی خاطر اپنی جانیں دینے کو نکلتے ہیں۔ ان کو جغرافی، سیاسی بحثوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، یہ جان دیں گے تو اپنے ملک و وطن کا جھنڈا اڑاتے نہیں، بلکہ اللہ کے نام کی بلندی پکارتے، اور اسی کا ذکر جلی و خفی کرتے ہوئے، مولوی معنوی کا ایک شعر تھوڑے تصرف کے ساتھ ؎

دین مسلم از ہمہ دینہا جدا است
مسلماں را مذہب و ملت خدا است

زنا پسند اور شراب نوش "ماڈرن" لشکریوں سے ان اللہ والوں اور خدا شناس درویشوں کو کچھ بھی مناسبت ہوتی ہے۔"[۴]

آیات قرآنی کے ترجمے اور تفسیر کے منقولہ صدر اقتباسات سے مولانا کے ترجمہ نگاری و تفسیر نویسی کے انداز و اسلوب، ان کے طریق بحث و استدلال، ان کے شگفتہ و شیریں اور لطف انداز بیان، قدیم و جدید تفسیری مباحث کے سلسلے میں ان کی وسعت نظر اور عصری علوم پر ان کی عالمانہ نظر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "تفسیر ماجدی" یقیناً مولانا کا ایک عظیم کارنامہ ہے جو انھیں دنیائے اسلام میں ایک جلیل القدر شارح و مفسر قرآن کی حیثیت سے اور ادبی دنیا میں ایک باکمال اور منفرد نثر نگار کے طور پر زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

★

---

[۱] تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ۶۸۳ - [۲] تفسیر ماجدی، جلد دوم، ص ۲۲۱ تا ۲۲۲ [۳] ″ ″ [۴] ″ ص ۹۶۲ -

ڈاکٹر ایم کے قدوائی

عصرِ حاضر کا صوفی

خوش خلقی تصوف کا دوسرا نام ہے۔ عام طور پر خوش خلقی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک خدا کے ساتھ دوسری مخلوق کے ساتھ اور یہ دونوں صفتیں طالب کی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی رضا و ناراضگی سے متعلق ہیں۔ تصوف، سخاوت و رضا، زہد و اتقاء صبر و ایثار اور غربت و قناعت کا احاطہ کرتا ہے۔ صوفی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام حالات ظاہری و باطنی حق تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہوں اور وہ خود کو رضائے الٰہی کے لیے وقف کر دے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ مولانا ماجد دریابادی کا بھی تھا۔ ان کی جستجو آواز حق تھی، اور پوری زندگی وہ تلاش حق میں سرگرداں رہے۔ جوں جوں وہ ظاہری و باطنی علم کی پیاس بجھانے کی کوشش کرتے، تشنگی اور بڑھ جاتی۔ تقریباً ساٹھ سال تک تالیف و تصنیف کے کاموں میں منہمک رہے اور جنبش قلم سے تراجم، تصانیف، سوانح، تفسیر و تنقید کے نقوش دنیائے ادب کے کینوس پر بکھیرتے رہے۔ ان کے سادہ اسلوب، طرز تحریر، تیر و نشتر سے بھرپور تنقید، سلیس اور چھوٹے چھوٹے جملے اور دلکش انداز بیان سے جو اضافہ ادب میں ہوا اس کی مثال اس نصف صدی میں ملنا مشکل ہے۔

مولانا نے پیغام حق، خدمت خلق، راست گوئی، درس و تدریس اور تبلیغ کے لیے خانقاہ کے بجائے قلم و قرطاس کو چُنا۔ انسانیت کا پیغام ان کا مسلسل مشن تھا۔ زندگی کا آغاز زندقی تعلیم سے ہوا۔ درمیان میں ایک ایسا دور بھی آیا کہ الحاد سے وابستگی اور مذہب سے بیزاری ہر طرح سے ظاہر ہونے لگی۔ لیکن اس وقت الحاد و دہریت کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے دیانت داری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ اپنے لامذہبی دلائل ذہانت، قوت فکر اور وقار علم کے بل پر ناقدین کو قائل کرنے کی جد و جہد کرتے لیکن انھوں نے مذاہب کے ادب و احترام آزادی و انفرادیت کو کبھی بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ قریب تھا کہ مولانا الحاد کی منزلوں کی آخری حدوں کو چھو لیتے کہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا، مذہب اسلام کا جادو ان پر بھی چل گیا۔ عقائد میں تبدیلی آئی اور انھوں نے خود کو رضائے الٰہی کے سپرد کر دیا۔

مولانا اپنی کم عمری میں ہی اس وقت کے مشاہیر علم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علامہ شبلی، مولانا سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری اور ابو الکلام آزاد ادب و اسلامیات کے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی کا بذلہ آموز اور ظرافتانہ کلام زبان زد عام ہو چکا تھا اور آسمان سیاست پر مولانا محمد علی اور مولانا ظفر الملک جیسے آفتاب اپنی استقامت اور سیاسی سوجھ بوجھ کے ساتھ چمک رہے تھے اور سب کا اپنا ایک منفرد مقام تھا۔ ایسے ماحول میں مولانا کی زندگی پر ان بزرگوں کی رفاقت کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا اشرف علی تھانوی کا فیض و کرم سایہ کئے ہوئے تھا۔ سب کی نگاہیں اس

آزاد منش، الحاد کے علمبردار کی طرف لگیں تھیں اور وہ مولانا کے اندر چھپے ایمان ولیقین کا کرشمہ دیکھنے کے منتظر تھے۔ یہ کمال اس صوفی صفت ذات کا تھا کہ وہ ان تمام قوتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔

قدرت نے ان کو ذوق سلیم، ذہانت، قدرت بیان، ادبی مذاق، تنقیدی صلاحیت اور ریاضت عطا کر کے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ ان ہستیوں سے ایک ساتھ کما حقہ استفادہ کر سکیں۔ اس انفرادیت، صوفیانہ روش اور منفرد اسلوب نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے۔

فلسفہ مولانا کا محبوب ترین موضوع تھا ان کو اس پر جتنا بھی مواد ملا پڑھ ڈالا ہندو فلسفہ پڑھنے کا بھی شوق ہوا۔ اس وقت ہندو فلسفہ پر مستند لکھنے والوں میں مسز اینی بیسنٹ، ڈاکٹر بھگوان داس، اربندو گھوش اور رابندر ناتھ ٹیگور سر فہرست تھے مولانا کے زیر مطالعہ ان سب ہی کی تصانیف آئیں۔ ہندو فلسفہ پڑھنے سے مولانا کم از کم اتنا ضرور متاثر ہوئے کہ ان کے سامنے مادیت اور روحانیت کا نمایاں فرق ابھر کر سامنے آ گیا اور وہ مادیت کی مرکزیت کو کمزور سمجھنے لگے، گیتا کے مطالعہ نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور روحانیت مادیت پر غالب آنے لگی، وہ ہندو تصوف کے بڑے دلدادہ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے مثنوی روم ہاتھ لگ گئی جس نے مولانا کی زندگی میں کایا پلٹ کر دی اور وہ بعض مذہب اور فلسفہ اسلام کی جستجو میں غرق ہو گئے۔

حضرت اکبر الہ آبادی نے بھی یہ مدارج طے کرنے میں مولانا کی بڑی مدد کی۔ اگرچہ اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی نے جن سے وہ بے انتہا عقیدت رکھتے تھے بلکہ کبھی بھی اسلام کی تبلیغ نہ فرمائی پھر بھی بالواسطہ وہ مولانا کی ذہنی تربیت کرتے رہے۔ بالآخر مولانا اشرف علی تھانوی کے روحانی فیض نے مسٹر ماجد دریا بادی کو مولانا صوفی عبدالماجد دریا بادی بنا دیا۔

یورپ کے مستشرقین اور مفکرین نے نہ صرف اسلام، قرآن اور محمد صاحب کے سلسلہ میں اپنی تحریروں سے قارئین کا ایمان متزلزل کیا بلکہ انھوں نے تصوف اور فلسفہ کو بھی نہ بخشا اور واقعات، عقائد و نظریات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ مولانا بھی اسی دام فریب کا شکار ہو گئے لیکن حق و انصاف اور ایمان کی شمع کی لو جو مدھم ہو گئی تھی اللہ کے عفو و کرم اور بزرگان دین کے روحانی فیض سے تیز اور پھر تیز تر ہو گئی۔ اسلامی علوم کے مطالعہ نے نظریات و عقیدت میں پختگی اور وسعت پیدا کی۔ مولانا نے ایک صوفی کی طرح زندگی کا مشن متعین کیا اور لگن کے ساتھ راست بازی، امن پسندی، بھائی چارگی، دیانتداری اور ضبط نفس کا درس دینا شروع کیا۔

ایک صوفی کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ مولانا میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ زندگی کی تربیت، تنظیم، اصول و ضوابط، نظم و نسق، پاکیزگی، صداقت، عقیدت و شفقت اور مختلف خیال و افکار سے ایمان داری کے ساتھ نباہ ایسی صفات تھیں جو ان کی ذات میں مرکوز تھیں۔

وہ ایک صوفی کی طرح اعلیٰ صفات کے حامل رہے، موجودہ دور کے مدوجزر کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور سکوت و سکون کا مظاہرہ مستقل مزاجی سے کیا۔ زندگی کا آخری حصہ درویشانہ گذرا۔ مولانا اگر چاہتے تو بہت سے بہتر مواقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے اور بوریہ نشینی چھوڑ کر اقتدار کی کرسی پر فائز ہو سکتے تھے، لیکن فقیر منشی اور شان بے نیازی ہمیشہ مانع رہی۔ اس سلسلے میں مولانا مخالفین کے عناد سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے قرآن کا حوالہ دیتے ہیں:

"تم اپنے کام سے کام رکھو، اپنی اصلاح میں لگے رہو استقامت علی الحق کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دو۔ تمھارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

(تفسیر ماجدی ص ۶۳۵)

وہ ہمیشہ ایک صوفی کی طرح طوفان و حوادث سے ٹکر لیتے رہے، روزمرہ کے واقعات کی طرف عوام کی توجہ مبذول کرانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ نیکی کی تلقین، راست گوئی کی نصیحت

اور برائی کی نشاندہی کرنا انھوں نے ہمیشہ اپنا فرض اولیں سمجھا۔ وہ معیار زندگی کی موجودہ بلندی کو معیار اخلاق گرنے کی وجہ تعبیر کرتے۔ دولت و ثروت کو دنیاوی فتنہ اور معیار زندگی کی بلندی کے معنی وہ اسراف بے جا، نمائش، و خود پرستی سے لیتے اور اسے ضبط نفس و خودداری کا دشمن تصور کرتے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسراف اور مزید اسراف کی تاکید کرتے خود انسانیت کو شرم آنے لگتی ہے۔ اس لیے نفس نے اس کے لیے ایک خوش نما لفظ معیار زندگی کی بلندی" کیسا گڑھ لیا۔ اور اس کی بلا تکلف تبلیغ و تلقین شروع کر دی۔"

(صدق جدید جلد ۱۲ صفحہ ۴)

ایک دوسری جگہ معیار زندگی کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"اگر صرف نام کی تبدیلی حقیقت کو بدل سکتی ہے تو جتنا چاہیے معیار زندگی کو بلند کرتے جائیے افلاس اور مزید افلاس میں مبتلا ہو کر ناگفتہ بہ برائیوں کا ارتکاب کرتے جائیے اور کبھی نہ شرمائیے۔ انقلاب جب آتا ہے تو محض سیاسی حدود تک محدود نہیں رہتا اور طرز حکمرانی کے تغیر پر کفایت نہیں کرتا۔ اس کے لئے ناگزیر سا ہے کہ وہ زندگی کے موتشل (معاشری) پہلوؤں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔ اور اس کے بعد یہ کہ قوم کے اخلاقی دینی و روحانی نظام پر بھی ہاتھ ڈالے اور بہت سی اعلیٰ قدروں کو پامال کر کے رکھ دے۔"

(صدق جدید جلد ۱۲ صفحہ ۲)

ان کا سب سے بڑا کارنامہ دنیاوی علوم کی روشنی میں قرآن کے پیغام کی وضاحت تھا، خاص موضوع قرآنیات ہونے کی وجہ سے قرآن کی تفسیر میں بھی یہ پہلو اجاگر ہے۔ اور تصوف سے لگاؤ بھی جابجا عیاں ہے۔ وہ نافرمانوں، باغیوں اور بدکاروں کی خوشحالی و فارغ البالی اور نیکوکاروں و اطاعت مندوں کی محرومی پر ناقد۔ بن کو نہایت ہی سلجھا ہوا جواب پیش کر کے دیندار دل کی راہنمائی کرتے ہیں۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی کی رائے نقل کرتے ہیں:

"کفار و فجار جس سامان کو راحت کے لیے جمع کرتے ہیں اس میں ان کو راحت نہیں، محض جمع و حفاظت کی مشقتیں ہیں اور پھر چونکہ اعتقاد و احیاء اور تعلق مع اللہ سے محروم ہیں اس لیے ان مشقتوں میں تسلیل بھی نہیں ہوتی۔"

ایک دوسرے فقیہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کافروں، فاسقوں کی ظاہری نعمتوں کو دیکھ کر ان کے حال کو اچھا سمجھنا اور ویسی ہی کیفیت کی تمنا کرنا حرام ہے۔"

(تفسیر ماجدی صفحہ ۳۰۹)

مولانا کی تصنیف "تصوف اسلام" ایک جامع اور مکمل تاریخ ہے اور دستاویزی حیثیت رکھتی ہے یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ عوام کی مانگ پر بار بار چھپوانا پڑی۔ تصوف پر تصنیف فیہ ما فیہ (مخطوطات رومی) کو مولانا نے ایڈٹ کیا جس میں تشریحات و حواشی نوٹس کا اضافہ کیا اس کے علاوہ خطبات ماجدی حدیث و ادعیہ اور سوانح مولانا اشرف علی تھانوی ایسی تصانیف ہیں جن میں صوفی، منشی، بزرگ کا مسلک پورا ہوتا نظر آتا ہے۔

وہ ایک صوفی کی طرح مصیبت کو راحت کا ذریعہ مانتے تھے۔ ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں:

"ذرا نظر دوڑائیے تو معلوم ہو جائے کہ اپنے گرد و پیش رہی ایک سے بڑھ کر ایک دکھی اور مصیبت زدہ پڑے ہیں۔ اور پھر مصیبت کے عوض راحتیں اور نعمتیں کیسی کیسی رکھ دیں ہیں۔ لازوال اور بے انتہا ایسی کہ انسان اگر خواب میں بھی دیکھ پائے تو مصیبتوں کا الٹا طالب اور حریص ہو جائے۔ امتحان بھی ہمیشہ ہر بشر کے ظرف کے مطابق ہوتے ہیں۔ جس کا امتحان جتنا سخت ہو وہ یقین کرے کہ اس کا ظرف بھی اسی درجہ عالی و وسیع ہے اور صلہ و اجر بھی اسی مناسبت سے اسی پیمانہ پر مل کر رہے گا۔"

(صدق جدید جلد ۱۴ صفحہ ۴۶)

مولانا طبیعتاً و عملاً صوفی تھے۔ اپنے خرچ و آمدنی میں توازن رکھتے۔ ہر حال میں صبر و شکر کے ساتھ قانع رہے۔ ان کے اخلاق و عادات کی کئی عملی مثالیں ہیں جس سے ان کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ مثلاً اپنی چاروں لڑکیوں کی شادیاں نہایت ہی سادگی کے ساتھ چار بھتیجوں سے کر دیں۔ ان میں دو شادیاں تو صرف دو ایک دن ہی میں بات چیت اور انتظام کے تمام مراحل سے گزر گئیں۔ ایک دوسری مثال اس زمانہ کی لی جا سکتی ہے جب کہ ان کی پنشن بند ہو گئی تھی۔ محدود آمدنی کے پیش نظر مولانا نے گوشت کھانا ترک کر دیا تھا اور وہ اس وقت تک اپنے عہد کے پابند رہے جب تک کہ ان کے مالی حالات ٹھیک نہ ہو گئے۔

مولانا کو ابتدا ہی سے اسلامی سیاست سے دلچسپی تھی لیکن ۱۹۱۷ء میں جب مسز اینی بیسنٹ نظر بند ہوئیں تو وہ سیاست کی طرف زیادہ راغب ہونے لگے اور کانگرس کے ہوم رول کے حامیوں میں شامل ہو گئے اور اسی زمانے میں انھوں نے ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں ستیہ گرہ اور اسلام پر مضمون لکھا۔ جب علی برادران کراچی کے مقدمہ میں سزایاب ہوئے تو وہ تحریک خلافت کے بے دام غلام ہو گئے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے اور پھر ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے۔ مولانا محمد علی کی وفات کے بعد سیاست سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ اس ترک تعلق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شور و شغب سے گھبراتے تھے اور تصنیف و تالیف کے لیے سکون کے متلاشی تھے۔ حالانکہ ایسا نہ تھا کہ یہ صوفی منش بزرگ سیاست کے پیچیدہ مسائل سے بے بہرہ تھے۔ لیکن طبیعت کی سادگی، ظاہر و باطن کو پرکھنے کی صلاحیت اور شہرت سے بے نیازی نے کبھی بھی انھیں فروعات میں ملوث نہ ہونے دیا۔ وہ سیاست کو کمتر درجہ کی چیز سمجھتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ حق گوئی و صدق پر مہر ثبت کرنے کا سودا کسی حالات میں کرنے کو تیار نہ تھے۔ انھیں ملت کی زبوں حالی اور معاشرہ کا شیرازہ منتشر ہونے کا احساس تھا۔ وہ سیاست میں پڑ کر اس سے مغلوب لوگوں کی فہرست میں اپنا نام نہیں شامل کرانا چاہتے تھے۔ نتیجے کے طور پر ان کے خیالات باغیانہ ہو گئے۔ آخری عمر میں مزاج میں شدت پیدا ہو گئی اور وہ سرفروشوں کی صف میں نظر آئے۔

رُشد و ہدایت کے علمبردار ہر زمانے میں آتے رہے۔ ہر ایک نے اپنی لیاقت، استعداد اور علم کے ذریعہ ماحول کو متاثر کیا اور لوگوں کو رضائے الٰہی کی طرف راغب کرنے کی کوشش جاری رکھی نیز اذہان کی ترتیب کے ذریعہ مذہبی ماحول قائم رکھا۔ مولانا بھی ان ہی مفکرین اسلام اور اکابرین ملت کے سلسلے کی ایک کڑی تھے انھوں نے خاص طور سے پڑھے لکھے نوجوان طبقہ کو للکارا اور اسلامی تعلیمات کو سائنٹفک انداز سے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اگرچہ مخالف عناصر ہمیشہ سر اٹھاتے رہے لیکن مولانا نے کبھی ان کی پرواہ نہ کی۔ وہ اپنے مشن میں شان بے نیازی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ مولانا ایک صوفی کی طرح اظہار حق میں ہمیشہ بے باک رہے اس فرض کی ادائیگی میں وہ کسی رد و رعایت سے کام نہ لیتے تھے۔ وہ بُری بات سے چشم پوشی کرنا گناہ اور اچھی بات کی تعریف نہ کرنا بخل سمجھتے تھے۔

مولانا نے اگر ایک طرف ادب، فلسفہ، سماجی و اصلاحی تصانیف و مضامین کے ذریعہ دنیائے ادب میں ایک مستقل جگہ بنالی تو دوسری طرف تفسیر ماجدی اور تصوف اسلام لکھ کر عاقبت کا انتظام بھی کر لیا۔ ان کے پرستار نہ صرف ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے بلکہ بیرونی ممالک میں بھی موجود تھے۔ لیکن وہ شہرت سے بے نیاز صوفی سے سالک اور سالک سے مجذوب تک کی منزلیں خاموشی سے طے کرتے رہے۔

★

ڈاکٹر انوار الحسن

مولانا عبد الماجد دریابادی
سائنسی تحقیق کے زمانے کے بلند مرتبہ مفسر قرآن

مولانا عبد الماجد دریابادی جنھیں موجودہ سائنسی تحقیق کے زمانے کا بلند مرتبہ مفسر قرآن ہونے کا شرف حاصل ہے، کسی دینی مدرسہ یا مشرقی طرز کے گہوارۂ علم کے سند یافتہ نہیں۔ وہ مغربی علوم و معارف کے متجاد اور مغربی طرز تعلیم ہی کی پیداوار تھے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی طرح انھوں نے بھی یورپی علوم سے بجا استفادہ کیا اور اسے یورپ کے عقائد، مذاہب، اخلاق، رسوم، توہمات اور فلسفہ کی مدافعت و تردید کے لیے بڑی جرأت مندی اور حکمت کے ساتھ استعمال کیا۔ ان کی زندگی میں ایک ایسا بھی دور گزرا جب وہ الحاد اور بے دینی میں مبتلا تھے۔ مذہب سے بیزار، خدا کے منکر اور مذہبی تعلیمات سے متنفر، فلسفہ کے دلدادہ اور فلسفیانہ عقائد کے مبلغ پھر تشکیک کا دور ختم ہوا اور ان کا دل و دماغ الحاد و بے دینی سے نکل کر قرآن کی ضیا پاشیوں سے منور ہوا۔ یہاں نہ اس کے اسباب و علل سے بحث کرنا مقصود ہے اور نہ یہ موضوع گفتگو ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ضرور حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی کوشش سے مشرقی علوم و معارف میں بھی ایسی دست گاہ پیدا کر لی جس کی وجہ سے انھیں صف اوّل کے علما و فضلا میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

مولانا یقیناً عبقری نسل کے انسان تھے اور ان کی شخصیت بڑی متنوع، رنگا رنگ اور پہلو دار تھی۔ ادیب، انشا پرداز، صحافی، فلسفی، سوانح نگار، مترجم، مفسر، نقاد، مصلح اور مبلغ ——— بیک وقت اتنے پہلو ان کی شخصیت میں موجود تھے۔ قدرت سے ذہن رسا اور فکر صائب کے ساتھ ساتھ قلم کی توانائی انھیں حاصل تھی جس کا انھوں نے بھرپور استعمال کیا اور ہر طرف اپنے نام کا سکہ رائج کر دیا بسطور ذیل میں ان کی شخصیت کے اس تابناک پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جس کی اہمیت اور افادیت نہ صرف عصر حاضر کے لوگوں کے لیے اہم اور مفید ہے بلکہ جب تک اسلام کے نام لیوا باقی رہیں گے اس سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہے گا۔

"تفسیر" عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی کسی کلام کی تشریح توضیح کرنا ہیں۔ یہ بڑا مشکل فن ہے۔ کیونکہ تشریح و توضیح کرنے والے کو کلام کے سیاق و سباق سے کما حقہ واقفیت کے ساتھ اس کی نظر اس کے پس منظر، اس کے نتائج، حکمت اور اس میں پنہاں رموز و نکات پر بھی ہونا ضروری ہے۔ زمانہ بدلتا ہے تو اس کے ساتھ حالات اور خیالات بدلتے ہیں۔ ہر زمانہ کے کچھ اپنے عصری تقاضے، مسائل، افکار، علوم، رواج اور حالات ہوتے ہیں۔ کل جن مصالح سے ایک بات کہی گئی، ضروری نہیں کہ وہی مصالح آج بھی موجود ہوں۔ کل تک علوم و معارف جس منزل پر تھے آج وہاں سے کہیں اور پہونچ چکے ہیں۔ نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ زبان کے محاورے اور الفاظ کے معنی میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہر زبان کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے، طرز بیان اور اظہار خیالات کا انداز ہر زبان میں مختلف ہوتا ہے ——— ایک شارح کو یہ سارے ہفت خوان طے کرنا ہوتے ہیں۔ بشری کلام کی تشریح جب اتنی دشوار ہوتی ہے تو کلام الٰہی کی تشریح

کی دشواریوں کا اندازہ لگانا ہی دشوار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

قرآن پر ایمان لانے والے ہی نہیں، اس کے معترضین اور منکرین کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ "قرآن دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔" آپ اسے کلام الٰہی اور آسمانی کتاب مانیے یا نہ مانیے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چودہ سو سال سے اس مقدس کتاب کے معانی و مطالب پر غور و خوض کا سلسلہ جاری ہے اور ان غور و خوض کرنے والوں میں صرف فرزندانِ توحید ہی نہیں بلکہ وہ لوگ سب سے پیش پیش رہے ہیں جن کے عقائد پر قرآنی تعلیمات کی سب سے زیادہ ضرب پڑی ہے۔ غور و خوض کرنے والوں نے حروف و الفاظ کی تعداد سے لے کر معانی و مطالب اور رموز و اسرار کے ہر گوشہ کو کھنگال ڈالا اور یہ سلسلہ دنیا کے مختلف ملکوں میں مختلف زبانوں میں آج تک جاری ہے۔ ہر غواص اپنی صلاحیت و استعداد کے بموجب اس قلزم بے پایاں سے موتی نکالتا ہے اور نکالتا رہے گا۔

قرآن عربی زبان میں ہے اور زبان و ادب کے اعتبار سے بھی اسے ایک شاہکار کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی یہ انفرادیت اپنی جگہ بیحد اہم ہے کہ "وہ بیک وقت ایک آفاقی صحیفۂ ہدایت بھی ہے اور ایک متعین ملک و قوم اور متعین ماحول کے لیے مخصوص بھی۔" اسی لیے اس کی تشریح و تفسیر بیحد دشوار اور بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ حکیمانہ کتاب انسانوں کے لیے ایک ابدی ضابطۂ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لیے اس کا اندازِ بیان بڑا ہی حکیمانہ لچکدار اور اشارات و کنایات سے بھرپور ہے تاکہ ہر زمانے کے لوگ اپنے فکری ماحول کے بموجب اس کی تعبیر و تشریح کر سکیں۔ ہر زمانے کا فکری ماحول اپنے عصری علوم کے ساتھ ارتقاء پذیر اور تغیر پذیر ہوتا ہے۔ ایک زمانے کا فکری ماحول یونانی فلسفہ سے حد درجہ متاثر تھا اور آج سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے تمام قدیم نظریات کو بدل دیا ہے۔ علوم ارتقاء پذیر ہیں اور علوم کے ارتقاء سے فکری ماحول کا تغیر پذیر ہونا لازمی ہے۔ کسی بات کی افہام و تفہیم کے لیے عصری علوم پر گہری نظر ہونا ضروری ہے تاکہ مفسر کی تفسیر اور شارح کی تشریح زیادہ سے زیادہ استفادہ کا باعث بن سکے۔ مولانا دریابادی ایک ممتاز عالم دین اور دانشور تھے جن کی نظر عصری علوم پر گہری تھی۔ انھوں نے اپنی معرکۃ الآراء "تفسیر ماجدی" میں اپنے قلم کی پوری توانائی کے ساتھ ایک کامیاب مفسر کا حق ادا کر دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے چودہ سو سال سے آج تک قرآن پاک کی تفسیر و تشریح اور افہام و تفہیم کا سلسلہ دنیا کی مختلف زبانوں میں جاری ہے۔ عربی زبان میں بے شمار تفسیریں لکھی گئیں جن میں ابن جریر الطبری کی تفسیر "جامع البیان" مشہور نحوی محمود بن عمر زمخشری کی "الکشاف" فخر الدین رازی کی "التفسیر الکبیر"۔ ابو محمد عبداللہ بن احمد القرطبی کی "تفسیر قرطبی" قاضی البیضاوی کی "تفسیر بیضاوی"۔ آلوسی بغدادی کی "روح المعانی" اس فن کی معرکۃ الآراء کتابیں ہیں۔ فارسی تفاسیر میں تفسیر طبری کا فارسی ترجمہ اور ملا حسین واعظ کاشفی کی "تفسیر حسینی" اپنی جامعیت کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں۔ اردو زبان میں تفسیری سرمایہ کچھ کم نہیں۔ اب تک چھوٹی بڑی بکثرت تفاسیر لکھی جا چکی ہیں۔ جن میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی "بیان القرآن" فتح محمد تائب لکھنوی کی "خلاصۃ التفاسیر" مولانا امیر علی ملیح آبادی کی "تفسیر مواہب الرحمٰن"۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا ترجمہ "تفسیر مظہری"۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی "تفہیم القرآن" اور مولانا ابو الکلام آزاد کی "ترجمان القرآن" قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادی خصوصیت کے لحاظ سے اہم ہے اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی "تفسیر ماجدی" اس سلسلہ کی ایک بہت اہم کڑی ہے جسے اردو زبان کے تفسیری سرمایہ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ عصری علوم کی مدد سے مولانا کے جادو نگار قلم نے اس ابدی

صحیفۂ ہدایت کے اسرار و رموز کی پردہ کشائی اس طرح کی ہے کہ بیسویں صدی ہی نہیں آنے والی صدیوں کے لوگ بھی اس کی افادیت و اہمیت سے انکار نہ کر سکیں گے۔ سائنس کے نئے نئے اکتشافات کے زمانے میں قرآن کی ابدی تعلیمات کو فرسودہ اور غیر عصری سمجھنے والوں کے لیے "تفسیر ماجدی" یقیناً ایک "نسخۂ کیمیا" ہے جس میں فاضل مفسر نے عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام کی آفاقی اور ابدی تعلیمات کو بڑے ہی دلنشیں اور موثر انداز میں پیش کیا ہے جو ایک طرف مغربی طوفان الحاد و بے دینی کا بھرپور سدباب کرتا ہے تو دوسری طرف اسلام کی حقانیت و صداقت کا لوہا منواتا ہے۔ سطور ذیل میں اس بلند پایہ تفسیر کے چند اقتباسات صرف نمونۂ تحریر کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں۔ جن سے اس تفسیر کی اہمیت اور مفسر کی محنت و خدمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیۂ کریمہ "ذالك الكتاب لا ريب فيه" کی تفسیر میں "کتاب" کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"محض زبانی یادداشتوں یا روایتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ باضابطہ دستاویز نوشتہ۔ ایک صحیفۂ مکتوب قرآن مجید اپنا پہلا تعارف اسی حیثیت سے کراتا ہے کہ وہ ضبط تحریر میں آیا ہوا ایک کتابی شکل میں مرتب، صحیفۂ آسمانی ہے۔ وہ دوسرے مذہبوں کی کتب الہامی کی طرح نہیں کہ صاحب مذہب کے دماغ میں ان کے صرف معانی و مطالب ہوں، اور کوئی راوی ان سے کوئی ٹکڑا نقل کرے اور کوئی کچھ، اور یہاں تک کہ صدیوں بعد جب نوبت جمع و کتابت کی آئے تو صحت لفظی اور استناد حرفی تو خیر بہت دور کی چیز ہے، نفس مفہوم و معنی تک مسخ ہو کر رہے اور نام تو ایک کتاب کا ہو، لیکن اس کی ترتیب و تالیف میں خدا معلوم کتنے انسانی دماغ اور بشری قلم شریک ہو جائیں۔

دلائل و شواہد کو چھوڑیئے، محض دعویٰ کی حد تک بھی تو اس باب میں قرآن کی حریف و مقابل دنیا کی کوئی بھی الہامی کتاب نہیں۔ توریت، انجیل، وید کسی کا بھی یہ دعویٰ نہیں کہ وہ لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف نازل شدہ کتاب ہے اور قرآن کے پیرو انھیں اس حیثیت سے پیش ہی کر رہے ہیں۔ یہ دعویٰ تنزیل لفظی کا تو صرف قرآن مجید ہی کا ہے۔ آج دنیا میں، اس کا اور قلم کے دور میں "کتابیں" (بہ صیغۂ جمع و عموم جتنی بھی تیار کر ڈالی جائیں "الکتاب" (بہ صیغۂ واحد بہ تخصیص الف و لام) یا "کتاب واحد" کا مصداق صرف قرآن ہی نکلے گا۔ زمخشری معتزلی کا مرتبہ اللہ بلند کرے کیا خوب بات کہہ گیا ہے:

"معناہ ان ذالك الكتاب هو الكتاب الكامل كان ما عداه من الكتاب فى مقابلة ناقص"
(کشاف)

"مطلب یہ ہے کہ کتاب تو بس یہی ایک کتاب کامل ہے اور اس کے سامنے کتابیں جتنی بھی لائی جائیں گی سب ناقص ہی ہوں گی۔

زمخشری متوفی ۵۳۸ھ بہرحال مومن و خادم قرآن تھے اور آج سے آٹھ یا ساڑھے آٹھ سو سال قبل کے مومن۔ اگر وہ یہ کہہ گئے تھے تو انھیں کہنا ہی چاہیے تھا۔ یہ دیکھیے کہ قرآن کا منکر اور مادیت و عقلیت کا پرستار اور وہ بھی اس بیسویں صدی کا، کیا کہہ رہا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم کی شہادت ہے کہ قرآن " THE MOST WIDELY READ BOOK IN THE WORLD."

وہ کتاب ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔
(بحوالہ جلد ۱۵ صفحہ ۸۹۸)

اور پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر ہٹی کا بیان ہے کہ قرآن "عہد آخریں کی کتابوں میں سب سے کم سن ہے، لیکن دنیا میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی یہی ہے (بحوالہ تاریخ اہل عرب صفحہ ۱۲۶. مطبوعہ ۱۹۳۷ء)"

اسی سورۃ البقرۃ کی آیت کریمہ "واذ ابتلى ابراهيم ربه بكلمات فاتمهن" کی تفسیر لکھتے ہوئے لفظ "ابراہیم" کا ذیل،

حاشیہ ملاحظہ ہو:

یہ نام پہلی بار قرآن میں آیا ہے۔ قرآن کے مخاطب اوّل عرب تھے، جو شخصیتیں ان کے لیے معلوم و معروف تھیں، قرآن ان کے نام کے سامنے بے تکلف، بغیر کسی مزید تعارف کے لے آتا ہے۔ اور پھر ابراہیمؑ تو وہ بزرگ تھے جن سے علاوہ مشرکین عرب کے یہود و نصاریٰ بھی خوب ہی واقف تھے۔ ان کا تعارف اور بھی غیر ضروری تھا۔ یہ ابراہیمؑ وہی ہیں جو اسلامی عقیدہ کے علاوہ یہودی و نصرانی عقیدہ میں بھی بڑے جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں۔ توریت میں آپ کا نام ابرام اور ابراہم دونوں طرح سے آیا ہے۔ توریت کی روایت ہے کہ آپ کے اور نوحؑ کے درمیان دس پشتوں کا فرق ہوا ہے یعنی آپ نوحؑ کی گیارہویں پشت میں تھے۔ لیکن خود توریت ہی کے شارحین کا خیال بعض قوی قرائن کی بنا پر یہ ہے کہ توریت میں نسب نامہ کی کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں۔ سال ولادت سر چارلس مارسٹن۔ محقق اثریات کی جدید ترین تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ء ق۔م ہے اور عمر شریف توریت میں ایک سو پچھتر (۱۷۵) سال درج ہے۔ سال وفات اس حساب سے ۱۹۸۵ء ق۔م۔ ٹھہر تا ہے۔ والد کا نام "تارح" تھا یا عربی تلفظ میں آزر۔ نام کا تلفظ قدیم زبانوں میں کئی کئی طرح آیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے قرآنی لفظ "آزر" کافی ہے۔ وطن آبائی ملک بابل یا کلدانیہ (انگریزی تلفظ میں کالڈیا) تھا۔ جدید جغرافیہ میں اسی کو ملک عراق کہتے ہیں۔ جس شہر میں آپ کی ولادت ہوئی اس کا نام توریت میں "اُور" (UR) آیا ہے۔ مدتوں یہ شہر نقشہ سے غائب تھا۔ اب از سر نو نمودار ہو گیا ہے۔ کھدائی کے کام کی داغ بیل ۱۸۹۴ء میں ہی پڑ گئی تھی۔ ۱۹۲۲ء میں برطانیہ اور امریکہ کے ماہرین اثریات کی ایک مشترک تحقیقی مہم برٹش میوزیم اور پنسلوینیا یونیورسٹی کے زیر اہتمام عراق کو روانہ ہوئی اور کھدائی کا کام پورے سات سال جاری رہا۔ رفتہ رفتہ پورا شہر نمودار ہو گیا اور عراق گورنمنٹ کے محکمۂ آثار قدیمہ نے عجائب خانہ کے حکم میں لاکر ان کھنڈروں کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شہر خلیج فارس کے

دہانہ فرات اور عراق کے پایۂ تخت بغداد کے تقریباً درمیانی مسافت پر ہے۔ ابراہیمؑ کی بزرگی اور نبوت چونکہ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصرانیوں کو بھی مسلم ہے، اس لیے ان قوموں کے علماء نے بھی آپ کے حالات کی تحقیق و جستجو میں کوئی درجہ کاوش کا اٹھا نہیں رکھا ہے۔ موجودہ محرّف بائبل میں تاریخی غلطیوں کی کثرت سے اکتا کر بعض "روشن خیال" محققین نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیم نام سے کوئی تاریخی شخصیت گزری ہی نہیں۔ بلکہ یہ محض ایک نوعی نام تھا، یا ہر شیخ قبیلہ کا لقب، لیکن اب پھر تحقیق کا رُخ بدلا اور بیسویں صدی کے ربع اول کے ختم ہوتے ہوتے پھر آپ کی تاریخی شخصیت کا پوری طرح قائل ہو جانا پڑا ہے۔

نسل اسرائیلی اور نسل اسماعیلی دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک مدتوں سے چلی آ رہی تھی حضرت ابراہیمؑ دونوں سلسلوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اللہ کی نعمت خاص اخلاص یعنی توحید کی علمبرداری نسل اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں چھن کر ایک اسمٰعیلی پیغمبر کے واسطے سے اب ساری دنیا کے لیے عام ہو رہی ہے، ضرورت تھی کہ ابراہیمی شخصیت (اور ان کے ضمن میں اسمٰعیلی شخصیت) کی مرکزیت اور اہمیت سے دنیا کو روشناس کر دیا جائے، چنانچہ یہاں یہی ہو رہا ہے۔

لفظ ابراہیم کے سریانی زبان میں جو بھی معنی ہوں عربی اہل لغت نے اپنی زبان میں "أبٌ رَاحِیمٌ" کے معنی میں لیا ہے اس لیے کہ آپ کی شفقت بچوں کے ساتھ مسلّم و معروف ہے۔"

دوسرے پارہ کی آیت کریمہ "یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ، ان اللہ مع الصابرین۔" کی تفسیر کے سلسلہ میں لفظ "صبر" کا ذیلی نوٹ اپنی ایمانی حرارت بڑھائیے:

"یعنی ہجوم مشکلات کے وقت میں بھی مشکل کشائے حقیقی

سے تعلق برابر جوڑے رہو، اس پر بھروسہ رکھو، اس کے آگے جھکتے رہو ــــــــ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی بڑی اور پرقوت ہستی سے تعلق قائم ہو جانے سے دل کو کتنی تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ خطرہ کے وقت پولیس کے پہونچ جانے سے، کسی بڑے حاکم کے آجانے سے دل کو کیسی ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ شدید بیماری کے وقت نامور طبیب کے آجانے سے ٹوٹی ہوئی آس کیسی جڑ جاتی ہے۔ پھر جب دل کا رابطہ ہمہ بیں وہمہ داں، ناصر حقیقی و محافظ حقیقی سے قائم ہو جائے تو انسان بے چارہ کی تسکین خاطر و تقویت قلب کا کیا پوچھنا! دنیا میں رہ کر زندگی کی کشمکش میں پڑ کر مشکلات و مصائب کا پیش آتے رہنا ناگزیر ہے، افراد کو بھی اور امت و جماعت کو بھی۔ اور وہ دستور العمل ناقص ہے جو مشکلات کے دفاع اور مصائب سے مقابلہ کا طریقہ بتائے۔ قرآن مجید نے بجائے غیر ضروری اور نا متناہی تفصیلات میں جانے کے یہاں اشارہ اصل اصول کی جانب کر دیا۔

صبر کے لفظی معنی تنگی و ناخوشگواری کی حالت میں اپنے کو روکے رکھنے کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کو عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے اور قدم دائرہ شریعت سے باہر نہ نکالا جائے۔ صبر کے یہ معنی نہیں کہ جو امور طبعی اور بشری ہیں، ان کے آثار کو بھی اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا جائے۔ بھوک کے وقت مضمحل اور نڈھال ہو جانا درد کی تکلیف سے کراہنا، رنج کے وقت آہ سرد بھرنا، عزیزوں قریبوں کی موت پر آنسوؤں سے رونا، ان میں سے کوئی شے بھی صبر کے منافی اور بے صبری میں داخل نہیں، قرآنی فرمان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہجوم مشکلات کے وقت گھبرا نہ جاؤ۔ ثابت قدم رہو۔ دل قابو میں رکھو، خود دل کے بس میں نہ آجاؤ"

آیت کریمہ "ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون" کی تفسیر میں مفسر کی جادو نگاریاں اور نکتہ آفرینیاں دیکھیے:

"زمین و آسمان کے سارے کارخانے، جو دنیا کے ہر طلسم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور انسانی سائنس کے ہر شعبہ سے عجیب تر ہیں، بجائے خود اس کی دلیل ہیں کہ نہ یہ اپنے آپ وجود میں آسکتے ہیں، نہ باقی رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی صاحب شعور، صاحب ارادہ قادر مطلق ہستی ان کی صانع و خالق نہ ہو۔ ان سارے مظاہر فطرت کا تسلسل و استمرار، ان کی یک رنگی و باقاعدگی، ان کا نظم و انضباط، ہر عقل سلیم کو مجبور کر رہے ہیں کہ ان کے عقب میں ایک ذی اختیار فعّال کا ہاتھ تسلیم کیا جائے ــــــ اسی عقل سلیم کو جو ایک معمولی سی گھڑی کو بغیر کسی ماہر فن اور صناع گھڑی ساز کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ یہ خلاق ہستیاں اگر بہ صیغہ جمع یعنی ایک سے زائد فرض کی جائیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک خالق ان کے سارے امور کے لیے کافی نہ تھا۔ اس سے اس کا عجز ثابت ہوا۔ اور جو عاجز یا کسی بات میں ناقص ہے، وہ خالق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اگر کسی کی ربوبیت اور خالقیت پر اعتقاد ہے تو اسے لامحالہ واحد و یکتا بھی ماننا پڑے گا۔

آسمان ہو یا زمین، سب مخلوق ہی ہیں، غیر مخلوق یا خود آفریدہ کوئی نہیں۔ مشرک قوموں نے انھیں معبود مانا ہے، مدبر اور صاحب تصرف و صاحب ارادہ دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے ان کی پرستش کی ہے۔ قرآن مجید نے لفظ "خلق" سے ادھر اشارہ کر دیا کہ یہ عظیم الشان موجودات بھی کائنات کے ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ کی طرح مخلوق ہی ہیں اور آکاش دیوتا، دھرتی ماتا، جیسے قسم کے الفاظ نرے بے معنی اور مہمل ہیں۔

دنیا ایسی مشرک قوموں سے بھی خالی نہیں رہی ہے جنھوں نے رات اور دن کو ذی حیات اور صاحب ارادہ و تصرف مان کر انھیں دیوی دیوتا کا درجہ دیا ہے، اور ان کی پوجا کی ہے۔ یہاں ان کے

اختلاف (اَدل بَدل) کا ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ ان کا غیر مخلوق یا خود آفریدہ ہونا الگ رہا، یہ دقت و زمان کے مجبس بے جان اجزا تو خود اپنی حرکت تک پر قادر نہیں۔ قادرِ مطلق ہی ان میں رات دن الٹ پھیر کرتا رہتا ہے۔

قدیم فقہاء مفسرین نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ بحری سفر عبادت کی غرض سے ہو ــــ اور تجارت کے لیے ہو ــــ ہر صورت جائز ہے، اور بحری تجارت کے پُر منافع ہونے کا اشارہ بھی اس میں شامل ہے۔

ہندوستان میں جب شروع شروع میں ریل نکلی ہے تو دیہات میں خود اس کی پوجا شروع ہو گئی تھی۔ ایسی ہی وہم پرست قوموں نے اگر کبھی بادبانی جہازوں اور دخانی کشتیوں کی بھی پوجا کی ہو تو کچھ عجب نہیں۔ "فُلْكِ" کے عموم کے تحت میں اسٹیمر، لائنز، ڈریڈ ناٹ، ہر قسم کے چھوٹے بڑے جہاز اور آب دوز، تباہ کن، ہر قسم کی چھوٹی بڑی کشتیاں، غرض کل بحری سواریاں آ گئیں، جو اس وقت تک موجود ہیں۔ یا قیامت تک ایجاد ہو سکیں، سامانِ جنگ کے لیے یا سامانِ تجارت کے لیے یا بالغرض تفریح۔

انسان کو فائدہ پہنچانے والی چیز کا وصف سب میں عام و مشترک ہے۔ "ما ینفع الناس" کی وسعت لحاظ رکھنے کے قابل ہے۔ انسانی نفع و منفعت کی ہر ممکن سے شے اس میں آ گئی۔

امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ ایک معترض نے سوال کیا ہے کہ قرآن کی جامعیت کا دعویٰ ہے تو اس میں نمک، مرچ وغیرہ کھانے کے مسالوں کا ذکر کہاں ہے؟ جواب یہ ہے کہ "ما ینفع الناس" کا عموم ان سب کو شامل ہے۔

"السماء" کا لفظ جیسا کہ اوپر تشریح ہو چکی ہے، بادل آسمان وغیرہ ہر اوپر والی چیز کے لیے عام ہے۔ "ما انزل اللّٰہ" لا کر یہ یاد دلایا کہ بارش میں حیات بخشی کی جو قوت ہے، یہ اسی خدائے واحد حیات آفریں کی ودیعت کی ہوئی ہے۔

"دَآبَّةٍ" عام ہے۔ ہر حیوان کے لیے، حیوان پرستی شرک کا ایک جزو اعظم تاریخ کے ہر دور میں رہی ہے۔ زمین اگر ۲۵ ہزار میل کے محیط کا کوئی گولا ہے تو یا اگر غیر پیمائش شدہ وسعت کی کوئی چیز ہے تو بھی، اگر تیزی اور پھرتی کے ساتھ گردش کر رہی ہے، یا اگر اپنی جگہ پر ساکن ہے تو بھی ہر حال میں اور ہر صورت فرض کرنے کے بعد بھی، کیسی عظیم الشان، کاریگری، کیسی بے مثال صناعی کا نمونہ ہے! فضا کی خلا میں کس کی قوت اسے تھامے ہوئے ہے، سنبھالے ہوئے ہے؟ اس کے اور چاند، سورج اور ستاروں، سیاروں کے درمیان فاصلہ کا ایک خاص تناسب کس نے قائم کر رکھا ہے؟ اس کی رفتار کی ایک خاص شرح کس نے متعین کر دی ہے؟ آفتاب سے اسے ایک خاص مقدار میں روشنی اور گرمی کون پہنچا رہا ہے؟ چاند سے روشنی اور خنکی ایک متعین حساب کے ساتھ کس کا دستِ قدرت اس تک لا رہا ہے؟ اگر آسمان ٹھوس مادی اجسام ہیں تو، یا اگر خلا میں محض حد نظر ہیں تو بھی، ہر صورت میں ان کی وضع، ساخت، ترکیب، ہیئت، انسانی دسترس سے کتنی بالاتر ہے! گنتی شمار سے باہر، ثوابت و سیارہ کے سکون و حرکت کا انتظام کون قائم کیے ہوئے ہے؟ ستاروں کی یہ روشنی اور ان کے طلوع و غروب میں یہ باقاعدگی کس کے حکم سے قائم ہے! نظام فلکی کے بے شمار اجزا و عناصر میں یہ ترتیب اور باہمی تناسب کس کی حکمت و صنعت کے دم سے زندہ ہے؟ رات اور دن کس طرح ایک برتر قانون کے اندر جکڑے نظر آ رہے ہیں؟ گرمی اور سردی اور برسات ہر موسم میں ان کے اندر مناسب وقت کی تبدیلیاں، کون کرتا رہتا ہے؟ مختلف ملکوں میں ان کے طلوع و ظہور کے وقت کیسے بندھے ہوئے ہیں؟ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ جس وقت کلکتہ میں دن نکلتا ہے، دمشق میں بھی دن نکل آئے۔ نہ یہ ہوتا ہے کہ امریکہ کی شام کبھی ایران کی شام بن جائے، جنوری میں جو اوقات اندھیرا چھا جانے کے ہوتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ جون میں وہی باقی رہ جائیں۔ آخر یہ رات دن کے بندھے ہوئے اور قانون کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تغیرات کس کی حکومت قاہرہ اور حکمت کاملہ کی شہادت دے رہے ہیں؟ بحر ذخار سارے بڑا عظموں کو اپنی گرفت میں لیے رہنے والا، رقبہ

میں خشکی سے چہار چند۔ اپنی اس ساری عظمت ہیبت کے باوجود کس طرح مشت خاک انسان کے قبضہ میں آگیا ہے؟ کس طرح لکڑی کے تختوں کو جوڑ جاڑ کر، ان میں لوہے کی کیلیں ٹھونک ٹھانک کر، ان پر لوہے کی چادریں چڑھا کر انسان سمندر کے بڑے بڑے مہیب، فاصلوں اور مسافتوں کو طے کر کے رکھ دیتا ہے؟ اس میں جو زرد مد جیب ہوگا قمری مہینوں کی فلاں فلاں ہی تاریخوں پر ہوگا، اپنی ساری غضبناک تندی کے باوجود ایک خاص رقبہ کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکے گا، ایک مخصوص و متعین ہی وزن کی چیزوں کو وہ اپنے اوپر تیرائے گا۔ اور اس کے علاوہ وزن والیوں کو ڈبو دے گا۔ اس کے پانی کا ایک مخصوص مزاج، خاص رنگ، خاص مزہ ہوگا۔ کنوؤں کے پانی سے مختلف، دریاؤں کے پانی سے مختلف۔ اس طرح سینکڑوں دوسرے قانونوں کا پابند اسے کس کی مشیت، کس کی قدرت، کس کی حکومت نے کر رکھا ہے؟ بارش کا خاص خاص فصلوں میں خاص خاص موسموں میں خاص خاص فضائی تغیرات کے ماتحت ہونا۔ بخارات کا ایک خاص گرمی پا کر سمندری ذخیرۂ آب سے اٹھنا، ایک خاص فاصلہ تک اوپر جانا، ایک خاص درجہ کی سردی پا کر ان دخانی و ہوائی اجزاء کا منجمد ہو جانا، ان کا بادل کی شکل اختیار کر لینا، ایک خاص درجۂ ثقل تک بڑے بڑے بھاری بوجھل بادلوں کا فضا میں سنبھلے رہنا، پھر فلاں فلاں فضائی تغیرات کے ماتحت فلاں فلاں علاقہ تک جانا، پھر ایک خاص مقرر ہوئی مقدار میں ایک متعین مدت کے اندر برس پڑنا، اس سے از سر نو خشک زمین میں جان پڑ جانا، یہ سارے رد و بدل کسی حکیم کی حکمت، کسی آمر کی حکومت، کسی قادر کی قدرت کی کیسی کھلی ہوئی شہادت دے رہے ہیں! پھر حیات نباتی کے علاوہ خود حیات حیوانی جن عجائب کا مجموعہ ہے، ہر زندہ جسم میں بے شمار ذروں اور خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان میں جو مخصوص ترتیب اور متعین ترکیب ہوتی ہے، ایک خاص درجہ کی حرارت جو حیات کو قائم رکھتی ہے، ایک خاص مقدار سے بڑھی ہوئی سردی جو اس لف میں نشر، اس اجتماع میں انتشار پیدا کر دیتی ہے، نظام تغذیہ، نظام تنفس، نظام تناسل نظام عصبی وغیرہ جسم کے اندر متعدد نظامات، پھر ہر نظام کے ماتحت بے شمار قاعدے اور ضابطے، اس سارے نظام اعظم کی تکوین و قیام پر کس کی قدرت، کس کی مشیت، کس کی حکومت کارفرما ہے؟ اس قسم کے سیکڑوں ہزاروں سوالات پر انسان جتنا زیادہ غور اور نکتہ سنجی سے کام لے گا، توحید اور توحیدی حکمتوں کا نقش دل پر اور زیادہ ہوتا جائے گا۔ جاہلی اور غیر مومن قوموں کے فلسفہ اور سائنس کا صرف نقطۂ نظر غلط ہوتا ہے، اس کی اگر تصحیح ہو جائے، اور ان علوم مادّی کا مطالعہ اگر ایمانی نقطۂ نظر سے شروع کر دیا جائے۔ تو بجائے الحاد ارتیاب و تشکک کے عرفان و ایقان کی راہیں روز بروز نہ روشن ہوتی جائیں۔"

سطور بالا میں جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں وہ مولانا کے منفرد طرز نگارش کا بہترین نمونہ ہیں اور تفسیر و تشریح کے فن میں ان کی فنکاری اور استادانہ مہارت کی مثال ہیں ان کا مطالعہ وسیع، ان کی نظر عمیق ان کا دماغ فلسفہ سے الجھا ہوا نہیں بلکہ حکمت الٰہیہ سے سلجھا ہوا، ان کا دل دانش و حکمت اور نور ایمانی سے منور اور ان کا قلم "اعلاء کلمۃ الحق" کا زبردست آلۂ کار رہے۔ انھوں نے "تفسیر ماجدی" لکھ کر اپنی عاقبت ہی نہیں سنواری بلکہ بہتوں کے لیے ضلالت و گمراہی سے نکلنے کا سامان فراہم کر دیا۔ یہ بلند مرتبہ تفسیر علمی دنیا میں یقیناً خراج تحسین پانے کی مستحق ہے اور ضرورت ہے کہ دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے کئے جائیں۔

★

عبدالمنان

مولانا ماجد دریابادی

صاحب عز و شرف اے ماجد عالی مقام
آپ کی ذاتِ مقدس قابلِ صد احترام
اے وقارِ قوم و ملت، عظمتِ علمائے دیں
زینتِ دامانِ رحمت، رونقِ خلدِ بریں
آپ کی پرنور ہستی شمع راہِ مستقیم
کتنا عالی مرتبہ تھا شخصیت کتنی عظیم
آپ صرف اک آفتابِ علم و حکمت ہی نہ تھے
سر سے پا تک پیکر صدق و صداقت ہی نہ تھے
آپ کا اردو ادب پر بھی بڑا احسان ہے
آپ کے طرزِ نگارش میں انوکھی شان ہے
واہ کیا زورِ قلم ہے کیا نیا انداز ہے
آپ کی تحریر پر خود فلسفہ کو ناز ہے
ایک گنجِ بیش قیمت آپ کی تنقید ہے
آپ کی ہر بات ادب میں قابلِ تقلید ہے
آپ کے سارے مقالے شاہکارِ علم و فن
آپ کے مضمون میں بھی لذتِ شعر و سخن
آپ کی فہم و ذکا کا معترف ہے ہر بشر
آپ کی خدمات کا قائل ہے ہر اہلِ نظر
آپ نے جاری کیا جس روز سے "صدق جدید"
بن گئے سارے صحافی آپ کے سچے مرید
آپ کی رحلت سے مضطر اہلِ دریاباد ہیں
سارا عالم غمزدہ ہے سب کے دل ناشاد ہیں
آپ جیسی شخصیت مرکر بھی ہے مرتی کہاں
آپ کا ہر کارنامہ ہے حیاتِ جاوداں

طلحہ تابش

مولانا عبدالماجد

وہ ہمارے دیس کا ایسا دیا
ظلمتوں کو جس نے کچھ روشن کیا
لاکھ وہ موہوم کہلایا مگر
زندگی کو اک سہارا تو دیا
موت کے ہاتھوں نے چھلکایا ایاغ
ذہن میں اب کوئی صحرا ہو نہ باغ
دیر تک لڑتا رہا طاغوت سے
تیرگیٔ شب میں وہ روشن چراغ
زخم ہائے دل کا وہ واحد علاج
صاحبانِ فکر و فن دیں گے خراج
فلسفے میں جس نے شامل کر دیا
ذہنِ آدم، روحِ مذہب کا مزاج
اس کی کاوش اور تخلیقاتِ فن
اب بھی ہیں انسان پر سایہ فگن
اس کے اٹھ جانے کا غم تو ہے مگر
ہم میں ہے موجود ابھی اس کا چلن
شمع حق پر جو مٹا پروانہ وار
شخصیت جس کی رہی باغ و بہار
اس کے اٹھ جانے کا مطلب یہ ہوا
اٹھ گیا تہذیبِ ماضی کا وقار
کہہ بھی کیا سکتا ہوں میں اسکے سوا
رحمتیں نازل کرے اس پر خدا

راز لکھنوی

مولانا عبدالماجد کی یاد میں

وہ رزم و بزم کا شناور
تحریر میں طنز کا نشتر
فلسفہ کا عمیق سمندر
نکتہ دانی کا چھلکتا ساغر
گوناگوں خصوصیات کا حامل
زہد و ادبیت کی محفل
اصلاح معاشرہ بھی، ادب کی چاشنی بھی
حق گو، حق گفتار سخن شناس
ادیب، مشاق، طنز میں طاق
کالم جس نے اصلاح قوم میں عمر
عجب مست سا تھا وہ قلندر
رخصت ہوا دارِ فانی سے
ہر آنکھ اشک بار
دنیائے ادب بیقرار

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

انشائے ماجد کی جھلکیاں

مولانا عبدالماجد دریابادی کا منفرد طرزِ نگارش اور انشاپردازی کا رنگ و آہنگ نیز ان کے مخصوص طنز کا نشتر ان کے خطوط میں بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ برصغیر ہند کے بیشتر مشاہیر ادب اور اکابرین سے مولانا کے گہرے روابط تھے اور ان سے مراسلت کا سلسلہ قائم تھا۔ ان کے بے شمار خطوط میں سے ذیل میں چند خطوط ہدیۂ ناظرین ہیں جو مختلف مشاہیر ادب اور صحافیوں کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ پیامات بھی ہیں اور کتابوں کے پیش لفظ بھی۔ ان تحریروں کا مطالعہ اس لحاظ سے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان سے اگر ایک طرف مولانا اور مشاہیر ادب کے درمیان جو بے تکلف روابط اور تعلقات تھے ان پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف ان کی ادبی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے نام

دریاباد ۱۰ مئی ۱۹۵۸ء

کرم گستر۔ السلام علیکم

رزم نامہ[1] عرصہ ہوا پڑھ لی تھی اور اپنے تاثرات اسی وقت سپرد قلم کر دیے تھے لیکن صدق میں گنجائش کا انتظار ہفتوں نہیں مہینوں کرنا ہوتا ہے۔

آپ کے حسن انتخاب، حسن ترتیب کا کیا کہنا اور کلام کا کمال یہ ہے کہ مجھ جیسا بدعقیدہ اور "واقعات" کی تاریخیت سے بڑی حد تک منکر شخص بھی گہرا اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جی نہیں شاہی اسٹیج[2] نہیں آئی مجھے زیادہ انتظار تو آپ کی دوسری کتاب تذکرۂ نادر کا تھا۔ اس انعامی کمیٹی کی مجلس[3] دیکھیے اب کب تک ہوتی ہے ابھی تو کتابیں بھی نہیں وصول ہوئی ہیں۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

دریاباد ۲۴ نومبر ۱۹۵۸ء۔

کرم گستر۔ السلام علیکم

کسے خبر تھی کہ آپ کا اس اردو کمیٹی سے استعفا خود اسی کمیٹی کی موت کا پیش خیمہ ہوگا۔ پھر گورنمنٹ تو جیسے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہی تھی میں نے ایک خط سکریٹری صاحب کو ضابطہ سے لکھا اور کچھ تھوڑی بہت کوشش کسی ذریعہ سے کرالی۔ دونوں صورتیں بالکل بے نتیجہ رہیں۔ ممکن ہو تو ذرا حیات اللہ انصاری صاحب کو کھڑکھڑایئے۔ قومی آواز کے ایڈیٹر بھی ہیں اور سرکاری کونسل کے ممبر بھی۔

ہاں صاحب آپ لکھنؤ میں رہتے ہیں کسی صاحب کو بچھا کر شاہان اودھ کی پوری زندگی پر کتاب لکھوایئے جس میں نہ مدح ہو

---

[1] مکتوب الیہ کی گراں قدر تالیف [2] مکتوب الیہ کی دوسری تصنیف [3] مراد یوپی گورنمنٹ کی طرف سے مقرر کی ہوئی انعامی کمیٹی سے ہے جس کے ممبران مولانا مرحوم اور پروفیسر صاحب تھے۔ [4] یوپی لیجسلیٹو کونسل۔

نہ ہو محض واقعاتی (OBJECTIVE) حیثیت سے جس میں صبح و شام دن و رات کے حالات درج ہوں۔ کھاتے کیا تھے اور کیوں کر؟ دلچسپیاں کیا۔ کیا رہتی تھیں؟ امیروں، وزیروں، عام رعایا کے ساتھ برتاؤ کیا رہتا تھا؟ دربار کے آداب کیا تھے؟ عبادات، عقائد، مذہبی تقریبات کا کیا رنگ تھا۔ حمام، بیت الخلا کے آداب کیا تھے؟ لکھنے پڑھنے کا شوق کہاں تک تھا؟ شادی۔ بیاہ، جنسی زندگی کی تفصیلات وقس علی ہذا۔

ہوشؔ[1] بلگرامی مرحوم سے میں نے وعدہ لے لیا تھا کہ اسی قسم کی ایک مکمل کتاب وہ نظام دکن امرا حیدرآباد، والیان بھوپال ورام پور پر اپنی ذاتی معلومات سے لکھ دیں گے۔ خیر وہ بے چارے تو گزر ہی گئے۔

اب کسی اور سے یہ کام شاہان اودھ سے متعلق لیجیے کچھ دن بعد کوئی اتنا جاننے والا بھی باقی نہ رہے گا۔ دعاگو عبدالماجد

دریاباد ۵ مارچ ۱۹۵۲ء

کرم گستر۔ السلام علیکم

دونوں کتابوں پر[2] دو ہزار کے انعام کی خبر تو اس سے قبل ہی مل چکی ہوگی۔ مبارکباد پیش کرنا محض رسم ادا کرنا ہے۔ رزم نامہ کی داد دل سے دیتا ہوں۔ صدق میں بھی لکھ چکا ہوں واقعی آپ کی زندگی ایک کارنامہ ہے۔ لیکن اس رزم نامہ کے ساتھ اس دوسرے بزم نامے[3] کے لیے کیا عرض کروں۔ تلاش و تحقیق بلکہ توفیق اس کی بھی قابل داد کیا قابل رشک لیکن اس سب کا آخر کیا حاصل؟ دنیا اگر ان خوردبینی جزئیات سے بے بہرہ رہ جاتی تو کیا مضائقہ تھا۔

لاشۂ بے جان کو بنا سنوار کر رکھنے لباس فاخرہ پہنانے عطر لگانے کا مصرف مجھ کم فہم کی سمجھ میں تو آیا نہیں۔ کاش اتنا وقت عزیز آپ نے کسی اعلیٰ موضوع پر صرف کیا ہوتا۔ اس جسارت بلکہ گستاخی کے حق میں میرا اخلاص شاید کچھ شفیع ہو جائے۔ دعاگو عبدالماجد

دریاباد ۳۰ اگست ۱۹۶۰ء[4] کرم گستر السلام علیکم

کشمیری بھانڈوں کا شعر صاحب، عوامی اسٹیج، و شاہی اسٹیج کی زبان سے سن کر اگر بے ساختہ داد نہ لکھ بھیجوں تو ظلم ہے شعر سنانے والے اور سننے والے دونوں پر۔[5]

کاش کہ کشمیری بھانڈوں کو کوئی ادیب اب تک ایسا قدرداں ملا ہوگا۔

والسلام دعاگو عبدالماجد

دریاباد ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۰ء

کرم گستر السلام علیکم

۲۷ کو لکھنؤ ریڈیو دہلی کی فرمائش پر اپنی ادبی ملاقات ریکارڈ کرا آیا۔ تجربہ محکمہ والوں کی طرف سے بڑا ہی تلخ بلکہ صبر آزما رہا

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل گئے
یہ میری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

کا منظر۔ اب دہلی سے جب کبھی کوئی فرمائش آ جاتی ہے یہی صورت پیش آتی رہتی ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کی رقابتوں کی روایت اور جہاں کہیں ختم بھی ہو چکی ہو بہر حال لکھنؤ ریڈیو میں زندہ ہے۔ ہر گریہ کے عقب میں خندہ۔ ان تلخیوں کے ساتھ اپنے احتشام[6] صاحب کی شرافت، معقولیت، انسانیت کا بھی تجربہ ہو گیا۔ لڑائی میری

---

[1] مراد نواب ہوش یار جنگ بلگرامی ہیں جو ریاست حیدرآباد میں اونچے عہدوں پر فائز رہے۔ ان کا شمار میر عثمان علی خاں صاحب نظام حیدرآباد کے مقربین خصوصی میں ہوتا تھا۔ ان کے مولانا مرحوم سے تقریباً چالیس بیالیس برس تک آخر دم تک مخلصانہ تعلقات قائم رہے۔ [2] اردو انعامی کمیٹی نے مسعود صاحب کی دو کتابوں یعنی رزم نامہ اور شاہی اسٹیج پر دو ہزار کے انعام دیے۔ [3] اس سے مراد شاہی اسٹیج ہے جس میں واجد علی شاہ کے زمانے کی اندر سبھاؤں کے تفصیلی حالات پیش کیے گئے تھے۔ [4] فاضل مکتوب الیہ نے مولانا کی ایک ریڈیائی تقریر "ادبی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات" سن کر بڑی داد لکھ بھیجی تھی اور ایک شعر بھی۔ مکتوب بالا اس کے جواب میں ہے۔ [5] مراد پروفیسر احتشام حسین صاحب صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی مرحوم ان کی شرافت اور شرقیت کے بہت زیادہ معترف تھے۔

طرف سے لڑتے رہے ۔۔ اور ہر قدم پر اپنے کو پیچھے رکھ کے مجھی کو آگے کیا۔

۹؎ نفس مکالمہ کا ہر استفسار، استفاد، استقلام، استفہام پر نفیس تر تھا اور میری گزارش طالب علمانہ۔ تحمل کے ساتھ سن بھی لیا۔ میرے ساتھ ان کی تقریر بھی سنہری نشر اچھا خاصا چلا۔ بہرحال کٹی پٹی، لنڈی منڈی لولی لنگڑی تقریر جیسی بھی ریکارڈ ہو پائی ہے انشاءاللہ ۲ رنومبر کی رات ½9 بجے دہلی سے آئے گی۔ آپ کی قدر افزائی کے اعتماد پر یہ رام کہانی آپ لکھ بھیجی۔
بحر ظفر حسین خاں صاحب؎ کو بلرام پور اسپتال لکھنؤ میں دیکھ آیا بے چارے سخت علیل ہیں۔

والسلام
عبدالماجد

دریاباد، راگست ۶۱ء

برادرم السلام علیکم

اگر بہ آسانی ممکن ہو تو جو جواب اردو سوال نامے؎ کا آپ کی انجمن؎ کی طرف سے جائے وہ میری نظر سے بھی گزر جائے۔ عجب کیا جو میں اس کی تائید کر دینا کافی سمجھوں۔
واللہ اعلم میری جانشینی کس کے حصے میں آئی۔ پرسوں لکھنؤ جا کر مرحوم ظفر حسین خاں؎ کی قبر پر فاتحہ پڑھ آیا۔ بالکل پائینتی ان کے بچہ کی قبر کا کتبہ پڑا ہوا نظر آیا۔ سرور صاحب نے خدا معلوم یہ کہاں سے لکھ دیا کہ مرحوم مولانا شبلی؎ کے شاگرد تھے۔

والسلام دعاگو
عبدالماجد

دریاباد، ۷ راکتوبر ۶۱ء

کرم گستر السلام علیکم

کل سرکار؎ کے ہاں سے اطلاع آئی کہ تمہارا استعفا اس لسانی کمیٹی؎ سے منظور کر لیا گیا اور اب تمہاری جگہ کسی اور جب کے انتخاب کی ضرورت نہیں۔ سچ کہا جس نے کہا تھا ؎

گھبرا کے اور غیر کے پہلو سے لگ گئے
دیکھا اثر یہ نالۂ بے اختیار کا

اور اس نے بھی سچ کہا جس نے یہ کہا ؎

یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

والسلام
عبدالماجد

دریاباد، ۸ ستمبر ۶۳ء

کرم گستر السلام علیکم

تقریر جدید پر مبارک باد کبھی دل سے پیش کرنے والا تھا بس رد ہی رہ گیا۔ صدق؎ کا نوٹ بھی لکھنؤ سے اس خط کے ساتھ موصول ہو جائے گا۔
لکھنؤ کی محفل میلاد کے سلسلے میں آپ کا بیان خوب نکلا۔ پہلا بیان تو محض غنیمت کے درجہ کا ہے لیکن آپ کا بیان واقعی قابل داد ہے؎ اس نے یہ خط لکھنے پر فوراً آمادہ کیا۔

والسلام دعاگو و دعا خواہ
عبدالماجد

لہ مراد خان بہادر ظفر حسین خاں صاحب جو مرحوم کے کالج کے ساتھیوں میں اور مخلص ترین دوستوں میں تھے ۲؎ مراد اس سوال نامے سے ہے جو اردو کا جائزہ لینے کی یو پی گورنمنٹ کی مقرر کردہ کمیٹی کی طرف سے جاری کیا گیا تھا ۳؎ مراد انجمن ترقی اردو لکھنؤ ہے جس کے صدر پروفیسر مسعود حسن تھے۔ ۴؎ مولانا مرحوم کے پرانے مخلص دوست خان بہادر ظفر حسین خاں صاحب ۵؎ سرور صاحب نے غالباً ہماری زبان میں مرحوم کی وفات پر تعزیتی نوٹ میں یہ لکھ دیا تھا کہ مرحوم مولانا شبلی کے شاگرد تھے۔ ۶؎ سرکار سے مراد یو پی گورنمنٹ ہے ۷؎ مراد وہ کمیٹی ہے جو آچاریہ کرپلانی کی صدارت میں یو پی گورنمنٹ نے اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے مقرر کی تھی۔ ۸؎ افسوس ہے کہ اس تفصیل کا پتہ نہ چل سکا کہ پروفیسر موصوف کا تقرر کس جگہ پر ہوا تھا ۹؎ بدقسمتی سے لکھنؤ میں شیعہ سنی اختلاف محافل میلاد کے سلسلے میں ہو گیا تھا۔ پروفیسر صاحب کا بڑا ہی مصالحانہ بیان اس سلسلے میں اخبارات میں شائع ہوا، مولانا صاحب نے اس کی داد دی۔

۱۴-۹ جون ۱۹۶۶ء

مخدوم مکرم السلام علیکم

حامد علی خاں مرحوم[1] کی ایک کتاب جسٹس کرامت حسین[2] پر تھی جو یہاں سے مدت ہوئے غائب ہو گئی۔ اب اس کی ضرورت آن پڑی ہے۔ عجب نہیں کہ شیعہ کالج لائبریری میں ہو اور آپ کے تعلقات شیعہ کالج سے ضرور قائم ہوں گے۔ اگر آپ کے ذریعہ سے دو چار دن کے لیے حاصل ہو سکے تو کسی کو بھیج کر آپ سے منگوا لوں۔

ہاں صاحب کئی سال ہوئے میں نے انھیں حامد علی خاں کی ایک انگریزی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ نام غالباً THE LANGUAGE CONTROVERSY تھا اور ناگری رسم الخط سے متعلق مراسلات اور مضامین کا مجموعہ تھی۔[3] آپ نے واپس تو یقیناً فرما دی ہو گی۔ لیکن احتیاطاً ذرا ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے گا۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

دریاباد ۲۴ اگست ۱۹۶۶ء

برادرم وعلیکم السلام

سرکاری سند سے کہیں بڑھ کر قابل قدر تو آپ سے مخلص اہل علم حضرات کا اخلاص و حسن ظن ہے۔[4] رہی اہلیت، اور نا اہلی تو نا اہل ترین تو میں خود ہی ہوں۔ یہ محض کسی کی صفت ستاری ہے جو ہر عیب پر پردہ ڈالے ہوئے ہے۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

دریاباد ۱۹ اپریل ۱۹۶۶ء

مخلص نواز وعلیکم السلام

آپ کے وفور اخلاص نے دوبارہ آپ سے تہنیت نامہ لکھوا دیا۔ یہ کوئی نیا اعزاز نہیں وہی پرانا صدارتی والا ہے اس کی باضابطہ عطائے سند کی تقریب اب ہوئی تھی۔[5] آگے کی صفوں کی صفیں پدم بھوشن، پدم سری وغیرہ سے بھری ہوئی تھیں۔ انھیں میں فلاں گویے فلاں سازندے فلاں رنگیے بھی تھے اور آخری بالکل آخری صف ہم خاکساران "اہل علم" کے لیے تھی۔ دو سنسکرت والے اور ایک عربی و فارسی والے کے لیے منظر صبر آزما ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ آموز بھی رہا

صدق جائسی مرحوم کی صاحب زادی کا خط آیا تھا کہ مرحوم کا دیوان بھی تیار ہے اور دربار دُربار کے دوسرے حصے بھی، بجھ تم ان پہ لکھ دو۔ جواب لکھ دیا کہ دربار کی حد تک تو حاضر ہوں۔ باقی دیوان پہ لکھنے کے لیے مجھ سے کہیں زیادہ اہلیت

---

[1] حامد علی خاں مرحوم بیرسٹر رہنے والے امروہہ کے تھے لیکن لکھنؤ میں بیرسٹری کرتے تھے اور انیسویں صدی کے اواخر سے ان کا شمار مسلم لیڈروں میں ہونے لگا تھا۔ کانگریس کے قیام کے وقت اس کے شدید حامیوں میں تھے لیکن بعد میں مخالف ہو گئے۔ ۱۹۳۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ بڑے ادب نواز اور شاعر تھے [2] جسٹس کرامت حسین بانی کرامت حسین گرلز کالج [3] انٹونی میکڈانل گورنر صوبہ شمالی و مغربی جو اس زمانے میں یوپی کا نام تھا نے ۱۹۰۰ء میں عدالتوں میں دیوناگری رسم الخط میں درخواستوں کے قبول کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ بڑے ہندی نواز اور اردو مخالف تھے۔ اس کے خلاف محسن الملک کی قیادت میں اردو کی حمایت میں تحریک شروع ہوئی۔ گورنر نے ایم۔ اے۔ او کالج کی ایڈ بند کر دینے کی دھمکی دی۔ اور محسن الملک کو انجمن حمایت اردو کی صدارت سے استعفا دینا پڑا۔ یہ کتاب حامد علی خاں نے اسی موضوع کے متعلق مرتب کی تھی اور اس میں اردو رسم الخط کی حمایت میں مضامین اور مراسلات کو جمع کیا تھا۔ [4] اگست ۱۹۶۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مولانا مرحوم کو عربی میں نیشنل اسکالر کا ایوارڈ دیا جاتا تھا جو اعلا ترین علمی اعزاز ہے اور چوٹی کے عالموں کو دیا جاتا ہے۔ بہ صورت ڈیڑھ ہزار سالانہ بخشش جو بعد میں تین ہزار ہو گئی۔ [5] پروفیسر صاحب نے تہنیتی خط عربی اسکالر ایوارڈ پانے کی خبر پر ۲۰ اگست ۱۹۶۶ء میں لکھا جس کا جواب مکتوب نمبر ۱ ہے۔ اپریل ۱۹۶۷ء میں اس سند کے عطا کرنے کی تقریب راشٹرپتی بھون دہلی میں ہوئی۔ مسعود صاحب نے دوبارہ خط لکھا۔

جناب مسعود حسن رضوی رکھتے ہیں۔ دو ہفتے کے بعد یہ خط مردہ خطوط سے زندہ ہو کر واپس آیا کہ مکتوب الیہ کا پتہ نہیں چلا۔ حالانکہ پتہ انھیں کیپٹن سنگھ کا لکھا ہوا تھا۔

ہاں صاحب کے گھر میں ضیاء الدین حسین مرحوم[1] کی بھانجی ہیں۔ گویا نیوتنی ان کا ننھیال ہے۔ اکثر ذکر اپنی ایک خالہ کا کرتی رہتی ہیں بڑی محبت سے۔ یہ سید آل رضا کی والدہ تھیں[2]۔ اور بیان کرتی ہیں کہ آپ کی بھی کوئی قریبی بہن ہوتی ہیں۔ یہ بیان صحیح ہے؟ محض اتنے کے لیے خط کی ضرورت نہیں۔ لیکن بہرحال اسے ذہن میں رکھیے آئندہ جب کبھی کسی ضرورت سے لکھیے تو اس میں اس کا جواب بھی ہو[3]۔

والسلام
عبدالماجد

دریاباد ۱۸ اپریل سنہ ۶۹ء

برادرم السلام علیکم

تفسیر[4] جلد اول کو نکلے ہوئے اب کئی مہینے ہو چکے۔ جی یہ چاہتا تھا کہ آپ کی نظر سے ضرور گزر کر رہے۔ بے تکلف ایک نسخہ ارسال خدمت ہے۔ اسے مہینہ دو مہینے جب تک جی چاہے اطمینان سے اپنا ہی نسخہ تصور فرمائیں۔ افسوس ہے کہ شیعہ تفسیروں تک دسترس نہ ہو سکی۔ صرف طبری کے مطالعہ کا موقع کبھی کبھی ملا۔ وہ بھی بہت کم۔

والسلام
عبدالماجد

دریاباد ۲۹ ستمبر سنہ ۶۹ء

بندہ مہربان السلام علیکم

حسینی مرحوم[5] کی سناونی کل دوپہر کو سنی اور دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ تعزیت آپ کو نہیں کر رہا ہوں۔ مرحوم میرے مخلصوں میں تھے۔ تہذیب و شائستگی کی تصویر بڑے شریف و خلیق۔ مجھ سے کچھ دن برائے نام کچھ لکھ پڑھ لیا تھا وہ رشتہ آج تک قائم رکھے رہے۔ بڑے ہو کر میرے سامنے چھوٹے بنے رہے۔ قبر پر چل کر فاتحہ پڑھ لیجیے اور آپ اس کی رہنمائی اگر کر سکیں تو بہت خوب ہو۔ ۵ اکتوبر کو لکھنؤ ان شاء اللہ پہنچ جاؤں گا اور قیام کچھ روز رہے گا۔ جس دن اور جس وقت آپ کو سہولت ہو مجھے قبل سے اطلاع کر دیں خط سے یا ٹیلیفون پر ۲۷۰۰۲۔ آپ ہی کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا۔

والسلام دعاگو
عبدالماجد

دریاباد ۲۴ اکتوبر سنہ ۶۹ء

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد انا الیہ راجعون

برادرم السلام علیکم

ابھی ابھی سانحہ کی خبر پڑھی انا للہ و انا الیہ راجعون۔ رفیقۂ حیات کی جدائی اور وہ بھی یوں آناً فاناً جس درجہ کا صدمہ بشر کے لیے ہے وہ بھی میری تازہ آپ بیتی ہے۔ اس لیے ہمدردی اور تعزیت آپ کے ساتھ رسمی نہیں بلکہ بہ تصدیق دلی رکھتا ہوں۔ اللہ ہی آپ کو صبر عطا فرمائے۔ کل ان شاء اللہ

---

[1] ضیاء الدین حسین صاحب مرحوم ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر نیوتنی ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے۔ مولانا مرحوم کی بیگم کے قریبی ماموں تھے۔ مسعود صاحب کا وطن بھی نیوتنی تھا۔ [2] سید آل رضا جسٹس محمد رضا جج اودھ چیف کورٹ کے صاحبزادے جو خوش گو شاعر بھی تھے۔ [3] مولانا خود اپنے وقت کو عزیز رکھتے تھے اسی طرح دوسروں کے وقت کا بھی۔ ان جملوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ [4] مراد مولانا کی تفسیر ماجدی کا جس کا دوسرا ایڈیشن دہلی سے شائع ہوا تھا۔ [5] مراد نامور افسانہ نویس سید علی عباس حسینی صاحب ہیں جن سے مولانا کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے جن کا ذکر اس خط میں ہے۔ یہ خط ان کے انتقال کے بعد لکھا۔

فاتحہ سوم میں حاضری دوں گا۔

والسلام
دعاگو عبدالماجد

دریاباد ۲؍ دسمبر ۱۹۷۱ء

برادرم السلام علیکم

امراؤ جان ادا کے نئے ایڈیشن پر تبصرہ دو نمبروں میں خدمت گرامی میں پیش کر چکا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس کی چھپائی میں متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں۔

بہر حال بہ نظر اصلاح دیکھ لیجئے گا اور اگر تحریر میں زیادہ زحمت نہ ہو تو میری غلطیوں پر مجھے مطلع کر دیجئے گا۔[۱]

والسلام دعاگو
عبدالماجد

۱۴؍ اپریل ۱۹۷۳ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

"پنج ہزاری"[۲] اللہ مبارک کرے۔

یہ انعام اگر وہی ہے جو ہندی کمیٹی بابو سمپورنانند کے زیر صدارت بہترین اردو والے کو ہر سال دیا کرتی تھی تو اس کے سلسلے میں تو خواہ مخواہ اتنی دیر ہو گئی۔ یہ تو آپ کو شروع میں آج سے کئی سال قبل مل جانا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بھی شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کا نام کیوں نہ پیش کیا۔ یہ تو میرے فرائض میں داخل تھا۔

والسلام دعاگو
عبدالماجد

دربار دُربار[۳] ص وسط

خدا خدا کر کے اس طوفان کا زور گھٹا

اے سبحان اللہ "طوفان" کی مناسبت سے "گھٹا"

کیا خوب دیکھیے اس داد پر مجھ غریب پر برس نہ پڑے گا۔

والسلام دعاگو
عبدالماجد

نواب جعفر علی خاں اثر کے نام

۳۰؍ اپریل ۱۹۷۶ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

علی گڑھ میگزین[۴] کا مجاز نمبر ابھی نظر سے گزرا۔ اس عالم "مجاز" میں حقیقت ایک ہی نظر آئی اور وہ ہے آپ کا مضمون "لکھنؤ کی زبان" "سرمایہ زبان اردو"[۵] پر آپ کی تنقید ماشاء اللہ و سبحان اللہ۔

مدت کے بعد زبان پر ایسا محققانہ مضمون نگاہ کے سامنے آیا۔ بے اختیار آپ کو لکھنے کا دل چاہا۔ اللہ آپ کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔ میرا تو ارادہ ہے کہ آپ کی یہ ساری تحقیقات اصل کتاب پر بطور حواشی نقل کرا لوں۔

صرف گھگا گھم اور گھگا گھی کے سلسلہ میں جو ارشاد ہے اس سے پوری طرح مستفید نہ ہو سکا۔ پنواڑی کا بھی دونوں معنوں میں استعمال اس ہیچ مداں کی نظر سے گزرا ہے۔

دعاگو
عبدالماجد

۱؎ مولانا مرحوم باوجود علم و فضل و تبحر علمی کے آخر تک طالب علم رہے خط کا آخری فقرہ اس کا واضح ثبوت ہے کہ تحریر میں مسعود صاحب سے اصلاح کی فرمائش کر رہے ہیں۔ ۲؎ یہ انعام وہی تھا جو یوپی حکومت کی قائم کردہ انعامی کمیٹی کی طرف سے اردو کے مسلم الثبوت ادیب کو اس کی ادبی خدمات کے صلہ میں ۵ ہزار روپیے کی رقم کی شکل میں دیا جاتا تھا اس سے پہلے مولانا مرحوم کو بھی یہ انعام مل چکا تھا۔ ۳؎ مصنفہ صدق جائسی متعلق بہ حالات پرنس معظم جاہ آف حیدرآباد۔ ۴؎ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا اردو میگزین جس کا مجاز نمبر شائع ہوا تھا۔ ۵؎ "سرمایہ زبان اردو" مصنفہ جلال لکھنوی

۲۴ ستمبر ۵۶ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

انشاء اللہ، ۱ستمبر (دوشنبہ) کی سہ پہر کو تقریباً ۵ بجے آدھ گھنٹے کے لیے حاضر خدمت ہوں گا۔

برسات کا موسم ہے ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر شدید بارش ہو جائے اور مجھے شرمندگی سے "پانی۔ پانی" ہو جانا پڑے۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

---

۱۷ اکتوبر ۵۶ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

اس روز یقین فرمایئے کہ آپ کی گفتگو سے بہت کچھ مستفید ہو کر آیا۔ پھر گفتگو کی حلاوت پر میز کی لذتیں مستزاد۔ دماغ اور معدہ دونوں اپنے۔ اپنے حصہ سے بہرہ ور۔

یہ فرمایئے کہ اودھ پنچ اول اور فسانۂ آزاد میں جو کثرت سے ترکیب یاران سرپل کی آئی ہے اس میں یہ "سرپل" کی ماہیت کیا ہے اور صحیح تلفظ کیا رکھتا ہے۔ کسی لغت وغیرہ میں اس کا نظر سے گزرنا یاد نہیں پڑتا۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

---

۱۰ دسمبر ۵۶ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

کل اتفاق سے لغات النساء مولفہ مولوی سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ میں نظر گھا گھی پر پڑ گئی۔ تلفظ وہی ہے جو آپ نے بیان فرمایا تھا یعنی گہا گہی نہ کہ گھا گھی۔ جی میں آیا کہ بہ تاکید آپ کو لکھ بھیجوں۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

---

۲۳ اپریل ۵۸ء

مخلص نواز السلام علیکم

نو بہاراں کا کیا کہنا۔ وقت نکال کر ایک۔ ایک شعر بغیر درمیان سے کچھ چھوڑے پڑھتا جاتا ہوں۔ اتنی توجہ کم ہی کسی کتاب کے حصے میں آتی ہے۔

ص ۲۱ پر اس شعر نے غضب ہی ڈھا دیا۔ اس سے بڑھ کر شعر تو اس دیوان میں بھی عاشقانہ رنگ میں نہ ملے گا۔

چپ بھی رہتے ہو تو گفتار کا ہوتا ہے گماں
شاذ اس طرز کی شیریں سخنی ہوتی ہے

سبحان اللہ ماشاء اللہ۔ تصوف و معرفت کے شعر بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اس سلسلہ سے الگ۔ بارک اللہ۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

یکم مئی ۵۸ء

ذرہ نواز وعلیکم السلام

آپ خواہ مخواہ میری عزت افزائی کے درپے ہیں۔ بہر حال جوں توں ڈرتے جھجکتے تعمیل ارشاد کر دی ہے ایسا تو کوئی شاعر آج تک ہوا ہی نہیں جس کا ہر شعر یکساں مرتبے کا ہو۔ غالب کا سا نغز گفتار اور پھر منتخب شائع شدہ کلام اس پر بھی پڑھنے والا اپنے رنگ کے شعر بس کچھ ہی پاتا ہے۔

ایک 'صاد' علامت میری پسند کا ہے اور ذیل صاد علامت

لہ یہ جملہ رعایت لفظی کا شاہکار ہے۔ ملہ مراد ۱۰ستمبر کی ملاقات ہے جو مولانا کی آثر صاحب سے ان کے دولت خانے پر ہوئی تھی۔ ملہ مراد جلسے اور لوازمات ضیافت سے ہے۔ ملہ اودھ پنچ اول منشی سجاد حسین کی ایڈیٹری میں نکلا تھا۔ ملہ اس سے مولانا مرحوم کی امتیازی خصوصیت یعنی طالب علمانہ ذوق کا پتہ چلتا ہے کہ الفاظ اور محاورہ کے بارے میں اثر صاحب کی تحقیق سے مستفید ہوتے تھے اور اس بارے میں ان سے برابر خط و کتابت رہتی تھی۔ ملہ مراد ۱۰ستمبر والی ملاقات ہے جب مولانا کی اثر صاحب سے ملاقات ان کے دولت خانے پر ہوئی تھی۔ ملہ حضرت اثر کا نو طبع شدہ دیوان یا مجموعہ کلام۔

بہت زیادہ پسند کی ہے۔ باقی ناپسند کا کوئی سوال تو آپ کے کلام میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔

مرزا محمد ہادی رسوا[1] مرحوم سے میں نے کسی مشکل شعر کا مطلب دریافت کیا جواب میں لکھا کہ میں کبھی شعر پر غور و فکر نہیں کرتا۔ بس جو شعر پہلی ہی نظر میں پسند آگیا چن لیتا ہوں۔ باقی کو یہ سمجھ کر چھوڑ دیتا ہوں کہ میرے لیے نہیں ہیں۔ بات خوب اور میرے دل کی کہی[2]۔ جس شعر کے سمجھنے میں زور لگانا پڑے وہ شعر نہ رہا فلسفہ ہو گیا۔ جواب میں غیر معمولی دیر ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

۱۳ جون ۵۸ء

کرم گستر السلام علیکم

قلمی کلام کے مطالعہ سے اب فرصت ہوئی۔ چغتائی[3] اگر شام کو آئے تو کاپی[4] ان کے حوالہ کر دوں گا۔ سرخ ص بنا تا گیا ہوں کوئی دس شعر ایسے نظر آئے کہ طبیعت بے اختیار پھڑک اٹھی ان پر دوہرے ص بنا دیے ہیں۔ اشارۃً وہ شعر حاضر ہیں۔

(۱) جس نے دیکھا وہ دیکھتا ہی رہا الخ

(۲) اس کے مائل کثرت ہوئی "

(۳) سارا عالم آئینہ ہے "

(۴) میری مرضی ہو جہاں "

(۵) نگاہ مل نہ سکی حشر "

(۶) جب کہا اس نے مدعا کہیے "

(۷) عدل کے بدلے مطلب "

(۸) نہ پڑھی فرد عمل میری "

(۹) شوق بڑھتا گیا گناہوں کا "

(۱۰) میر کی ایک عمر وفا میری "

آپ کے عاشقانہ کلام سے تو خیر توقع ہی یہ تھی لیکن حیرت ہو کہ آپ کو تصوف اور معرفت سے اتنا درک کہاں سے حاصل ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس دریا کے شناور ہیں۔ بچپن سے سنتا آیا تھا کہ شیعہ حضرات تصوف کے دشمن ہوتے ہیں۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

۷ راکتوبر ۵۸ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

خدا کرے آپ ہر طرح بخیریت ہوں۔

فسانۂ آزاد میں کئی جگہ محاورہ آیا ہے "حکم بس آیا داخل ہے" حکم بس آیا ہی چاہتا ہے "کے محل پر۔ داخل کا یہ استعمال مجھے نامانوس معلوم ہوا۔ شعر یا غزل کے لیے لکھنے کے بجائے نظم کہا تو برابر استعمال میں ہے۔ لیکن اپنے لڑکپن میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہی نظم کہا کتاب کی تصنیف کے لیے بھی سنا ہے۔ شلاً یہ کتاب کس کی کہی ہوئی ہے؟[5] اردو محاروں سے متعلق براہ کرم اپنی تحقیق سے مستفید فرمائیں۔

والسلام دعاگو عبدالماجد

---

[1] اردو کے مشہور ناول نویس اور صحیح اردو لکھنے والے ادیب مرزا محمد ہادی رسوا کا شاعری میں تخلص مرزا تھا۔ چونکہ ناول نویسی اس زمانے میں اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی تھی اس لیے انھوں نے فرضی نام رسوا کا اختیار کر لیا تھا۔ مولانا مرحوم کے ان سے خصوصی تعلقات تھے۔

[2] اشعار کے بارے میں مولانا کا یہی ذوق تھا۔

[3] مراد مرزا سید لطف چغتائی حال ریڈر فزکس ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی ہیں۔ یہ مولانا کے ہم وطن تھے اور روزانہ مولانا کے ہاں آنے والوں میں تھے یہ اس زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے انھیں اردو شاعری اور ادب سے بڑی دلچسپی تھی۔ حضرت اثر کے ہاں بھی یہ برابر حاضری دیا کرتے تھے۔

[4] کاپی سے مراد حضرت اثر کی بیاضیں ہے جو انھوں نے مولانا کو بھیجی تھی۔

[5] مولانا کی حضرت اثر سے اس قسم کی ادبی تحقیق کے بارے میں برابر خط و کتابت رہتی تھی۔

۱۱ر اپریل سنہ ۶۰ء

بندہ نواز وعلیکم السلام

آپ کی کتاب لغت کا کیا کہنا۔ بے پڑھے ہوئے بھی اس پر ایمان بالغیب رکھتا ہوں لیکن بجائے اس کو خود چھپوانے کی زحمت میں پڑنے کے کیا کسی ناشر کے حوالے کر دینا بہتر نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نقد نذرانہ یا رائلٹی یہ لوگ کچھ زیادہ نہ دے سکیں گے تاہم یہ کیا کم ہے کہ آپ کو سارے خرخشوں سے نجات مل جائے گی[1]۔ ذیل کے ادارے ضرور قابل غور ہیں ان میں جس کسی سے بھی معاملت طے ہو جائے: راجہ رام کمار پریس سابق نول کشور پریس[2]۔ کتاب گھر مسعود حسن رضوی والا[3]۔ دانش محل امین الدولہ پارک[4]۔ فروغ اردو امین آباد[5]۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ جس کے سرور صاحب[6] سکریٹری ہیں۔ چھپ جانے کے بعد یوپی سرکار کی انعامی کمیٹی سے قدردانی یقینی ہے لیکن خود میری صدارت کی مدت تھوڑی رہ گئی ہے۔ کتاب کا نام معلوم نہیں آپ نے کیا رکھا ہے؟

ایک خیال ناقص اور عرض کروں۔ کتاب میں تنقید و تبصرہ سب ہی لغات پر ہو۔ فرہنگ آصفیہ، جلال، امیر اللغات وغیرہ سب پر محدود محض نور اللغات پر نہ رہے ورنہ لوگ خواہ مخواہ ایک شخصی بحث بنا لیں گے۔ غالب سے یہی غلطی قاطع برہان تصنیف کرتے وقت ہو گئی تھی۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

۹ر اگست سنہ ۶۱ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

خدا کرے آپ ہر طرح صحیح تندرست اور بہ عافیت ہوں۔

ذیل کے دو فقروں میں فصیح اور فصیح تر آپ کسے قرار دیں گے۔؟

"وہ اپنے کو ڈاکٹر کہلاتا ہے"۔ "وہ اپنے کو ڈاکٹر کہواتا ہے"۔

فسانۂ آزاد میں کہوانا بار بار آیا ہے۔

دعاگوئے صحت و عافیت

عبدالماجد

۵ر ستمبر سنہ ۶۱ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

ایک زحمت آج پھر دے رہا ہوں۔

(۱) امراؤ جان ادا (مرزا رسوا) میں میں نے سلام کی جمع مونث پڑھی تھی۔ "لوگ ان کو سلامیں کرتے تھے"۔ میں سمجھا چھاپنے کی غلطی ہے اب بجنسہٖ یہی جملہ فسانۂ آزاد میں بھی پڑھا۔ اب تو چھاپنے کی غلطی تسلیم کرنا مشکل ہے۔

(۲) "اس ہفتہ میں وہ آ کے داخل ہے" یعنی اس ہفتہ وہ آیا چاہتا ہے یا پہنچا چاہتا ہے۔ داخل کی یہ ترکیب کئی جگہ فسانۂ آزاد میں بھی نظر آئی اور سمجھ میں نہ آئی۔

(۳) اور خود آپ کے مضمون میں میر انیس کا یہ مصرعہ منقول دیکھا۔

گویا علی کھڑے ہیں مہیا جہاد پر

یعنی مہیا مستعد آمادہ کے معنی میں ہے۔ دو تین لکھنوی صاحبان مثلاً مرزا محمد عسکری مرحوم بھوائی تو لوی سے دریافت کیا سب نے اس مفہوم سے لاعلمی ظاہر کی۔ جواب صرف اسی صورت میں مرحمت فرمائیے کہ لکھنے پڑھنے سے صحت پر کوئی برا اثر نہ پڑ رہا ہو ورنہ ہرگز۔ میری طرف سے کوئی تقاضہ نہیں۔

والسلام دعاگو عبدالماجد

---

[1] حضرت آثر نے اپنی لغت کی طباعت کے لیے مولانا سے مشورہ چاہا تھا۔ [2] نول کشور پریس کے دو حصے ہو گئے تھے ایک راجہ رام کمار پریس اور دوسرا تیج کمار پریس۔ [3] کتاب گھر پروفیسر مسعود حسن کا مکتبہ یا ادارۂ اشاعت تھا۔ [4] دانش محل اردو کتابوں کا بڑا مرکز۔ [5] فروغ اردو، اردو کتابوں کا مشہور دار الاشاعت۔ [6] پروفیسر آل احمد سرور۔ جو اس وقت انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری تھے۔

[7] مولانا دوسروں کی سہولت کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۶۱ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم و رحمۃ اللہ

عطیہ گرامی موصول ہوا کیا کہنا ماشاء اللہ و سبحان اللہ۔ یہ تو پورا ایک دفتر نکلا، لحیم، شحیم ضخیم، میں سمجھے ہوا تھا کہ کوئی رسالہ ہوگا منحنی سا۔

بہرحال سراپا سپاس ہوں۔ صدق میں گو اب تبصرے نہیں نکلتے۔ تاہم اس کا مختصر تعارف تو ضروری ہے۔ گنجائش جب بھی نکل سکے۔

سرسری نظر جہاں جہاں پڑی داد ہی دیتے بنی۔ جھنڈولیا، جھنڈے گرطا، جھانبو، تینوں لغت خوب نکلے۔

آپ یہ کتاب نہ لکھ جاتے تو اپنے اوپر بھی ظلم کرتے اور اردو ادب پر بھی[1]۔ اللہ اس طرح کی صحیح خدمت اردو کے لیے آپ کی عمر و صحت میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے۔

کتاب میں بار بار نام فیلن اور پلیٹس کے آئے ہیں[2] اگر شروع میں ان کا مختصر تعارف آجاتا تو ناظرین کے لیے بہتر ہوتا۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

---

۵ نومبر ۱۹۶۱ء

کرم گستر السلام علیکم

خدا کرے آپ ہر طرح بہ خیر ہوں۔

اہل دہلی کی تحریروں میں برابر بجائے کھلانے کے کھواتے کا استعمال دیکھتا ہوں۔ ایک آدھ لکھنوی کی تحریر میں بھی دیکھا ہے آپ کے نزدیک کھوانا کہاں تک صحیح ہے۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

متفرق

پیام بنام جناب ایڈیٹر مسیحا، بمبئی

دریاباد ۲۶ جنوری ۱۹۶۱ء

آپ کا "مسیحا" اپنے اوپر حق شاید صرف طبیبوں اور تندرستوں کا نہیں بلکہ مریضوں اور ناتوانوں کا بھی سمجھتا ہے۔ جب ہی تو اس نے یوم جمہوریت کے موقع پر ایک زار و ناتواں کو یاد کر لیا۔

جمہوریت کی جد و جہد میں ایک بڑا حصہ طبیب اعظم اجمل خاں کا تو تھا ہی باقی چھوٹے بڑے اور بہت سے طبیب بھی اس کے لشکریوں میں رہے ہیں۔

مسیحا کا ایک کام قتل دجال بھی ہے خدا کرے جمہوریت واقعی جمہوریت ہی بن جائے اور جتنے دجال ان وقت اس راہ میں حائل ہوئے ہیں سب کا قلع و قمع یہ کر دے۔

عبدالماجد

پیام بنام انور ظہوری صاحب ایڈیٹر ماہنامہ "نیا راہی" کراچی ۲۱ جنوری ۱۹۶۱ء

سلیمان نمبر کے لیے سلیمان کے شایان شان یہ "مور ضعیف" پر و بال کہاں سے لائے! مرحوم سے اس نیاز مند کے تعلقات ۴۰-۴۵ تک رہے گہرے، بے تکلفانہ، عزیزانہ، طالب علمی سے لے کر سن کہولت تک عمر کے ہر دور میں شروع شروع ایک حد تک حریفانہ و مبارزانہ۔ اخلاص نے ساتھ ہر دور میں دیا۔

اتنے طویل تجربہ اور سابقہ میں ایسا شریف ایسا متین ایسا سنجیدہ کمتر ہی کوئی نظر آیا۔ صحیح معنی میں طالب علم ساری عمر کے رہے علم کے پتلے، کتاب کے کیڑے۔ علم و تحقیق کا ذوق ہر دوسرے ذوق پر غالب۔ سیرۃ النبی سے عشق ساری عمر رہا اور آخر میں فنا فی الشیخ ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک پیکر تواضع و خشوع، علمی معاملات

---

[1] یہ فرہنگ اثر یعنی حضرت اثر کی مرتبہ لغات کے بارے میں ہے۔
[2] ان دونوں انگریزوں نے اردو ڈکشنری تصنیف کی تھی۔

میں اپنے چھوٹوں سے بھی اپنے کو چھوٹا سمجھنے والے۔

والسلام

عبدالماجد

بنام خورشید احمد صاحب ایڈیٹر "مشعل راہ" کراچی[1]

۲۰ اگست ۱۹۶۱ء

برادرم سلمۂ وعلیکم السلام

'چراغ' کا بدل آپ کو 'مشعل' خوب ہاتھ آگیا۔ بدل کیوں نعم البدل کہیے۔

اور آپ خود ٹھہرے مطلع انوار خورشید ع

این خانہ تمام آفتاب است

مشعل کی روشنی تو ابھی یہاں تک پہنچی نہیں صرف آپ کے خط سے یہ اطلاع پاکر یہ ایک لفظی 'پھلجھڑی' تیار ہوگئی۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

بنام مرزا سعید الظفر چغتائی لکچرر فزکس گورکھپور یونیورسٹی حال ریڈر فزکس مسلم یونیورسٹی[2] اگست ۱۹۶۲ء

عزیزم سلمۂ وعلیکم السلام

جی ہاں خدمت 'مصحف' کے بعد اللہ کی ذرہ نوازی سے خود اپنے ظرف وبساط کے مطابق 'مصحفی' ہورہا ہوں۔ مصحفی شاعر بے چارے کی طرف اب کیا توجہ کروں۔

اندیشم و دلدار من

گو یدم جز دیدار من

البتہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب جو کچھ بھی عنایت فرمائیں ان کا عین کرم سمجھوں گا۔ اللہ انھیں بھی لفظ وعبارت کی منزلوں سے گزار کر جلد عالم معانی تک پہنچا دے۔

دعاگو

عبدالماجد

بنام جگن ناتھ آزاد

کلام محرومؔ[3]

کلام محروم کے وسیع اور مکمل مطالعہ سے تو اب تک محروم ہی رہا ہوں۔ پھر بھی اس کا اچھا خاصا حصہ پڑھ لیا ہے کبھی رسالوں میں کبھی خود ان کے مجموعۂ کلام میں اور ان کے نام نامی سے تو اپنے بچپن ہی سے روشناس رہا ہوں۔ اتنی بات تو ہانک پکار کر کہہ سکتا ہوں کہ جن لوگوں نے اردو کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص سمجھ رکھا ہے ان کے اس سو فیصد غلط دعوے کے جواب میں جن مسلم و معروف اکابر اردو کو پیش کیا جاسکتا ہے ان میں سرشار، چکبست، نسیم، برق، ہجر، فراق، ساحر، شاد، درد اور منشور لکھنوی کے ساتھ ایک نام محروم کا بھی یقیناً ہوگا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک پنجاب اور وہ بھی پنجاب کے دیہات میں پیدا ہونے والے نے دلی اور لکھنؤ کی معیاری زبان پر عبور کیسے حاصل کرلیا! پھر یہ قدرت زبان کسی ایک صنف کے ساتھ مخصوص نہیں محدود نہیں کیا غزل اور کیا قطعہ کیا مثنوی اور کیا رباعی ہر جگہ

ہے قلم ان کا ابر گوہر بار

ہے زبان ان کی تیغ جوہر دار

یہ تو ہوئی ان کے کلام کی ادبی، لفظی لطافت و ملاحت، رہی معنویت تو ان کے زمزمہ توحید و نغمہ معرفت کو سن کر دھوکا بار بار کلام اقبال کا ہوتا ہے اور گمان یہ گزرنے لگتا ہے کہ یہ کوئی نیا اور البیلا شارح و ترجمان سعدی و رومی کا نکل آیا ہے اور شرافت تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کی جان اور جوہر ہی ہے۔

---

[1] مکتوب الیہ پہلے 'چراغ' کے نام سے اخبار نکالتے تھے۔ [2] مکتوب الیہ اس زمانے میں گورکھپور یونیورسٹی میں فزکس کے لکچرر تھے اور انھوں نے مولانا سے 'مصحفی' پر لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ بہت پہلے مولانا مرحوم 'مصحفی' کی مثنوی 'بحر المحبت' ایڈٹ کرچکے تھے۔ [3] مکتوب الیہ کے والد اور نامور شاعر منشی تلوک چند محروم کے کلام کے بارے میں مندرجہ بالا پیام بھیجا گیا۔

اس مادیت، سطحیت، اخلاق بیزاری اور سفل پروری
کے دور میں جب کسی نے مخدوم کی یادگار منانا چاہی وہ خود لائق
صد احترام اور مستحق صد ستائش ہے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ حا تہنیت
کے اخلاص کے، شرافت کے، صحیح و لطیف ذوق شعر و ادب کے
ماننے والوں سے، قدر دانوں سے احترام کرنے والوں سے
ملک اب بھی خالی نہیں ہے۔

نثار احمد صاحب فاروقی لائبریرین دلی یونیورسٹی نے
اردو میگزین کے تیر نمبر کے لیے پیام مانگا تھا اس کے جواب میں
مندرجہ ذیل پیام بھیجا گیا۔

پیام

میگزین کا تیر نمبر آنعزیز کی رہبری میں نکلے گا انشاءاللہ
سب میگزینوں کا "میر" ہی ہوگا۔ مضامین تحقیقی ہوں گے
لیکن خشک نہیں۔ عمیق ہوں گے لیکن دقیق نہیں لطیف و شگفتہ
ہوں گے لیکن سپاٹ اور بے مغز نہیں۔ ندرت رکھیں گے لیکن
غرابت نہیں۔

یہ سب باتیں بطور ایمان بالغیب پہلے ہی سے فرض کیے
ہوے ہوں۔ اور خدا نخواستہ یہ سب کچھ نہ سہی جب بھی یہ جرأت
کیا کچھ کم قابل داد اور مستحق آفریں ہے کہ میر تقی میر جیسے پرانے شاعر
کی یاد آپ اس دور جدت پرستی میں منانے نکلے ہیں!
ایسے باکمال کی یاد منانا خود اپنے حسن ذوق کا ثبوت پیش
کرنا ہے۔

والسلام

عبدالماجد

بنام نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار"
(یہ مکتوب الیہ کے پدم بھوشن ہونے کی خبر پڑھ کر لکھا گیا)
بسم اللہ
خطاب کی خبر پڑھ کر
"نیاز" مقام "ناز" میں
خیر کسی اردو والے کی قدر تو ہوئی۔

تہنیت گزار

عبدالماجد

بنام حاجی مقتدی خاں صاحب شیروانی علی گڑھ
۲۸ ستمبر ۶۲ء

وعلیکم السلام
عرض سے طول کے عمق کا کیا کہنا! سطح بلند بر زاویہ نظر ہے۔
نقطہ رکھنے کی گنجائش نہیں۔ خط ختم کیے دیتا ہوں کہ مقالہ
اقلیدس کی شکل نہ اختیار کر لے۔

دعاگو

عبدالماجد

دریاباد ۵ نومبر ۶۵ء
مقتدی کا سلام مقتدا کو
ارذل کا خطاب افضل کو۔
لکھنؤ میں صوبہ جج کیٹی میں آپ کی ذات برادری کے ایک
صاحب سے ملاقات ہوئی آپ کا ذکر خیر چھڑ کر اکبر کا مصرعہ
آپ کی شان میں بلکہ آپ کی آن میں انھیں سنایا۔ ع
قیامت ڈھائے گا جنت میں یہ بڈھا جوان ہو کر
سن کر پھڑک گئے اور کیسے نہ پھڑکتے اللہ نے تخلیق ہی
آپ کی ایسی کی ہے کہ پڑھے لکھوں کی زبان میں ایک عجوبہ عام اور
نخاس والوں کی بولی ٹھولی میں بوڑھے بالم

والسلام

عبدالماجد

بنام خیر بہوروی صاحب، غالب اکیڈمی مدن پورہ بنارس
پیام[1]
غالب کی قدر کرنا خود اپنی سخن شناسی اور خوش ذوقی کا ثبوت

---

[1] یہ پیام یوم غالب کے سلسلے میں خیر بہوروی صاحب کے نام جو اردو کے زبردست پرستار اور کارکن تھے، بھیجا گیا تھا۔

دیتا ہے۔ اہل بنارس قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کا ذخیرہ کو یاد رکھا۔

دریاباد ۲۳ جنوری ۱۹۶۵ء

کرم گستر وعلیکم السلام

مجموعہ[1] کا نام "کارخیر" اے سبحان اللہ! یہ آپ نے میرے دل کی بات کہاں سے اڑالی۔ رشک آگیا۔ یہ نام تو میں رکھتا۔ کتاب کے اندر جو کچھ بھی ہو بہرحال اس "کارخیر" کا جواب نہیں ہو سکتا۔

والسلام

دعاگو و دعا خواہ

عبدالماجد

عابد نظامی صاحب حلقۂ ادب لاہور پاکستان نے خواجہ حسن نظامی پر پیغام مانگا تھا۔ ذیل کی تحریر اسی کے جواب میں ہے۔

دریاباد یکم اپریل ۱۹۶۵ء

بسم اللہ

البیلا ادیب

از عبدالماجد

تاریخ زبان اردو کے پرچہ میں اگر یہ سوال آیا ہے کہ البیلا ادیب کون گزرا ہے تو جواب صرف ایک ہوگا۔

خواجہ حسن نظامی

وہ مستوں کا مست، سرشاروں کا سرشار، دیوانہ بکار خویش ہشیار، ادب کا خادم ادیبوں کا مخدوم سب سے نرالا اپنی اداؤں میں البیلا، زباں دانوں کا پیارا ادب دانشار کی آنکھوں کا تارا۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

بنام مولانا اسد القادری صدر پاکستان اردو اکیڈمی کراچی

دریاباد ۲۳ جون ۱۹۶۵ء

بندہ نواز وعلیکم السلام

یوم شبلی کی تحریک مولانا "اسد" کی طرف سے! بہت ہی خوب

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

پروگرام کی دفعات بکھری ہوئی مگر بڑی نکھری ہوئی نظر آئیں! "دِلکش سُن موہنی" وجد آفریں اہل قال سے بڑھ کر اہل حال کے قابل یہ نیازنامہ ان ہی کی خاطر ہے۔

والسلام

عبدالماجد

بنام پروفیسر معین الرحمٰن صاحب گورنمنٹ ڈگری کالج بھاولپور پاکستان

دریاباد ۷ جولائی ۱۹۶۵ء

برادرم وعلیکم السلام

بڑی ہی حیرت ہوئی کہ اس مضمون پر اظہار خیال کیسے رہ گیا ایسا کبھی ہوتا نہیں۔ خدا معلوم کیا بچوگ پڑگیا۔ اور حیرت سے بڑھ کر ندامت اور ندامت سے بڑھ کر معذرت واجب آگئی۔

نقوش کے آخری نمبر میں ذکر عبدالحق پڑھا میں ہوتا تو عنوان رکھتا "عبدالحق بزبان عبدالحق" — یہ خلاقی تو اللہ میاں کی سی تھی کہ حشر میں جسم کے ایک ایک ٹکڑے پرزے کو جوڑ کر جسم کو پھر سے پیدا کردیں گے اور میت کو بہت بنا دیں گے — بندے کے لیے یہ صناعی بھی کچھ کم نہیں کہ اس نے جا بجا کتی سے صیغۂ غائب کو صیغۂ متکلم میں تبدیل و تحویل کر دیا۔ مشت خاک نے آخر کچھ تو حق احسن الخالقین کی نیابت کا ادا ہی کر دیا۔ نہ ہوا شاعر — ہر طرف سے صدائیں مرحبا و سبحان اللہ کی آنے لگیں۔

---

[1] مکتوب الیہ کی کسی تصنیف کا نام۔

بہر حال میں تو قائل آپ کی دیدہ ریزی، ذہانت، ذوق صحیح، غرض ایک لفظ میں آپ کی صنعت گری کا ہو گیا۔

والسلام

عبدالماجد

بنام جناب طالب چکوالی صاحب لاجپت نگری دہلی

دریاباد ۲۴ اگست ۶۵ء

کرم گستر۔ تسلیم

"برگِ سبز" موصول ہو گئی تھی وقت نکال کر ادھر اُدھر سے سیر کر لی۔ "برگ" کا ہے کو ہے پورا چمن ہے گلزار و شاداب اور آپ طالب نہیں اردو کے حق میں تو عین مطلوب ہیں۔

دعاگو

عبدالماجد

بنام درشن سنگھ دگل صاحب نئی دہلی

دریاباد ۱۱ ستمبر ۶۶ء

مہربان بندہ تسلیم۔

آپ کے کلام پر سرسری نظر ڈالی تو آپ اس شہد کی مکھی کی طرح نظر آئے جو بلا تفریق و امتیاز ہر شیریں و شاداب پھول سے رس چوستی ہوئی اور اس سے لذیذ نفیس، حیات بخش شہد یا امرت تیار کرتی رہتی ہے یا پھر اس عاشق صادق کی طرح جو رسوم ظاہری کفر و ایمان سے بیگانہ لیکن محبت و معرفت کی منزلوں میں دیر و حرم دونوں کا یگانہ ہر طرف "تلاش نور" میں مستانہ گھومتا پھرتا ہے اور جہاں کہیں اسے کوئی کرن نظر آتی ہے بس اپنی جبینِ عقیدت سے وہیں سجدہ بسر ہو جاتا ہے۔

مبارک ہے ایسا شاعر اور ایسی شاعری خصوصاً اس شر و فساد کے دور میں اس آپا دھاپی اور نفسا نفسی کی دوڑ بھاگ میں۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

فرمان فتح پوری صاحب ایڈیٹر نگار کراچی نے نگار کے نیاز نمبر کے لیے پیام یا مقالہ مانگا تھا۔ اسی کے جواب میں مندرجۂ ذیل پیام بھیجا گیا۔

۹ مارچ ۶۳ء

بسم اللہ

ایک "نیاز مند" کی فرمائش مدیر "صدق" سے کہ وہ مناقب "نگار" و "نیاز" پر کچھ لکھے۔ ستم ظریفی کا شاہکار!

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب!

"فرمان" کی تعمیل میں بس اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ نیاز صاحب سخن سنج اچھے ہیں شعر کی پرکھ خوب رکھتے ہیں اور صاحب طرز ادیب ہیں۔

والسلام

عبدالماجد

بنام نادم سیتاپوری صاحب بذریعہ سلطان حسن صاحب تاجر کتب بندر روڈ کراچی

لکھنؤ، ۱۰ اپریل ۶۳ء[1]

برادرم وعلیکم السلام

اب خدا خدا کر کے اس قابل ہوا ہوں کہ کچھ لکھ پڑھ سکوں۔ آپ کی کتاب یہاں سے مانگ کر اس پر یہ چند سطریں لکھ دیں۔

بسم اللہ

"غالب نام آورم" کے مرتب نے خود نام آوری کے زینے کی طرف پہلا قدم تو اٹھا ہی لیا ہے۔ ان کی یہ چھوٹی موٹی کتاب ہر چند بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کا نمونہ اس قابل ہے کہ اسے رسی غالبیات کی پہلی کتاب قرار دی جائے۔

نقل؛ اغلاق سے خالی، غلو؛ اغراق سے بری، تنقید، تحقیق اور آج کل کی اصطلاح میں تخلیق تینوں کا ایک ہلکا خوشگوار مجموعہ۔

عبدالماجد

---

[1] مولانا مارچ ۶۳ء میں علیل ہو کر بغرض علاج لکھنؤ گئے تھے اور تپ و نزلے میں کئی ہفتے مبتلا رہے۔

بنام نادم سیتاپوری صاحب محلہ حصارہ سیتاپور

لکھنؤ ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۰ء

برادرم وعلیکم السلام

آج کل دریاباد سے باہر ہوں اور یہ کارڈ لکھنؤ سے لکھ رہا ہوں۔ کوئی اور اگر یہ سوال میاں چکبست سے متعلق کرتا تو جواب میں صرف یہ لکھ بھیجتا "بچی بچی"!

لیکن آپ کی نفاست طبع کو یہ کیا سوجھی کہ خاک کو پاک کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اور کچھ مجھے ان بزرگ سے متعلق معلوم نہیں سوا اس کے کہ ردولی ان کا وطن تھا۔ دیوان کی سرسری زیارت صرف ایک بار ہوئی تھی دو ہی چار ورق پلٹے تھے کہ متلی ہونے لگی۔ میرے علم میں تو دیوان بھر میں شاید بس ایک ہی صاف شعر ہے دوسروں کے سامنے پڑھنے کے قابل۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ اپنا وقت "عزیز جان صاحب" پر صرف کرتے۔

والسلام

عبدالماجد

خلیق الرحمان صاحب قدوائی بڑاگاؤں ضلع بارہ بنکی نے یاقوتی آم کی دو قلمیں بھیجی تھیں۔ اس کے جواب میں شکریہ کا یہ خط گیا۔

دریاباد ۲۶ جولائی ۱۹۶۳ء

عزیزم سلمہٗ وعلیکم السلام

قلموں کی خبر نے دل باغ باغ کر دیا جزاک اللہ۔ ماشاءاللہ آم کا تحفہ یوں بھی کیا لذیذ اور رسیلا ہوتا ہے چہ جائیکہ جب اخلاص کی تہہ میں ڈوبا ہوا۔

سہ پہر کو کارڈ ملا اور شام کو میاں قیوم سلمہٗ نے قلمیں پہنچا بھی دیں تحفہ جو بحمد بے سان و گمان نصیب ہوا اس لیے نعمت غیر مترقبہ کا پورا مصداق!

دعاگو

عبدالماجد

بنام صہبا لکھنوی مکتبہ افکار کراچی

پیام

۳۰ جولائی ۱۹۶۳ء

جوش نمبر کے بعد حفیظ جالندھری نمبر۔ آتش پیال کے بعد دور ماہ اللہ اور شربت روح افزا کا! الحاد کو شہ دینے کے بعد تحسین دپیشوائی اسلام کی!! حسن تلافی کا حسین و قابل دید نمونہ۔

شاہنامہ اسلام کا مصنف اور سر پیر الملاح کا خالق۔ آپ کے ملک میں اندھیرے کے گھر کا چراغ ہے اکبر و اقبال دو کا جانشین۔

والسلام

عبدالماجد

بنام شیخ نصیر الرحمٰن قدوائی صاحب بڑاگاؤں بارہ بنکی

۱۲ ستمبر ۱۹۶۳ء

برادرم سلمہٗ السلام علیکم

اس عزیز کے صدر ضلع شکر کمیٹی ہونے کی خبر ابھی معلوم ہوئی۔ اخلاص و اخلاق کی شیرینی پر اس رسیلی کمیٹی کی صدارت کا اضافہ مبارک ہو اور اللہ دنیا و آخرت میں شیریں کام ہی رکھے۔

اس خط کے حامل چھجو لال دریاباد کے قریب ہی کے گاؤں کے رہنے والے ہیں کا بیان ہے کہ وہ ایک مدت دراز سے یعنی دس سال سے یہاں کی گنا یونین میں موسمی عہدے دار ہیں اور موسم کے ختم ہونے پر انھیں جواب مل جاتا ہے۔ آرزومند

۱۔ مولانا مرحوم کے ماموں زاد بھائی کے بڑے صاحبزادے اور مولانا کے مخلص کارگزار۔

۲۔ مولانا محمد علی کے انتقال پر حفیظ صاحب نے ایک تعزیتی نظم اس عنوان سے کہی تھی۔

۳۔ مکتوب الیہ ضلع گنا فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے تھے مکتوب الیہ اور ان کے خاندان سے ہم لوگوں کی قرابت داری ہے۔

ہیں کہ خدمت کا موقع انھیں مسلسل ملتا رہے۔
خدا معلوم محکمہ میں ملازمت کے قاعدے کیا ہیں بہرحال اگر قاعدہ میں کوئی گنجائش ہو تو کیا عجب ہے کہ نعم الموسیٰ ونعم المفسر کا ورد کرتے ہوئے وہ اپنی آرزو میں کامیاب ہو جائیں۔

والسلام
دعا گو عبد الماجد

بنام زوار حسین زیدی صاحب لاہور
۱۴ مئی ۱۹۶۳ء

بسم اللہ
مہربان بندہ السلام علیکم
مجھ سے بد خطی سے جس کی بدخطی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہے قلمی تحریر کی فرمائش کی خوب رہی!
یہ آخر آپ کو میری رسوائی کی سوجھی کیا!
مومن خاں فن نجوم یا جوتش میں بھی دخل رکھتے تھے فرماگئے ہیں۔ ع

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

اس پہ "قلم خود" کا حکم دینے کے بعد آپ بھی ستم ظریفی میں آسمان سے کچھ کم نہ رہے!
اب اپنے آئینہ خانہ کو بنائیے یا بگاڑیے اس کی ذمہ داری آپ پر ہی ہے بندہ نے تعمیل ارشاد کر دی۔

دعا گو و دعا خواہ
عبد الماجد

بنام جناب شیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی۔ دہلی
یوم اتی کے سلسلے میں پیام ذیل بھیجا گیا۔
یوم اتی
اتی کا نام ناحی اس وقت کان میں پڑا جب میں اسکول کے ساتویں آٹھویں کا طالب علم تھا ان کی ایک نظم اردو کورس میں داخل تھی غالباً کوئی مدرس شہر آشوب قسم کا تھا دو ایک مصرعے اب بھی حافظے میں رہ گئے ہیں۔

دو شالہ اوڑھ کے چلے ہیں فصل گرما میں
ہے شہر بتی کا آنکھ کا بدلا سرما میں

پھر جب ذرا اور بڑا ہوا تو اودھ اخبار میں کہ وہی اپنے دور میں اردو کا سب سے بڑا سب سے زیادہ سربرآوردہ اخبار تھا ان کے مضمون کے مضمون نگ دیکھنے میں آئے۔ شاعر کا نام بھی جب ہی معلوم ہوا۔ ملک الشعراء کا لقب بھی ان کے نام کے ساتھ پڑھنے میں آیا ان کی قدرت کلام کا اندازہ بھی اس وقت ہوا۔ اس وقت وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے اور یہ بجائے خود ایک امتیازی اعزاز تھا۔
مشہور یہ تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس کلیہ کی تردید میں ایک ہجوم جس طرح ایک طرف کشمیری پنڈتوں (نسیم، سرشار وغیرہ) کا تھا اسی طرح دوسری طرف کائستھوں کا تھا۔ اور کائستھ برادری کی صف اول میں ایک جو الایرشاد برق تھے لہٰذا دوسرے یہی دوارکا پرشاد اتی تھے۔ اور حضرت اتی کی خوش نصیبی کہ اپنا جانشین اپنے فرزند سعید اور شاگرد رشید کو چھوڑ گئے جو ہر طرح ان کے کام کو ترقی و تکمیل تک پہنچا دینے والے۔ اور ان کے نام اور یادگار "منور" رکھنے والے ہیں۔ ایسی خوش نصیبی کم ہی کسی کے حصہ میں آتی ہے۔

والسلام
عبد الماجد

بنام پنڈت آنند نرائن ملا لکھنؤ
دریاباد ۲۳ دسمبر ۱۹۶۳ء

کرم فرمائے بے کراں تسلیم!
۱۹ ء کو لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس میں پرنسکار کمیٹی کی میٹنگ تھی اردو

ٹ یوپی گورنمنٹ کی اردو۔ ہندی سنسکرت کتابوں پر انعام دینے والی کمیٹی۔

کے ممبر صرف چار تھے ۔ صدر صاحب (لاٹ صاحب[1] راجستھان) عین وقت پر بیچارے بیمار ہوگئے ۔ جلسہ میں نہ آسکے صدارت کا بار مجھ دیہاتی کے دوش ناتواں کو اٹھانا پڑا ۔ آپ کی حدیث گویزاں [2] "ہم" چار درویش" کی ٹولی کے لیے" باغ و بہار" ثابت ہوئی ۔ انعام اول پر ہم سب متفق رہے اور اس فیصلے نے شاعر کی نہیں بلکہ فیصلہ کرنے والوں کی عزت میں اضافہ کیا ۔

سرکاری اطلاع آپ کو خدا معلوم کب پہنچے ۔ مبارکباد میں سبقت کرنے کی مسرت سے میں اپنے کو کیسے محروم رکھوں ۔

نیازکیش

عبدالماجد

بنام جناب حیات اللہ انصاری صاحب ایڈیٹر[4] "قومی آواز" لکھنؤ

[مکتوب الیہ دریاباد آئے تھے لیکن بجائے مولانا مرحوم کے ہاں دوسری جگہ قیام کیا اور نہ ملنے آئے ۔ اس پر یہ شکایت آمیز مکتوب لکھا ۔]

دریاباد ۱۳ دسمبر ۱۹۶۵ء

برادرم السلام علیکم

آمد دریاباد کی افواہی روایت کی تصدیق و تحقیق کہیں کل شام کو جاکر ہوئی ۔

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

میری مشرقیت اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ میں موجود اور میزبانی کسی دوسرے کے حصے میں جائے !

ہم سے پردہ رہا عزیزوں سے ملاقات رہی

اس مرحوم[3] کا قریب ترین عزیز بزرگ میں ہی تھا اور مجھ سے یہ بیگانہ وشی و بے التفاتی !

شبلی کا گھر بھی خانۂ دشمن کے پاس ہے

محشر خرام اور بھی دو اک قدم سہی

بیگانہ وشی کا ریکارڈ قائم کرنا اسی کو کہتے ہیں ؟

بھول جانا ہمارا یاد رہے

والسلام

عبدالماجد

دریاباد ۲۲ جولائی ۱۹۶۶ء

کرم گستر ۔ السلام علیکم

" قینچی[5] " معماروں کی اصطلاح میں لوہے کی ان آڑی سلاخوں کو کہتے ہیں جو بطور جنگلے کے کسی عمارت پر حفاظت کے لیے لگادی جاتی ہیں کھپریل کا ٹھاٹھر جس پر رکھا جاتا ہے اسے بھی کہتے ہیں لیکن لکھنوی شاعر نے اسے پہلے معنی میں استعمال کیا ہے اور چونکہ رعایت لفظی کا فائدہ ہے قدرتاً اس کا ذہن لفظ قینچی سے مقراض کی طرف منتقل ہوگیا اور اس سے اس نے کبوتر کے پر تینچ دیے ۔

اللہ اس غریب کو غریق رحمت کرے بات اس نے بے پر کی نہیں اڑائی ۔

عبدالماجد

بنام ایڈیٹر صاحب" اردو نامہ" کراچی

دریاباد ۳۰ جون ۱۹۶۶ء

کرم فرما ۔ السلام علیکم

آپ کا نمبر ۲۴ پہنچا ۔ ابنا مراسلہ اس میں پڑھ کر سر پیٹ لیا " اجازہ" ز کے نقطے اڑا کر اسے" اجارہ" بنادینا آپ کے کاتب صاحب کا کمال فن ہے ۔ کیا انھوں نے مجھے" بے نقط" بنانے کی ٹھان لی ہے میں نے" اجازہ" اور" اجارہ" دونوں پر

---

[1] لاٹ صاحب سے مراد گورنر ہے ۔ [2] مکتوب الیہ کا مجموعۂ کلام ۔ [3] مراد حکیم ڈاکٹر امین دریابادی سے ہے جو مرحوم کے بھانجے تھے اور جن کا اس زمانے میں انتقال ہوا تھا ۔ [4] "قومی آواز" کے گلوریوں کے کالم میں ایک لکھنوی شاعر کا مذاق اڑایا گیا تھا کہ اس نے شوری قینچی سے کبوتر کے پر کاٹے ہیں مکتوب مندرجہ بالا اسی کے بارے میں ہے ۔

عرض خیال کیا تھا۔ انھوں نے "دوئی" کو مٹا کر دونوں لفظ ایک کر دیے۔ پڑھنے والوں نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

بنام محمد عصمت خاں صاحب سکریٹری اردو فارسی سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی

پیام بموقع یوم اکبر

۱۵ مارچ ۶۶ء

کلام اکبر کی اگر آپ کو چاٹ پڑ گئی تو ایک ہی وقت میں

۱) آپ نے اپنی زبان درست کر لی

۲) اردو کے ایک اچھوتے لطیف، پیارے اسلوب بیان کے بھی رمز شناس ہو گئے۔

۳) اپنی سخن گوئی، سخن فہمی، سخن سنجی کی بھی نوک پلک درست کر لی۔

۴) توحید و معرفت کی بھی چاشنی چکھ لی

۵) اپنے اندر مشرقیت، اسلامیت، غیرت ملی اور خودداری کی روح بھی جذب کر لی۔

اکبر اور کلام اکبر پر سینکڑوں صفحے لکھ چکا ہوں اور پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کچھ بھی نہیں لکھا۔ اللہ تکملہ آپ لوگوں کے ہاتھ کر دے۔

عبدالماجد

بنام فرحت انوار سلمہٗ کراچی

دریاباد ۲۰ مارچ ۶۶ء

عزیزہ سلمہا، وعلیکم السلام

ترنگ وغیرہ میں کامیابی خوب رہی اللہ ہر طرح سے مبارک کرے۔ فطرت کی اس شاعری پر دل کھول کر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ جو خود دائم المرض ہو اور بیماریوں میں غرق اس کو تیماردار بنا دیا جائے بقول مومن ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس   آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

یہ بھی اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں کہ اس تیمارداری کے طفیل میں اب خود تیماردار کی بیماری کھو دے اور اسے بیمار سے تندرست و توانا بنا دے۔ صدق اگر کبھی یہ خبر دیتا تو لکھتا کہ ایک خاتون کی ہمت مردانہ نے جیسے جوان مردوں کے چھکے چھڑا دیے۔ مریم زمانی کہنا گستاخی ہو تو کنیز مریم کہنے میں تو شک کی گنجائش نہیں۔

جس ڈاکٹر صاحب نے یہ کہا کہ مرض الموت فلاں بیماری ہوگی انھوں نے (نذیر احمدی زبان) میں جھک ماری۔ موت کا حال کون بندہ جان سکتا ہے۔ ڈاکٹر کی رسائی تو بس مرض تک ہے زندگی و ختم زندگی کا سوال اس سے بالکل الگ ہے۔

والسلام

دعاگو و دعاخواہ

عبدالماجد

بنام جناب راج نرائن صاحب، راز پٹیل نگر دہلی

دریاباد ۷ اپریل ۶۶ء

"منور" صاحب ماشاءاللہ شاعر ابن شاعر ہیں بلکہ یوں کہیے کہ گھرانہ ہی شعر و شاعری کا گھرانہ ہے اسی کو کہتے ہیں ع

ایں خانہ تمام آفتاب است

پہلے لکھنوی تھے اب دہلوی ہو گئے آنکھیں کھولیں تو زبان و ادب کے ایک مرکز میں چل پھر رہے ہیں اٹھ بیٹھ رہے ہیں، ہنس بول رہے ہیں تو زبان و ادب کے دوسرے مرکز میں۔ آغاز بھی مبارک انجام بھی مبارک۔

کلام نام روشن کیے ہوئے آخر "منور" ہی ہیں روشن بھی اور دوسروں کے لیے روشنی بخش بھی۔ ہونہار شروع سے تھے۔ سن کے ساتھ کلام میں پختگی آ گئی اب تو نام خود شاد اشاد دل میں ہے۔

جیتے رہیں کہ ان کے دم سے خدمت اردو کی ایک روایت کہنہ زندہ و تازہ ہے۔

عبدالماجد

بنام ڈاکٹر حکم چند نیر صاحب صدر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی[1]

دریاباد ۱۲ ستمبر ۱۹۷۶ء

بندہ نواز! تسلیم

آپ تو بڑی چیز نکلے ۔ زندہ باش!

اتنے بہتر، اتنے مفصل و اتنے جاندار بلکہ جاں بخش خط کی تو میں توقع ہی نہیں کر سکتا تھا زیادہ سے زیادہ یہ خیال کیے ہوئے تھا کہ چند سطریں ضابطے کا جواب آجائے گا اس کا بیشتر حصہ چھپنے کے قابل ہے بہت ہی خوشگوار حقیقتیں اس "شعاع نیر" سے روشن ہو جائیں گی!

آپ اجازت دیتے ہیں نہ؟ اگر روکنا ہے تو لکھ دیجیے گا ورنہ آپ کی خاموشی کو نیم رضا نہیں بلکہ کامل رضا سمجھوں گا۔

نیاز کیش

عبدالماجد

بنام جناب وفا ملک پوری صاحب ایڈیٹر "صبح نو" پٹنہ

دریاباد ۲۰ اپریل ۱۹۷۶ء

برادرم وعلیکم السلام

شاعر تو یہاں تک کہہ گیا ہے ع

مکیں کی خیر ہو یارب مکاں رہے نہ رہے

اور "کاشانۂ وفا" تو شاعری کی دنیا میں جلنے اور برباد ہونے کے لیے تعمیر ہوتا ہے۔ خیر ہم سوختہ دل یہاں تک تو نہیں جا سکتے بلکہ خیر مکین و مکان دونوں کی مناتے رہتے ہیں۔ تاہم اس پر تو شکر کیجیے کا دل چاہتا ہے کہ آپ محفوظ رہے اور مکان کا ایک حصہ بھی (اور غیب کی یہ آواز کان میں آکر تسکین دے جاتی ہے کہ کسی غیبی تصرف سے جو بھی مصیبت آئے اس سے بندہ کے گناہ دھلتے اور مرتبے بلند ہوتے رہتے ہیں۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

بنام جناب شہباز حسین صاحب ایڈیٹر "آج کل" نئی دہلی

دریاباد ۶ مئی ۱۹۷۶ء

محترم نیاز کیشاں وعلیکم السلام

حکم نامہ پہنچا حیرت ہی ہو گئی۔ ایک بے کمال کیسے باکمالوں کی بزم میں قدم رکھے اور اپنی داستان حیات ہنرمندوں کو سنائے۔

لیکن بہرحال فرمائش ایک "شہباز" کی زبان سے ہوئی۔ "کنجشک" غریب میں یہ تاب و توانائی کہاں کہ سرتابی کر سکے۔ انشاء اللہ تعمیل ارشاد جوں توں ہو کر رہے گی۔ ہفتہ عشرہ کی مدت میں۔

والسلام

دعاگو و دعا خواہ

عبدالماجد

بنام سلیمان اطہر جاوید صاحب لکچرر شعبہ اردو تروپتی کالج تروپتی

دریاباد ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء

پیش لفظ

"رشید صاحب[2] "ظریف شروعات سے ہی ہیں اور اب اس پر مستزاد شریف ہو گئے ہیں اور جس مرد رشید میں دونوں دولتیں ظرافت اور شرافت کی جمع ہو جائیں ان کے لیے باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔

ان کا قلم ان کی زبان کی طرح اظہار خیال کے لیے اخفائے خیال کے لیے نہیں، ان کا مکتوب ان کے دل کا آئینہ ہوتا ہے اور اس لیے قابل عزت بھی اور قابل توجہ بھی!

وہ طلسم ہوشربا کے اسرار خانے میں قدم نہیں رکھتے وہ بوستان خیال کی سیر نہیں کراتے وہ گلستان سعدی کی نئی چمن بندی کرتے ہیں اور اس گلستان کے نئے نئے پھول نت نئی بہار اور سدا بہار خوشبو دکھاتے ہیں ظرافت اور شرافت پر اضافہ کر لیجیے لطافت کا۔

وہ کبھی سے چھوٹے تھے اب برابر کے ہیں ہم سر و ہم چشم بڑی بڑائی ان کی یہی ہے کہ اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے۔

---

[1] مکتوب الیہ نے مولانا مرحوم کے پچھلے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ ہندو یونیورسٹی میں اردو فارسی کی تعلیم کا بڑا اچھا انتظام ہے۔
[2] مکتوب الیہ نے رشید صاحب پر کوئی کتاب لکھی تھی اور اس کے لیے پیش لفظ کی فرمائش کی تھی۔ [3] مراد پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب۔

سلام ان کو جو ان سے خط و کتابت رکھتے ہیں سلام ان کو جنھیں وہ مراسلت سے مشرف کرتے رہتے ہیں اور یہ دو سطریں "پیش لفظ" ایک " دعاگو" کے قلم سے۔

* مولوی محمد ساجد ندوی محمود آباد سیتا پور کی کتاب انوار پر

پیش لفظ

۲۰ نومبر ۱۹۶۲ء

کتاب کا نام انوار اور کتاب کا موضوع و مضمون محبت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پھر کتاب کا ایک ایک صفحہ کیسے مطلع انوار نہ بن جاے۔

محبت کا موضوع یوں بھی نازک ہوتا ہے چہ جائیکہ محبوب ترین خلائق پر قلم اٹھانا۔ کتنے ہی یہ ارادہ لے کر اٹھے لیکن کامیاب کم تر ہی ہوے۔ محو پر سکر، عقل پر جذبہ، ہوش پر وارفتگی ایسی غالب آتی ہے کہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ مقصود و مطلوب اتباع رسول ہے اطاعت رسول ہے۔ آپ کے احکام کی دل و جان سے پیروی کرنا، آپ کے نقش قدم پر چلنا، آپ کی زندگی کو ہر شعبہ میں مشعل راہ بنانا ہے۔ محبت اس سفر کو آسان بنا دینے والی ہے۔ بغیر محبت کے یہ منزل طے کرنا آسان نہیں۔

ابو بکرؓ و عمرؓ وامثالہم جو آپ کے بہترین پیرو اور متبع ہوے ہیں وہ وہی ہیں جو آپ کے صادق ترین عاشقوں میں تھے مصنف سلمۂ بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس محبت کا تخم ہر مومن کے قلب میں پڑ جاے بلکہ ہر امتی کے شعور میں یہ جم جاے جڑ پکڑ جاے اور یہ پورا شجر بار آور تناور بن جائے۔ مصنف کوئی خانقاہ نشین قسم کے صوفی صافی نہیں صاحب علم ہیں ندوی ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ وقت کے مشہور عارفوں اور اللہ والوں جیسے شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس دہلوی اور حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری کی آنکھیں دیکھے ہوے ہیں اور ان سے فیض اٹھائے ہوے ہیں۔

ان کی کتاب کا مسودہ اس بے علم و بے عمل نے جا بجا سے دیکھا اور جی خوش ہوگیا۔ ذوق و شوق کے ساتھ ماشاء اللہ علم کی باتیں اور دین کی ہدایتیں پوری طرح ملحوظ رکھی ہیں۔ اور رسول کو رسول ہی بنا کر پیش کیا ہے کہیں سے "دیوتا" یا "اوتار" کی جھلک نہیں آنے دی۔ یقین ہے کہ یہی رنگ ساری کتاب کا ہوگا۔

اللہ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور انھیں حسن نیت کی جزا اسے کامل یہاں اور وہاں دونوں جہانوں میں عطا کرے۔

★

ضروری اطلاع

۱۔ ادارہ نیا دور کو اتنی کثیر تعداد میں تخلیقات خاص طور سے غزلیات موصول ہوتی ہیں کہ فرداً فرداً جواب دینا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا جواب کے لیے تخلیقات کے ساتھ پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے بصورت دیگر جواب دینے کی ذمے داری ادارے پر نہ ہوگی۔

۲۔ ادارے کو موصول ہونے والے مضامین، نظموں اور غزلوں وغیرہ کی ایک کثیر تعداد اس وقت اشاعت کے لیے زیر غور ہے۔ اس لیے کچھ عرصے تک غیر طلبیدہ تخلیقات پر غور کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ غیر طلبیدہ تخلیقات کے بارے میں کوئی اطلاع یا ان کی واپسی کے لیے پوسٹ کارڈ یا لفافہ ضرور بھیجا جاے ورنہ ادارے پر اطلاع دہی یا واپسی کی کوئی پابندی نہ ہوگی۔

۳۔ نیا دور میں صرف وہی تخلیقات شائع کیے جاتے ہیں جو نیا دور کے لیے مخصوص ہوں۔ شائع اور نشر شدہ یا کسی ادبی نشست اور سمینار وغیرہ میں پڑھے ہوے مقالات اور نظمیں وغیرہ شائع نہیں کی جاتیں۔ اگر اسی طرح کی کوئی تخلیق نیا دور کو اشاعت کے لیے بھیجی جاتی ہے اور وہ لاعلمی میں شائع ہو جاتی ہے تو ادارہ اس کے لیے کوئی نذرانہ حاضر نہیں کرے گا۔